حصہ اول

کیا ہم پر لازم ہے کہ خدا کو پہچانیں؟؟؟

کیا ہم پر لازم ہے کہ خدا کو پہچانیں؟؟؟

کمال کی جانب

انفرادی اور اجتماعی کمال

ارتقائے معاشرہ

پہلا سوال جو "عقائد" کی بحث میں پیش آیا ہے۔ وہ یہ ہے:

"جن لوگوں نے اپنے لئے دینی استدلال کے صحیح راستے اختیار کئے ہیں انہیں چاہئے کہ اپنے افکار و اعمال کو اس دین کے اصول و قوانین کے تابع رکھیں اور اس کے احکامات پر دل و جان سے عمل کریں اور ان کا کوئی عمل بھی اس دین کے احکامات و حدود سے تجاوز نہ کرے۔ لیکن وہ لوگ جنھوں نے ابھی تک اپنے لئے کوئی دین اختیار نہیں کیا ہے اور اپنے کو اس دین کے قانون اور دستور کا پابند نہیں بنایا ہے ان کے لئے دین کے بارے میں تحقیق کس طرح ضروری ہے؟۔

کیا انسانوں کی زندگی کا دین اور خداشناسی سے کوئی تعلق ہے؟ کیا انسانی معاشرہ خدا پر ایمان لائے بغیر زندگی بسر نہیں کرسکتا؟ اور کیا فرد اور معاشرہ اخلاقی بنیادوں کی زنجیر تھامے بغیر حقیقی کمال حاصل نہیں کرسکتا؟ آخر اس کی کیا ضرورت ہے کہ لوگ خود کو زحمت میں ڈال کر دین کی تحقیق کا ناہموار اور کٹھن راستہ طے کر کے اپنی تکلیف میں اضافہ کریں؟

یہ پہلا سوال ہے جو "عقائد و مذہب" کی بحث میں پیش آتا ہے اور حقیقت میں عقائد کے محققین کی پہلی بحث جس کا تذکرہ "علمائے اسلام" کے بیان میں "وجوب معرفۃ اللہ" یا "خداشناسی کے لوازمات" کے عنوان سے کیا گیا ہے اور ہم نے "کیا ضروری ہے کہ خدا کو پہچانیں" کے عنوان کے تحت اس کا ذکر کیا ہے وہ اسی سوال کا جواب ہے۔ اب جبکہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہماری بحث کا عنوان کیا ہے اور اسکا مقصد کیا تو ہم اس کی وضاحت کریں گے اور سب سے پہلے ہم اس کے مقدمہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

کمال کی جانب

ہر وہ فرد جس کو انسان کہا جا سکتا ہے ہر حالت میں خواہ اس کی حیثیت انفرادی ہو یا اجتماعی اور جو کرۂ زمین کے اوپر زندگی بسر کرتا ہے فطرت کے حکم اور عقل کے اقتضاء کے مطابق تحصیل کمال کے لئے قدم آگے بڑھاتا ہے۔ ہر وہ طالب علم جو کالج میں حصول علم میں مصروف ہے اور ہر وہ کاریگر جو کسی کارخانہ میں کسی کام یا کسی صنعت میں مصروف ہے اور ہر وہ دانشور جو کتابوں کے مطالعہ اور سائنس کے پیچیدہ مسائل کی تحقیق میں مصروف ہے اور ہر وہ موجد جو تجربہ گاہوں کے تکلیف دہ ماحول میں مسلسل تجربہ میں مشغول ہے یہ سب کے سب حصول کمال کے خواہاں ہیں۔ وہ لوگ اپنے اور معاشرہ کے روشن مستقبل اور بھلائی کے لئے اس قدر تحقیق کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔ چونکہ ان کا مقصد حصول کمال ہے اس لئے اس مقصد کے لئے یہ تمام رنج و تکلیف ان کے لئے باعث لذت و فرحت ہے اور فطرت کی صدا اور وجدان کا فرمان ہمیشہ ان کا مددگار اور شوق دلانے والا ہوتا ہے۔

"حصول کمال" کی خواہش اور فطری جذبہ صرف انسان کی حد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ حیوانات بھی کلی طور پر اس سے بہرہ مند ہیں۔ وہ بھی کمال حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے قدم بڑھاتے ہیں اور جو رکاوٹ درمیان میں آتی ہے اسے دور کرتے ہیں۔ ہمیشہ ان باتوں کو پسند کرتے ہیں جو ان کی زندگی کیلئے مناسب ہو اور ان چیزوں سے جن سے انہیں نقصان پہنچ سکتا ہے دور بھاگتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حیوانات کے مقابل انسان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں حصول کمال کی خواہش اور جذبہ زیادہ قوی ہوتا ہے اس لئے کہ انسان کو عقل کی رہنمائی حاصل ہے۔

اگر ہم چاہیں کہ انسان کے حصول کمال کے جذبہ کو ایک قانون کی صورت میں لے آئیں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ ایک ایسا عام اور ہمہ گیر قانون موجود ہے کہ اس جیسی عمومیت اور ہمہ گیری کسی اور قانون میں موجود نہیں۔ اس قانون میں اس قدر عمومیت ہے کہ وہ ہر فرد بشر کا سراغ لگاتا ہے اور بلا استثناء ہر فرد بشر اس سے تعلق رکھتا ہے اور اس سے زیادہ واضح الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ تمام لوگ کمال حاصل کرنے کے درپے ہیں اور اس سے بھی زیادہ سچ بات یہ ہے کہ ہر ایک کی خواہش یہ ہے کہ کمال حاصل کرے۔

اوران کی تمام کوششیں اورتمام افعال حصول کمال کے لئے ہیں۔

آپ کوکوئی ایسا شخص نہیں ملے گا جو اپنے فائدہ اوراپنی ترقی سے متنفر ہو یا وہ ایسی چیزوں کی طرف مائل ہو جو اسے نقصان پہنچائیں۔

ممکن ہے کہ اس موقع پر کوئی یہ کہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ گونا گوں حالات کی پروا کئے بغیر بعض لوگ خودکشی کر لیتے ہیں اوراپنی قیمتی جان ضائع کر دیتے ہیں۔ایسی صورت میں کیا ہم ان لوگوں کواسی قانون کے زمرہ میں لائیں گے؟ کیا ہلاکت اورخودکشی سے ان کا مقصد کمال حاصل کرنا تھا؟

آپ یہ سن کرحیران نہ ہوں کہ سوال کا جواب بھی اثبات میں ہے'ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان اشخاص کا مقصد بھی حصول کمال تھا۔اگرہم ان میں سے ہرایک کی زندگی کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کی ہلاکت'رنج والم اورالجھنوں کے باعث ہوتی ہے کہ جس سے مقصود''مصیبتوں سے نجات پانا''ہوتا ہے (اوراس خودکشی کا مقصد بھی حصول کمال ہے)۔لیکن ان کی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ حصول کمال کی راہ سے بھٹک چکے ہیں اوراسی کوحصول کمال کے فطری جذبے کے عین مطابق سمجھتے ہیں۔

یہاں تک کہ وہ اشخاص بھی جو پست کاموں میں مصروف ہیں اوراپنی عمرکوفانی لذتوں کے پیچھے پڑکر تباہ کر لیتے ہیں اورمنکرات وشراب خوری کے عادی ہوجاتے ہیں وہ بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہیں وہ بھی اس خیال سے کہ وہ حصول کمال کی طرف گامزن ہیں' کمال کی راہ سے بھٹک گئے ہیں اوراپنی راحت اورخوش نصیبی کوانہی باتوں میں سمجھتے ہیں۔خلاصہ یہ کہ''حصول کمال کا جذبہ''تمام لوگوں میں وہی ہوتا ہے لیکن بعض میں کچھ انحراف کے ساتھ۔

اس بحث سے ہم جو نتیجہ نکال سکتے ہیں وہ یہ ہے:

۱۔ تمام انسان بلااستثناء کمال کی تلاش میں ہیں اوراس سلسلے میں ان کا شوق بڑھانے والی ایک چیز فطرت کی سرپرستی اوردوسری چیزعقل کا حکم ہے۔

۲۔ ممکن ہے کہ انسان صحیح تعلیم وتربیت نہ ہونے کی بناء پرمصداق کمال کی تشخیص کرنے میں غلطی کا ارتکاب کرے اورحصول کمال کے راستے پر چلنے کی بجائے نقصان اورانحطاط کے راستے پر چل

پڑے۔

انفرادی اوراجتماعی کمال

اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ انسان میں حصول کمال کا جذبہ اس کی فطرت اصلی کا جزو ہے جواس کے وجدان اوراس کی عقل کے اقتضاء کے مطابق کام کرتا ہے۔

جاننا چاہئے کہ کمال کے دو پہلو ہیں ایک انفرادی اوردوسرا اجتماعی کیونکہ انسان کی شخصیت کے بھی دو پہلو ہیں:

ایک انفرادی اوردوسرا اجتماعی۔اس کی شخصیت بلحاظ فرد یہ ہے کہ ہم اسے ماحول اورمعاشرہ سے قطع نظر اورمعاشرہ کی خصوصیات اورمقامی حالات پرتوجہ کئے بغیر ملاحظہ کریں اوراجتماعی شخصیت سے یہ مراد ہے کہ انسان کواس لحاظ سے دیکھیں کہ وہ اپنے سے ہٹ کر معاشرہ کے دوسرے لوگوں کے ساتھ کس طرح تعلقات رکھتا اورروابط قائم کرتا ہے اس لئے کہ جس کمال کی تلاش میں انسان ہے اس کے بھی دو پہلو ہیں:انفرادی اوراجتماعی۔انسان کے انفرادی طورپر تین پہلو ہیں:''فکر'اخلاق اورعمل''۔

کمال فکری

یہ بات عیاں ہے کہ انسان کا فکری ماحول؟؟ جس قدراعلیٰ ہوگا اس کی فکر بھی اتنی ہی ارفع واعلیٰ ہوگی کیونکہ انسان کی عقل وفکر کا اسکے ماحول؟؟ سے قریبی رابطہ ہوتا ہے۔اس لئے انسان کی مادہ اور معقولات جس قدر وسیع ہونگی اسی کے مطابق فکرانسانی میں وسعت پیدا ہوگی۔اوراس سے زیادہ سادہ الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے:

فکری مادہ کی بلندی وترقی ہی فکری ترقی ہے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ فکراورماحول میں کوئی بیگانگی نہیں ہے۔[1]

[1] [''عاقل اورمعقول کے اتحاد'' کی بحث نے فلسفہ میں اس رابطہ کواتحاد کی آخری حدوں تک پہنچادیا ہے اوراس کی فکراوراس کے ماحول کوایک قرار دیا ہے۔اس نظریہ کوسب سے پہلے جس شخص کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ ایک یونانی دانشور''فرغوریوس'' ہے جوارسطو کا اورماقبل اسلام حکماء کا شاگرد

ہے۔

بعض مسلمان فلسفی مثلاً فارابی اور ملا صدرا اس نظریہ کے طرفدار ہیں جبکہ ابن سینا اس نظریہ کا مخالف ہے]

اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ فکر کامل وہ فکر ہے جس کے پیش نظر عالی ترین موجودات ہو اور سب سے ادنٰی درجہ کی فکر وہ ہے جو ادنٰی درجہ کی مخلوقات کے گرد گھومے۔

اس حقیقت کو معلوم کرنے کے لئے ہمیں ایک دیندار اور ایک بے دین شخص کے عقائد کا موازنہ کرنا پڑے گا۔

ایک مادہ پرست کہتا ہے:

"دنیا اسی پر منحصر ہے جو کچھ ہم دیکھتے ہیں یا جو چیز بذریعہ سائنس ہم پر ثابت ہو چکی ہے۔ مادہ و فطرت اور اس کے جبری قوانین ہی اس دنیا کے بنانے والے ہیں اور اس کی تعمیر میں کسی قسم کی فکر اور کسی قسم کے خاکہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس دنیا کو پیدا کرنے والی طاقت ایک چھوٹے بچے کے برابر بھی عقل و شعور نہیں رکھتی۔ انسان بھی فطرت کا ہی ایک حصہ ہے اور مرنے کے بعد اس کے اجزا بھی تحلیل ہو جائیں گے اور پھر وہ فطرت کے اسی مادہ کا جزو بن جائے گا اور ان کا وجود کسی طرح بھی باقی نہیں رہے گا۔ انسان اور تمام حیوانات کے درمیان اس سلسلے میں کوئی فرق نہیں ہے"۔

لیکن ایک دیندار شخص کا اعتقاد یہ ہے:

"دنیا کے متعلق جو کچھ ہم جانتے ہیں دنیا اس سے بہت بڑی ہے اور اس عالم سے باہر کی دنیا مرتبہ میں اس عالم سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ اس عالم کو بنانے والی طاقت بے انتہا علم وقدرت کی حامل ہے۔ وہ ہستی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ دنیا کی تخلیق ایک عمیق و دقیق نقشہ کی بنیاد پر عمل میں آئی۔ اس کے بھیدوں سے ہماری ناواقفیت کلی طور پر ہمارے جہل کی پیداوار ہے نہ کہ ان بھیدوں کی نہ ہونے کی دلیل۔ انسان اور حیوانات میں بہت

تفاوت ہے۔ موت فنا اور نیست و نابود ہونے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ انسان کے حصول کمال کا ایک زینہ ہے کیونکہ انسان مرنے کے بعد ایک وسیع تر اور کشادہ تر عالم میں داخل ہو جاتا ہے"۔

فی الوقت ہماری بحث اس بارے میں نہیں ہے کہ دونوں میں سے کس کا خیال صحیح ہے اور کس کا غلط، بلکہ مقصد یہ ہے کہ دیکھیں دونوں میں سے کس کا خیال زیادہ صحیح اور کس کے خیال میں زیادہ وزن ہے۔ وہ شخص جس کا خیال صرف مادہ کی چار دیواری کے اندر گھومتا ہے یا وہ شخص جو کہ آسمانِ ابدیت کی بلندی پر لامحدود دائرے میں پرواز کرتا ہے؟

اس سوال کا جواب بغیر کہے ظاہر ہے۔

ہاں وہ دین ہی ہے جو انسانی فکر کو افق میں مادی افکار سے بلند تر قرار دیتا ہے اور وہ دین ہی ہے جو اسے قوی روح اور عالی ہمتی عطا کرتا ہے۔

کمال اخلاق

انسان کے پاس صفات اور اخلاقیات کے دو زمرہ ہیں۔ ایک گروہ کا نام آپ "غرائزِ حیاتی" (زندہ رہنے کا جذبہ) رکھ سکتے ہیں جس کی زندگی رہنے کے لئے ضرورت ہے اور یہ جذبہ تمام افراد میں پایا جاتا ہے۔ اس میں افراط و تفریط انسان کے لئے باعث نقصان ہے۔ مثال کے طور پر اپنی ذات سے لگاؤ، اپنی اولاد سے محبت، انتقام کا احساس، خوف کا احساس، شہوت اور غضب کا جذبہ ان ہی صفات کا نمونہ ہیں اور یہ صفات انسان کی زندگی کے لئے لازمی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ یہ سب صفتیں دائرہ اعتدال میں ہوں۔ اگر انسان کو اپنی ذات سے لگاؤ نہ ہوگا تو اسے خطرات کا کوئی خوف نہ ہوگا اور وہ بلا جھجک اپنے آپ کو مختلف خطرات میں ڈال دے گا اور اپنی جان کو ضائع کر دے گا۔ اگر اسے اپنی ذات سے زیادہ محبت ہو جائے اور ان تمام چیزوں کو وہ اپنے لئے ناپسند کرنے لگے تو یہ بات بھی یقیناً اس کے لئے باعث بدبختی و ہلاکت ہوگی۔ ضرورت سے زیادہ بہادر اور نڈر لوگ غالباً عمر طبیعی تک نہیں پہنچتے اور ڈرپوک لوگ بھی اپنی زندگی سے فائدہ حاصل نہیں کرتے اور تمام سماجی مثبت افعال کرنے سے محروم رہتے ہیں۔

غصہ والے لوگ بھی ناقابل اعتماد ہوتے ہیں اور ان کا کوئی وقار نہیں ہوتا اور ان کے مقابل ٹھنڈے مزاج کے لوگ بھی ناقص ہوتے ہیں کیونکہ وہ سماجی لڑائی کے میدان میں اپنے مسلمہ حقوق کا صحیح طور پر دفاع کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ اس لئے ان میں سے ہر جذبہ کے لئے ایک حد مقرر ہے۔ اس حد اور اس اندازے سے تجاوز انسان کے لئے نقصان کا باعث ہے۔ صرف ان صفات مذکورہ کے اعتدال کی صورت میں ہی انسان اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اگر اس میں یہ صفات پیدا ہوجائیں تو وہ کامل ہوجائے گا۔ اور صفات کا ایک دوسرا گروہ ہے جسے ہم "انسان کے اعلیٰ اقدار" کہہ سکتے ہیں اور اس دوسرے گروہ کی صفتوں کے لئے کوئی پابندی یا حد مقرر نہیں ہے۔ یہ صفتیں جس قدر زیادہ ہوں گی اسی قدر انسان کے کمال میں اضافہ کا باعث ہوں گی۔

صفات عدل، حق دوستی، حق طلبی اور فرض شناسی کو اس زمرہ میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ جس شخص میں یہ صفات زیادہ ہوں گی وہ زیادہ کامل ہوگا۔ مثلاً جس شخص میں انصاف پروری کا احساس جتنا زیادہ اور محکم پایا جائے گا تو وہ شخص اخلاقی اور روحانی اعلیٰ اقداروں کے سبب اسی قدر کامل انسان سمجھا جائے گا اس لئے ان اعلیٰ قدروں کی پرورش و تکمیل بھی کمال اخلاق کی علامت ہے۔

مندرجہ بالا گفتگو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ: "انسان کے اخلاق کی تکمیل کا انحصار فطری جذبات کے اعتدال اور انسان کی اعلیٰ روحانی اقدار کے اضافہ پر ہے"۔

اب ہم کو اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ وہ کونسی قوت ہے جو فطری جذبے کو اعتدال بخش سکتی ہے اور انسان میں اعلیٰ اقدار پیدا کرسکتی ہے۔ دین کے اصولوں کی طرف رجوع کرنے سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ دین میں سب سے زیادہ اہمیت جذبات کو حد اعتدال پر رکھنے اور انسان میں اعلیٰ اقدار کو بڑھانے کی ہے اور دینی اصولوں کا زیادہ حصہ اسی پر مشتمل ہے۔ یہ موضوع ثابت کرتا ہے کہ "صحیح مذہب انسان کے اخلاق کی تکمیل کا ضامن ہے"۔

ظاہر ہے کہ خود پسندی، شہوت، غصہ وغیرہ قسم کے فطری جذبات کو اعتدال پر رکھنے کی اولین شرط (عائد کرنے کا مقصد) اندرونی و باطنی ذمہ داریوں کا ایک احساس پیدا کرنا ہے جو ہر موقع پر انسان کے

حالات و افکار اور اعمال کو قابو میں رکھ سکے۔ ان ذمہ داریوں کے احساس کا سرچشمہ صرف خدا پر ایمان ہے۔ ایمان وہ ہے جو دیندار شخص کے دل و قلب میں جگہ پیدا کرے اور وجدان اس میں روحانی تاثیر پیدا کرتا اور بے راہ روی اور گناہوں سے اسے بچاتا ہے۔

دین "اخلاقی کمال" کے سلسلے میں انسان کو نیک اعمال کی جزا کی خوش خبری سناتا ہے اور فطری جذبات کو قابو میں رکھنے کی خاطر اسے سخت عذاب کی دھمکی دیتا ہے اور نتیجتاً اس میں اخلاقی کمال کے حصول کا شوق پیدا ہوتا ہے اور سزا کا خوف اسے جذبات کے طوفان اور ناپسندیدہ اعمال سے باز رکھتا ہے۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے لوگ بھی پیدا ہوجاتے ہیں جو جزا کی خوشخبری اور سزا کے خوف سے بے نیاز حصول کمال کے خواہاں ہوتے ہیں اور وہ کمال کو بغرض کمال ہی حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن سماجی تجربات سے جو بات ظاہر ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اس قسم کے لوگوں کی تعداد بہت ہی کم ہے اور ان اشخاص پر بھی ان اعلیٰ اقدار کا اثر بہت محدود ہوتا ہے۔

جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ صرف "وجدان" ہی انسان کو تمام گناہوں اور مظالم سے روک سکتا ہے تو وہ سخت غلطی پر ہیں۔ ایک ماہر تعلیم کہتا ہے:

> "جو لوگ کوشش کرتے ہیں کہ اخلاق کو دین سے جدا رکھیں اور پوری طرح کمال حاصل کریں تو ان کا یہ اقدام خطرناک ہے (کیونکہ) فرانس کا فلسفی اور شاعر لامارتین کہتا ہے:
> خدا کے بغیر وجدان ایسا ہی ہے جیسا کہ قاضی کے بغیر عدالت"۔

کمال عملی

شاید اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ انسان کے افعال کا کمال اس کے اخلاق کے کمال سے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ "عمل"، "اخلاق" کا پرتو اور عکس ہوتا ہے اور زیادہ دقیق الفاظ میں: انسان کے تمام کام ایک اخلاقی بنیاد رکھتے ہیں اور اسی لئے ہم افراد کی صفات اور ان کے روحانی اقدار کو ان کے طرز عمل میں تلاش کرتے ہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ کوئی انسان تصنع کے طور پر اپنے کسی عمل کو اپنے روحانی اقدار کے برخلاف ظاہر کرے لیکن اس کا یہ کام مستثنیات میں سے ہوگا اور وہ اس عمل کو ہمیشہ جاری نہ رکھ سکے گا

اس لئے انسان کے اعمال وافعال کے اچھے اور کامل ہونے کیلئے اولین شرط اس کے فطری جذبات کا معتدل ہونا اور اس کی روحانی کیفیتوں اور صفات کا ترقی پذیر ہونا ہے اور اخلاق کے کمال کے بارے میں ہم نے جن مسائل کا پہلے ذکر کیا ہے وہ اس بحث سے مربوط رہینگے اور اس طرح یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ "انسان کا عملی کمال خدا پر ایمان کے زیر سایہ ہی پروان چڑھ سکتا ہے اور بس"۔

معاشرہ کا کمال

اگر ہم ماہرین عمرانیات اور قانون دانوں کی ان پر جوش بحثوں سے جو وہ معاشرہ کے بارے میں کرتے آئے ہیں صرف نظر کر کے چاہیں کہ معاشرہ کی سیدھے سادے الفاظ میں تعریف کریں تو ہم بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ "معاشرہ سے مراد افراد کا مجموعہ یا وہ تعلق و واسطہ ہے جو ان افراد کے درمیان موجود ہے یعنی وہ لوگ جو فکر اور ذہنی کیفیت کے لحاظ سے رسوم و عادات کے لحاظ سے ایک دوسرے کے مشابہ ہوں اور ایک دوسرے کے ساتھ رہنے سہنے کے لحاظ سے ایک دوسرے کے نزدیک ہوں اور مل جل کر زندگی گزار رہے ہوں اسی کو معاشرہ کہیں گے"۔

انسان کی شہری زندگی

ماہرین عمرانیات نے وسیع مطالعہ کے بعد اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ انسان فطری طور پر مدنی الطبع ہے اور بغیر معاشرہ کے وہ زندگی نہیں بسر کر سکتا اور اپنے فطری جذبے اور باطنی احساسات کی بناء پر معاشرتی زندگی اختیار کرتا ہے۔ چونکہ وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اکیلا زندگی کی مشکلات کو حل کرنے اور کمال حاصل کرنے پر قادر نہیں ہے اس لئے اس مقصد کو حاصل کرنے کا آسان ترین راستہ اس کے لئے یہ ہے کہ دوسروں کا تعاون حاصل کیا جائے۔ اور چونکہ ہر شخص کی استعداد اس کے جسمانی اور روحانی حیثیت کے مطابق ہوتی ہے اور ہر شخص ہر کام کی انجام دہی کا اہل نہیں ہوتا اس لئے مجبوراً اسے دوسرے لوگوں کی جسمانی اور فکری صلاحیت سے مدد لینی پڑتی ہے لیکن عام طور پر دوسرے لوگ مفت میں اپنی صلاحیتوں سے اس کو مستفید ہونے کا موقع دینا نہیں چاہتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ مقصد دونوں کی فکری اور جسمانی صلاحیتوں اور ان کے نتائج کے تبادلہ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور چونکہ ماہرین عمرانیات کی ایک

جماعت کا یہ خیال ہے کہ سب سے پہلے انسانوں نے اجتماعی زندگی کا آغاز درندوں کے خوف کی وجہ سے کیا۔ اس بات سے ان ضروریات کے محض ایک پہلو پر روشنی پڑتی ہے جو لوگوں کے آپس کے تعاون سے پوری ہوتی ہیں نہ کہ تمام پہلوؤں پر۔

دوسری بات یہ کہ اس دائمی ارتباط اور میل ملاپ کی اصلی غرض اپنے مفادات کا تحفظ ہے۔

ممکن ہے اس موقع پر کوئی شخص سوال کرے کہ ایسی صورت میں تمدنی زندگی سے کیا فائدہ؟

اس لحاظ سے اگر انسان بیابان میں زندگی بسر کرے تو وہ اس تمدن سے کئی گنا زیادہ بہتر ہے جس کی ضروری لوازمات میں سے دوسروں کے حقوق کو پامال کرنا اور ان کے مفادات کو نقصان پہنچانا ہے۔ لیکن جاننا چاہئے کہ یہ بات انسانی اور روحانی اقدار کے انحراف اور اس فطرت کے ناجائز استعمال کی وجہ سے وجود میں آتی ہے اور اس کے خاتمہ کے لئے چاہئے کہ بنیادی اور فطری اصولوں کے مطابق ایک صحیح معاشرہ ترتیب دیا جائے ایسے معاشرے کے اصول کو ہم حسب ذیل تین جملوں میں بیان کر سکتے ہیں:

۱۔ افراد کا ایک دوسرے کے ساتھ مضبوط رابطہ۔

۲۔ افراد کے حقوق کی کامل حفاظت۔

۳۔ افراد کی پرورش اور ان کے حصول کمال کے لئے ضروری تحفظات۔

اگر یہ تین بنیادی باتیں معاشرہ میں کارفرما ہو جائیں تو اس معاشرہ کے افراد سماجی لحاظ سے کامل اور مدنیت سے بہرہ ور سمجھے جائیں گے۔

اب دیکھنا یہ چاہئے کہ روابط میں وہ پختگی اور استحکام کس طرح پیدا ہو؟ یہ بات محتاج وضاحت نہیں کہ عام طور پر مادی منافع، مختلف اختلاف کے پیدا ہونے اور آپس کا خلوص ختم کر کے دشمنی پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے لازمی طور پر ہمیں ایک غیر مادی اصولوں کے سلسلہ کا پابند ہونا پڑے گا کیونکہ نیک نیتی اور اخلاص، ایمان کے زیر سایہ ہی محفوظ رہتے ہیں نہ کہ بے روح مادی وسائل کے تابع۔

اس لحاظ سے مذہبی اور اخلاقی حکومت کے سوا کوئی اور حکومت عوام کی خودخواہی اور خودغرضی کے

جذبات پر نہ تو قابو پا سکتی ہے اور نہ ہی ان میں نظم و ضبط پیدا کر سکتی ہے اور نہ ہی مندرجہ بالا تین اصولوں کو معاشرہ میں بطور کامل رائج کر سکتی ہے۔

مذہب کے صحیح دستورات سے جیسا کہ چاہیئے اگر استفادہ کیا جائے اور ان اصولوں کو عوام میں رائج کیا جائے تو اس کے نتیجہ میں معاشرہ مخصوص کمال کی جانب آگے بڑھیگا۔

دین اپنے قوانین کے ذریعہ عوام کی زندگی کے معاملات میں ایسی شرائط عائد کرتا ہے جس سے ان کے عقل و شعور میں کافی اضافہ ہوتا ہے اور اپنے مقررہ اور مستحکم قوانین کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں الفت اور خلوص پیدا کرتا ہے۔عوام کے آپس میں ایک دوسرے سے دور رہونے کے جو اسباب و علل ہیں ان کو دور کرتا ہے۔دین معاشرہ کے افراد میں ہم خیالی پیدا کر کے ان کو فکری انتشار اور پراگندگی سے بچا کر مادی مقاصد میں توازن پیدا کرتا ہے اور آخر کار معاشرہ کے افراد کو ایک حکومت اور ایک فرمان کے ماتحت جسم کے اعضاء کی طرح ایک جان، ہم خیال اور ہم فکر بنا دیتا ہے۔

جس معاشرہ کے لوگ ایمان اور اخلاق کے اصولوں کے پابند نہیں وہ مادی سرکش قوتوں کی لڑائی کا اکھاڑہ بن جاتے ہیں اور ہر شخص اپنے لئے زیادہ سے زیادہ مفاد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں معاشرہ بقا کے جھگڑے اور زندگی کی لڑائی کا ایک اکھاڑہ بن جاتا ہے۔اب اس بات کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ ایسے معاشرہ میں افراد عقلی و فکری آزادی سے محروم ہوتے ہیں اور ان افراد کے فکری، اخلاقی اور عملی کمال کے حصول میں مدد دینے کے لئے ممکنہ وسائل کی فراہمی ممکن نہیں ہوتی کیونکہ ان امور کا اصلی جھگڑے والی بات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔اسے برعکس ایسے معاشرہ میں جس پر ایمان اور اخلاق کی حکومت ہو زندگی کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے ہم خیالی اور ہم آہنگی کا ایک مکمل سرگرم ماحول قائم ہو جاتا ہے جو "تنازع بقا" اور "تعاون بقا" کے جھگڑوں سے ہٹ کر ان پر حکومت کرتا ہے۔ایسے معاشرہ کے افراد پوری آزادی کے ساتھ اپنی فکری و اخلاقی اور عملی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے تعاون سے عوام کے لئے اس مقدس مقصد تک پہنچنے کے وسائل فراہم کر سکتے ہیں۔

اشکال: اس موقع پر ممکن ہے کوئی کہے: ہو سکتا ہے کہ حکمراں طبقے، محکمہ انتظامیہ اور محکمہ احتساب کی نگرانی میں جو انسانی قوانین، افراد کی پرورش میں سہولت کے لئے اور حصول کمالات کے لئے اور اسی طرح لوگوں کے حقوق کی حفاظت اور ان میں روابط اور استحکام پیدا کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں دین کی جگہ حاصل کر لیں۔

جواب: ہر انصاف پسند شخص تصدیق کرے گا کہ جو باتیں انسان کی محدود معلومات اور افکار کا نتیجہ ہوں گی اس میں یہ صلاحیت نہ ہوگی کہ وہ کروڑوں لوگوں کی آئندہ قسمت کا فیصلہ کرے اور معاشرے کی ضروریات کا تفصیلی جائزہ لے سکے۔ہمارا ذاتی مشاہدہ ہے کہ دنیا کے قانون ساز ایک دن بیٹھتے ہیں اور ایک قانون وضع کرتے ہیں اور دوسرے دن جب انہیں اپنے بنائے ہوئے قانون کے نقائص کا علم ہوتا ہے تو اس میں ترمیم و تنسیخ کرتے ہیں اس کے باوجود جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہ قانون قابل عمل یا فائدہ مند نہیں رہا تو اسے منسوخ کر دیتے ہیں۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اگر وہ قانون مفید بھی ہو اور قابل عمل بھی ہو تب بھی اس پر عملدرآمد کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔

کیونکہ جس معاشرے میں اخلاقی، ایمان کی فضیلت اور روحانی ذمہ داری موجود نہ ہو اس معاشرے میں اس قانون پر عملدرآمد کرانے کی ضمانت کونسی قوت دے سکتی ہے۔اور عملدرآمد کرانے والی قوت کو کس طاقت سے قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔فرض کیجئے ان کی نگرانی کے لئے ایک "محکمہ احتساب" قائم کر دیا جائے اور پھر وہ محکمہ اس سے ذاتی فائدہ اٹھانے لگے اور اپنے اختیارات سے ناجائز مفاد حاصل کرنے لگے تو دوسروں کی ذمہ داری کیا ہے؟ کوئی قوت ہے جو انہیں اس کام سے روکے؟ پھر ضروری ہو جائے گا کہ ایک اور محکمہ قائم کیا جائے جو "محکمۂ احتساب" کا احتساب کرے اور اسی طرح ایک تیسرے محکمہ کو اس محکمہ احتساب کے احتساب کے لئے قائم کرنا پڑے گا۔اس کے بعد چوتھا محکمہ تیسرے محکمہ کی نگرانی کے لئے مقرر کرنا ہوگا اور یہ حیرت انگیز سلسلہ چلتا جائیگا۔یہی وجہ ہے کہ انسانی قوانین خواہ کتنے ہی اچھے اور درست وضع ہوئے ہوں اس پر عملدرآمد ہمارے خیال میں مشکل ہے۔صرف ایمانی

قوت جس کی بنیاد خدا شناسی اور مذہبی اصولوں پر ہو؛ وہی بہترین محتسب اور بہترین ناظر ہے جو قوانین پر عملدر آمد کرانے کی ضمانت دے سکتی ہے۔

گزشتہ بحثوں سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دین وایمان ٗفرد اور معاشرہ کے کمال کیلئے بنیادی ستون ہیں اور ہم انسان کی تقدیر پر اس کی تاثیر کے بارے میں جس قدر غور کرتے ہیں اس کے احیاء کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

خدا کی جانب

مادہ پرست سائنسدانوں کی مخالفت

فطرت یا رہنائے خداپرستی

ہمیں کیسے پتہ چلے کہ فطرت ہے یا عادت؟

خدا شناسی کا موضوع اعلیٰ ترین اور بہترین موضوعات میں سے ہے جس پر اب ہم بحث کرنے

والے ہیں اور ہماری تمام آئندہ کی جانے والی بحثوں کی بنیاد اور اساس اسی پر ہوگی کہ موجودہ صورت میں اس مسئلہ کو ثابت کرنا بہت سادہ اور آسان ہے۔

مادہ پرست سائنس دانوں کی مخالفت

ممکن ہے ابتداء آپ ہماری بات قبول نہ کریں اور یہ بات آپ کی حیرت کا باعث بنے کہ کس طرح یہ موضوع (خدا شناسی) سہل اور آسان ہے جبکہ بڑے بڑے سائنسدانوں ٗمفکروں اور بڑے بڑے موجدوں اور دریافت کرنے والوں نے اس مسئلہ کو ماننے سے انکار کردیا ہے۔ اور ان کی شدید اور سخت مخالفتیں ہی اس مسئلہ کے مشکل ہونے کی بڑی دلیل ہے۔

لیکن خدا پرستوں کے ساتھ مادہ پرست سائنس دانوں کے جھگڑے کی وجوہات کو اگر بغور دیکھا جائے تو یہ طرز تفکر شکست کھا جاتا ہے کیونکہ مادہ پرست سائنس دانوں کی مخالفت اس وقت سے شروع ہوئی جبکہ کلیسا اپنی غیر معمولی طاقت کی وجہ سے اور ان مضحکہ خیز خرافات کی وجہ سے جو مسیحی مذہب کے ساتھ وابستہ کردیئے گئے تھے ٗپورے یورپ پر حکومت کر رہا تھا اور چونکہ سائنسی تحقیقات کی اشاعت دربار یورپ کے شخصی مفاد سے متصادم تھی اس لئے اہل کلیسا سائنسی علوم کی اشاعت کی سخت مخالفت کرتے تھے اور علوم طبیعیات کے ماہروں کو زنجیروں میں جکڑ دیتے تھے اور انہیں سانس لینے تک کی اجازت نہیں دی جاتی تھی [۱] اور (کلیسا نے) بادشاہوں اور سیاست دان لوگوں کو اپنی ریاست کے زیر اثر لایا ہوا تھا اور اس طرح اس وقت کے بہترین ہتھیاروں سے اپنے مخالفوں کا مقابلہ کرتے تھے [۱]

کلیسا کے بے رحمانہ جرائم آخری حد پر پہنچ گئے تھے کہ سائنس کی اشاعت شروع ہوئی اور روشن فکر لوگ جو اپنے زمانے کے فضول عقائد سے تنگ آچکے تھے ان کے پیچھے چل پڑے اور دوسری جانب آزادی کے طلبگار موقع سے فائدہ اٹھا کر ظالم حکومتِ وقت کے برخلاف میدان کارزا میں اتر آئے ہیں۔

یہ تمن قوتیں عجیب مددگاروں کے ہمراہ دین کے خلاف لڑائی میں مصروف ہو گئے اور مختلف وسیلوں سے اپنے پنجے مضبوط گاڑ لئے اور اپنے مقاصد کی تکمیل اور دنیا اور خدا پرستوں سے اقتدار چھیننے کے لئے

کسی قسم کی جسارت کرنے سے دریغ نہ کیا۔ یہ لڑائی تھوڑی تھوڑی کامیاب ہونے لگی اور پوپ اور کلیسا پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے اور دین کے خلاف تقاریر کے نتیجے میں مادہ پرست سائنس دان پوری مغربی دنیا پر چھا گئے اور تھوڑے ہی عرصے میں (یہ تعلیمات) ''سائنس کا قیمتی تحفہ'' کے عنوان سے یورپ کے دروازوں سے مشرق میں وارد ہوئیں اور تمام لوگوں نے اس کی پذیرائی کی۔

علوم طبیعیات کے عالموں کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے پاپاؤں کے بیہودہ اصولوں کی مخالفت کو وسعت دی اور کلیسا کے اقتدار کے زمانے میں انہیں جو صدمات پہنچے تھے اس کا بدلہ لینے' اس سے دشمنی کرنے اور ان (صدمات) کی تلافی کے لئے وہ بالکلیہ خدا سے ہی منکر ہو گئے حالانکہ ان کی یہ شدید مخالفت صرف سائنس کی نشر و اشاعت کی خاطر اور اسقفوں اور پاپاؤں کی بیہودہ حرکتوں سے بچنے کی حد تک ہونی چاہئے تھی۔ لیکن جس وقت یہ بازی چند جاہ طلب اور متعصب مادہ پرستوں کے ہاتھ میں آ گئی تو اس علمی جھگڑے کو انہوں نے ذاتی جھگڑے سے بدل دیا اور تمام آسمانی مذہبوں اور ان سے متعلق عقیدوں اور باتوں پر بھی شدید مخالفانہ حملہ کئے [1]

اس لئے مادہ پرستوں کی مخالفت اور لڑائی کو اس موضوع کے مشکل ہونے کی دلیل نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ ہم نے جس طرح بیان کیا ہے کہ ان میں سے چند کی یہ مخالفت محض اپنا اقتدار بڑھانے کے لئے تھی اور دوسرے گروہ کی لڑائی اور مخالفت کی بنیاد صرف سائنسی علوم کی نشر و اشاعت اور کلیسا والوں کے خرافات کی روک تھام تھی [1]

یہ بات بھی مخفی نہ رہے کہ اب علوم طبیعی کے علماء میں زیادہ وہ لوگ ایسے پیدا ہو رہے ہیں جو قطعی خدا پرستی کی طرفداری کرتے ہیں [2] ۔ یہ خود اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ یہ جھگڑا فطری دین سے نہیں بلکہ پادریوں کے بنائے ہوئے دین سے ہے۔

فطرت یا رہنمائے خدا پرستی

ہر شخص خواہ وہ غریب ہو یا امیر عالم ہو یا جاہل اس کا مرتبہ اور اس کی شخصیت کیسی ہی ہو اور خواہ وہ معاشرہ یا سماج میں کسی شرط اور رسم و رواج کے تابع اپنی زندگی گزارتا ہو سے لیکر وحشی ترین معاشرہ تک

جس وقت سے اس کے حال پر چھوڑ دیں اور اس کی فطرت تمام سائنسی اور فلسفی متعلقات سے اور خدا پرستوں اور مادہ پرستوں کی باتوں سے بالاتر ہو جائے اور مادی اسباب میں سے وہ کسی سبب کا تابع نہ رہے تو خود بخود اس مقتدر اور قوی قوت کی جانب متوجہ ہو جائے گا جو دنیائے حسی سے بالاتر ہے اور مادی دنیا پر حکومت کر رہی ہے۔

انسان ایسے موقع پر اپنے کو دنیا کے اجزاء میں سے ایک جزء سمجھتا ہے اور دنیا کو ایک ازلی اور ابدی ناقابل تغییر قوت کے تحت سمجھتا ہے جو اس کی اور اس عالم ہستی کی خالق ہے۔ وہ اپنے دل کے گوشوں میں اور اپنی جان و دل کی گہرائیوں میں احساس کرتا ہے کہ ایک لطیف اور مہربان آواز ایک مضبوط اور منطقی طریقے سے اسے ایک ایسی ہستی کی طرف بلاتی ہے جس کو خدا کہتے ہیں۔ یہ آواز وہی انسان کی پاکیزہ اور بے آلائش فطرت کی آواز ہے جو ایک مقتدر اور قوی حاکم کی طرح خدا پر ایمان لانے کا حکم صادر کرتی ہے۔

لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ فطرت کے اثرات مختلف حالتوں میں مختلف ہوتے ہیں یعنی ماحول' عوامل کی وہ تعلیم و تربیت ہے جو فطرت کی تاثیر میں کمی اور زیادتی کرتی ہے مثلاً جس وقت مختلف تفکرات انسان کے اطراف اس طرح گھیرا ڈال دیتے ہیں جس طرح کسی ملک کی فوج کے سپاہی کسی مملکت کا محاصرہ کر لیتے ہیں۔ جب تک اس کا ذہن ہر فکر و اندیشہ سے خالی نہ ہوگا فطرت کے فرمان کے اثرات میں بہت فرق پڑ جائے گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ بعد میں کسی وقت اس کا وہی حال ہو جائے کہ اس کا حکم ایک معزول حاکم کے فرمان کی طرح بے اثر ہو جائے۔

اسکی بنیادی وجہ: جس وقت انسان اپنے آپ کو مشکلات اور الجھنوں میں پھنسا ہوا دیکھتا ہے اور جس وقت طبیعی حادثات اور واقعات اور غیر طبیعی حادثات جیسے سیلاب' زلزلہ' سمندر میں طوفان کا آ جانا اور ہوائی جہاز کا گر جانا وغیرہ سے وہ دوچار ہوتا ہے تو اس موقع پر ہاں ہاں' اسی موقع پر کہ اس کا ہاتھ مادی وسائل میں سے کسی تک نہیں پہنچ سکتا اور اس کے لئے کوئی جائے پناہ اور آسرا نہیں ہوتا اور بحر اوقیانوس کی تیز و تند موجوں کے درمیان غوطے کھا رہا ہوتا ہے یا آسمان کے بیچ میں جہاں اس کے ہوائی جہاز کو آگ

لگ چکی ہو اور وہ پلٹیاں کھاتے ہوئے نیچے آ رہا ہو ایسے وقت میں وہ اپنے کو ضعیف و کمزور پاتا ہے اور

---

۱ [سچ تو یہ ہے کہ مسیحی پاپاؤں اور زیادہ صحیح تو یہ بات ہے کہ مسیح ؑ کے جھوٹے طرفداروں کے ہولناک مظالم اور جرائم جن کے وہ قرون وسطی میں مرتکب ہوئے تھے لکھے جائیں تو قلم کا سر شرم سے جھک جائے۔

سال ۱۲۳۳ء سے جبکہ ایک محکمہ تفتیش عقائد (عقیدوں کے جانچ پڑتال کرنے کا محکمہ) کے نام سے مذہب کے برخلاف عقیدہ رکھنے والوں کے لئے "گری گوارنہم" کے ہاتھوں تشکیل پایا۔ انیسویں صدی عیسوی تک (یہ محکمہ) قائم رہا۔ پاپاؤں اور پادریوں کی جانب سے اس عرصہ میں جن جرائم اور مظالم کا ارتکاب ہوا ہے ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ قلم اس کی تفصیل لکھنے سے عاجز ہے۔

عظیم دانشور آقای مکارم کتاب "وحی یا شعور مرموز" کے مقدمہ میں اس طرح رقم طراز ہیں: "اس قدر جاننا چاہئے کہ ان اشخاص کو جنہیں عقائد کی جانچ پڑتال کے سلسلہ میں زندہ جلا دیا گیا یا موت کے اندھے کنوؤں میں ڈھکیل کر ان کا گلا گھونٹا گیا۔ ان کی تعداد کا اندازہ پچاس لاکھ کیا جاتا ہے اور بعض کے قول کے مطابق یہی محکمے تھے جنہوں نے صدیوں تک یورپ میں خون کی ندیاں بہائیں۔

یہ محکمے نادان مسیحی پاپاؤں کے لئے اپنے دشمنوں کا قلع قمع کرنے کا بہترین ذریعہ تھے اور (یہ محکمے) ماہرین طبیعیات کے نظریات کی اشاعت پر سخت بندش عائد کرتے تھے۔

کیتھولک فرقہ (مسیحی مذہب کا ایک فرقہ) کے بعض پیشواؤں نے گیلیلو کو جسکے نظریات زمین کی گردش اور سیاروں کی حرکت کے باب میں تھے اور محض اسلئے کہ وہ ان کے خیال میں مذہبی اصولوں کے برخلاف تھے اس کو قید کر دیا۔ گیلیلو بیچارہ ۱۶۳۲ء میں اس بناء پر کہ اس کے جانی دوست کارڈینال باربرینی نے اربن ہشتم کے لقب سے پوپ کا عہدہ سنبھال لیا تھا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک کتاب "اینا لیائی" کے نام سے شائع کی جس میں تین آدمیوں نے گفتگو کی تھی۔ ان میں سے ایک بطلیموس اور دوسرے آدمی تھے جو کوپرنیک کا دفاع کر رہے تھے۔ اسی دوران پوپ کا غضب و غصہ بجلی کی طرح چمکا اور اس کو مجلس میں حاضر کیا گیا اور عقائد کی جانچ پڑتال کرنیوالے محکمے کے ایک اعلی مرتبہ کے رکن کے مکان میں اس کو ٹھہرایا گیا لیکن اسے اس قدر آزادی حاصل تھی کہ وہ محل میں آ جا سکتا تھا اور اپنے دوستوں سے جو (اسقف اعظم کی مجلس کے ممبر تھے) سے ملاقات کر سکتا تھا۔ ٹھیک اسی وقت مقدس باپ (پوپ) کے محکمے والے اس کے برخلاف مقدمہ کی تحقیقات کر رہے تھے اور اسے بتاریخ ۲۰ / جون ۱۶۳۲ء حسب ذیل توبہ نامہ پر مجبوراً دستخط کرنے پڑے:

بے اختیار ایک لطیف انداز کے ساتھ 'اپنی بے بسی کی کیفیت قدرت سے بیان کرتا ہے اور اپنا ہاتھ کسی کے دامن کی طرف بڑھاتا ہے جس کی قدرت تمام قدرتوں سے بڑھ کر ہے اور اس کی بارگاہ میں عاجزی کا اظہار کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی فوق العادہ قوت سے اس کا ہاتھ پکڑ لے اور اس ہلاکت کے مقام سے اسے چھٹکارا دلائے۔ یہ خاص مرکزی اور پوشیدہ قوت جو اس موقع پر بندہ کو اپنی جانب کھینچتی ہے اسی طاقت کا نام "خدا" ہے وہی بے پناہ طاقت ہے جو دنیا کے وجود پر مسلط ہے اس کی ہستی ایسی ہے کہ عالم موجودات اسی کے وجود کے سرچشمہ سے سیراب ہے۔

"میں گلیلیو اپنی عمر کے سترویں سال میں آپ لوگوں کے سامنے گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر اپنے روبرو کتاب مقدس کو رکھ کر اور اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے چھو کر توبہ کرتا ہوں اور زمین کی حرکت کرنے کے بے حقیقت دعوی سے انکار کرتا ہوں اور اس (دعوے) کو قابل نفرت اور قابل استرداد سمجھتا ہوں"۔

یہ ذلت آمیز توبہ نامہ اس سے منسوب کر دیا گیا۔ اس کی بعد اسے شہر میں کے اسقف پکولومینی کے مکان میں قید کر دیا گیا (دیکھئے کتاب تاریخ علوم تالیف "پی یر روسو" پانچویں اشاعت مترجمہ آقای حسن صفاری)

پروٹسٹنٹ مسیحی کا ایک دوسرا فرقہ ہے انہیں سائنس اور سائنس دانوں سے ناقابل مفاہمت عداوت ہے اور وہ بھی کیتھولک فرقہ سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ وہ سائنس دانوں کو بری طرح ذلیل کرتے تھے۔ یہی پروٹسٹنٹ تھے جنہوں نے "جیوردانو برونو" اور "آنی تی" اور "میشل سردہ" کو اپنے سائنسی نظریات کی اشاعت کے جرم میں زندہ جلا دیا تھا۔ (ملاحظہ کیجئے کتاب فیلسوف نما اشاعت سوم) یہ قرون وسطی کے مسیحیوں کے چند نمایاں روحانی جرائم ہیں جن کی وجہ سے ماہرین علوم طبیعی ما رگزیدہ انسان کی طرح دین سے اور خدا سے مذہب سے اور مذہب کے طرفداروں سے بھاگتے ہیں]

۱ [شاہ انگلستان ایڈورڈ اول نے مشہور فلسفی بیکن کو علم کیمیا پر بحث کرنے سے روک دیا تھا اور اس علم کے بارے میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں بھی اسے تقریر کرنے کی اجازت نہ دی بلکہ اسے جلاوطن کر کے پیرس بھیج دیا گیا تا کہ وہ کلیسا کی نگرانی میں رہے۔ اس صدی میں افکار اس قدر منجمد اور محدود تھے کہ سائنس کی جانب بیکن کی توجہ کو اس کی کافری سمجھتے تھے۔ (ملاحظہ کیجئے کتاب "عظمت مسیں دراسپانیا" تالیف "ژوزف ماک کاپ"]

ہم نے اپنی طویل زندگی کے دوران ایسے اشخاص کو بچشم خود دیکھا ہے یا تاریخ کے صفحات میں ان کے نام پڑھے ہیں جو اپنی قدرت وشوکت کے زمانے میں خدا کی جانب بالکل متوجہ نہ تھے لیکن جونہی انھیں کمزوری اور شکست کا سامنا کرنا پڑا وہ پوری رغبت کے ساتھ اس مقدس ہستی کی جانب متوجہ ہو گئے اور دل وجان سے اس کی پرستش کرنے لگے۔

ہمیں کیسے پتہ چلے کہ یہ فطرت ہے یا عادت؟

ممکن ہے یہاں یہ اشکال پیش آئے کہ: یہ اندرونی آواز جس کے متعلق آپ کا ادعا ہے کہ یہ فطرت کی آواز ہے اور تمام لوگوں میں موجود ہے' اس کا امکان ہے کہ یہ بات معاشرہ اور ماحول کی تعلیمات سے یا معاشرہ کے رسوم و عادات کی وجہ سے حاصل ہوئی ہو ورنہ ایک ایسی جماعت جسے ان باتوں سے کوئی سابقہ نہ پڑا ہو وہ ایسی آواز کا احساس کس طرح کر سکتی ہے؟

عادت اور فطرت کا فرق

عادات و رسوم سے مراد وہ قابل تغیر اور ناپائدار امور ہیں جو مختلف اسباب اور عوامل کے تابع ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کا تعلق سیاست سے ہوتا ہے بعض کا اقتصادیات کی پیداوار ہوتے ہیں اور بعض کا تعلق جغرافیہ سے یا اس جیسی اور چیزوں سے ہوتا ہے۔ یہ بات تو مسلم ہے کہ (سیاست، اقتصادی حالت، مقام اور جغرافیائی علاقہ سے متعلق) عوامل ہر جگہ ایک جیسے نہیں ہوتے بلکہ ان میں نمایاں اور واضح اختلافات پائے جاتے ہیں مثلاً (شمالی علاقوں میں سے) ایک علاقہ میں سردی سے محفوظ رہنے کے لئے موٹا لباس اور موٹے کپڑے پہنے جاتے ہیں اور اگر وہی لباس استوائی علاقوں میں پہنا جائے تو

---

۱ [کمیونسٹوں نے دین اور دین پر اعتقاد کو سائنس اور فلسفہ کا مدمقابل قرار دیا اور وہ اپنے طرفداران کو اس سے (دین سے) روکتے تھے۔ ہم اس جگہ ان کی گفتگو کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں جو "جوانان کمیونسٹ شوروی" (روسی کمیونسٹ کا پرچہ) کی اشاعت مورخہ ۱۸/اکتوبر سنہ ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی ہے۔

(یہ) انجمن دین سے متعلق امور سے بے تعلق نہیں رہ سکتی اور دین کی مخالف نشریات کو مذہبی رجحانات کے برخلاف شائع کرنے سے باز نہیں رہ سکتی کیونکہ انجمن سائنس کی طرفدار ہے اور دینی عقائد اس کے (سائنس کے) مخالف ہیں۔ (کتاب فیلسوف نما اشاعت سوم)]

قابل مضحکہ قرار پائے گا یا یہ بات کہ کسی قوم میں ایک غذا معمولاً کھائی جاتی ہے لیکن وہی غذا دوسری جگہ بالکل متروک ہے یا یہ کہ سیاسی اور اقتصادی جماعتوں کی تشکیل کے طریقوں کے فرق کی وجہ سے کسی قوم کے مقبول اور پسندیدہ رسم ورواج اور آداب پیدا ہوتے ہیں اور وہی عادتیں دوسری قوم کی نظر میں ناپسند اور مکروہ سمجھی جاتی ہیں۔ برخلاف فطری امور کے کہ وہ ایک فطری اور روحانی الہامات کے ناقابل تغیر اور پائدار سرچشمے سے ابلتے ہیں اور جسم وجان پر ان کا کامل اثر ہوتا ہے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے زمانہ اور تاریخی حالات کی تبدیلی اور قوموں اور دنیا کے معاشروں کے باہمی فرق کے باوجود ان میں بمشکل کوئی

---

۱ [ہم آئندہ مباحث میں اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے]

۲ [ہم اس جگہ ایسے دو نظریات پیش کریں گے جس کے متعلق آخری دور کے دو سائنس دانوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

الف: مشہور انگریز سائنس داں اور فرضی امور پر لکھی ہوئی مشہور کتاب "تبدل انواع" کے مصنف شارلز رابرٹ ڈارون (۱۸۰۹ـ۱۸۶۲) نے اپنے بعض خطوط میں جو اس نے جرمنی کے سائنس دانوں کو لکھے ہیں (بُخنر کے بیان کے مطابق جو اس نے کتاب "اصل الاصول" کے صفحہ ۱۶ پر تحریر کیا ہے) اس میں یہ بات لکھی ہے:

عقل رسا کے لئے محال ہے کہ باوجود اس نظام کو اور اس کی ہم آہنگی کو دیکھنے کے بعد یہ کہے کہ دنیا کی کوئی بنیاد نہیں (ملاحظہ کیجئے کتاب ارتباط انسان وجہان جلد اول صفحہ ۳۶ او جلد سوم صفحہ ۲۰)

ب: آخری دور کا نامور ریاضی دان البرٹ آئنسٹائن (۱۸۷۹ـ۱۹۵۴) اس طرح بیان کرتا ہے:

دنیا میں دین کا احساس سائنس کی تحقیقات کا سب سے قوی اور سب سے اعلیٰ سرچشمہ ہے۔ میں نے دین کا جو لفظ استعمال کیا ہے اس سے میرا پورا مطلب ادا نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کو (دین کو) روح سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ روح تو وہ ہے جس کا ہم اپنے ضعیف حواس خمسہ سے ادراک کر سکیں۔ اندرونی عمیق ایمان اور ایک اعلیٰ درجہ کے فطری جذبے نے جس کا دوسرے ادراک نہیں کر سکتے میرے اعتقاد کو خدا کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ (رجوع کیجئے کتاب "جہان و ڈاکٹر اینشٹین" اور کتاب "ارتباط انسان وجہان" جلد سوم)]

تبدیلی ہوسکتی ہے مثلاً ماں کا تعلق بیٹے سے ایک فطری امر ہے یہاں تک کہ وہ اس چھوٹی سی گڑیا کی پوری طرح نگہداشت کرتی ہے جسے وہ ایک خیالی اور بناوٹی بیٹے کے نام سے اپنے لئے بناتی ہے اور اس سے محبت کرنے لگتی ہے اور اسے حقیقی بیٹے کی طرح عزیز رکھتی ہے' اس کو پیار کرتی ہے' اس پر مہربانی کرتی ہے اور اگر کسی دن وہ اس کی نظر سے غائب ہوجائے تو اس کی جدائی میں روتی ہے۔اب بتائیے کہ کیا کوئی تاریخ یا کوئی اور عامل انسان میں سے یہ حس چھین سکتا ہے یا اس فعل کو بھانڈ پن کا کھیل قرار دے سکتا ہے؟!

ممکن ہے کوئی شخص کہے: تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ زمانہ جاہلیت کے لوگ جو حجاز میں رہتے تھے اپنی بے گناہ لڑکیوں کو بری طرح قتل کردیتے تھے۔یہ عمل اس کے فطری ہونے کی نفی کرتا ہے۔

لیکن یہ بات نہ بھولنا چاہئے کہ ہم نے پہلے بتادیا ہے کہ ماحول اور بری تعلیمات کی وجہ سے فطری اثرات کچھ عرصہ کے لئے بعض لوگوں پر کم اثر انداز ہوتے ہیں یا تھوڑی دیر کے لئے بالکل ہی اثر نہیں کرتے۔لیکن ماحول کے بدل جانے اور بری تعلیمات کے اثرات ختم ہونے پر ان کے غلط افکار میں بھی تبدیلی واقع ہوجاتی ہے اور آخر کار فطرت اپنا اثر دکھاتی ہے اور اپنی سابقہ حکومت کا از سر نو آغاز کرتی ہے۔لہٰذا یہ کیفیت مملکت حجاز میں کچھ عرصہ کے لئے پیدا ہوگئی تھی لیکن ظہور اسلام کے بعد وہ کیفیت بہت جلد زائل ہوگئی اور فطرت کے بیجان ڈھانچہ میں تازہ روح پیدا ہوگئی۔

خلاصہ یہ کہ فطرت سے انحراف ہمیشہ غیر معمولی مشتق حالات میں ہوتا ہے لیکن یہ وقتی ہوتا ہے اور ناپائدار ہوتا ہے۔اب ہم اپنے اصل مقصد کی طرف چلتے ہیں:

انسانی تاریخ پر ایک نظر

اب ہم پیچھے پلٹتے ہیں اور انسانی زندگی کی تاریخ کو ماقبل تاریخ دور تک زیر مطالعہ لائیں گے۔تاریخ اور اس کے لاتعداد صفحات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم پر یہ بات روشن ہوجاتی ہے کہ ہر فرد بشر کا یہ عقیدہ ہے کہ پوشیدہ مرکز اور ایک بڑی حقیقت موجود ہے یعنی کائنات عالم اور کائنات ہستی کو پیدا کرنیوالی ایک مقتدر اور عظیم طاقت موجود ہے۔انتہا یہ کہ یہی طاقت انسانوں کے عقل وفہم کی رسائی کے مطابق اور ان

کی معلومات کے مطابق ایک خاص انداز اور ایک خاص صورت میں ان کے سامنے جلوہ گر ہوتی رہی ہے۔[1] ایک دن بت پرستی کے روپ میں دوسرے روز ماہ وآفتاب پرستی کی صورت میں اور تیسرے روز آتش پرستی کی شکل میں اور آخر کار جب انسان کا ظرف اور اس کی استعداد زیادہ ہوگئی تو اس نے ایک زبردست یگانہ اور نادیدہ خدا کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کردیا۔[1]

جو قدر مشترک ان مراتب یعنی "اعتقاد و بنیاد" کے درمیان ہر دور میں اور تمام زندہ اور مستحکم قوموں کے درمیان ہمیشہ سے موجود تھی اور ہے۔انسانوں اور قوموں کے معاشرہ کے ان لوگوں میں جو مادہ پرستوں کی تعلیمات وتبلیغات کے زیر اثر نہیں ہیں اب بھی یہ اعتقاد موجود ہے[2]

اس جگہ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک تاریخی حساس نکتہ کو بیان کرکے ماقبل تاریخ کے دور میں مشغول ہوجائیں۔

مشہور ماہر نفسیات فرویڈ[3]

اسکے بعد جبکہ جزیرۂ آسٹریلیا کے باشندوں کو جنہیں کامل وحشی اور آدم خور قوموں کا ایک حصہ شمار کیا جاتا تھا ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ایک ایسی ہستی موجود ہے جس کو وہ "توتم"[4] کہتے ہیں لیکن خالق کے عقیدہ کے سے ہٹ کر یہ کوئی اور دوسری شکل ہے کتاب Psychanalyse (نفسیات) کے صفحہ ۱۹ میں اس طرح لکھتا ہے:

توتم کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ پہلے تو وہ قبیلہ کا سب سے پہلا جد اعلیٰ اور ان کے کاموں میں مدد دینے والی اور حفاظت کرنیوالی روح ہے اور یہ کہ وہی (روح) انہیں حکمت سکھاتی ہے اور ان کی مشکلات اور ان کے نا قابل حل مسائل کا حل بتاتی ہے اور خطرات کے موقع پر اپنے (قبیلے کے) بچوں کو وہ پہچانتی ہے اور انھیں پناہ دیتی ہے اسی لحاظ سے ایک "توتم" کی ساری اولاد ایک مقدس اصول کے تحت کام کرتی ہے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اس کے سرانجام نہ دینے اور اس سے انحراف کرنے کی صورت میں "توتم"[5] کی جانب سے انہیں سزا ملے گی۔

زمانہ ماقبل تاریخ

ہماری نظر پرانی تاریخ کے آخری سرے پر پہنچ گئی ہے آخری دور کی تاریخ کے ابتداء صفحات کا مطالعہ زمانہ ماقبل تاریخ کو خوشخبری دیتا ہے:

اس مرحلہ پر ہم کسی تاریخ کے مطالعہ سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے اس لئے کہ تاریخ کے صفحات کو الٹنے کی بجائے ہمیں چاہئے کہ زمین کے ضخیم اور ناہموار صفحات کو سائنس کی قوی اور مضبوط انگلیوں سے پلٹیں اور اس کے ہر صفحہ کا غور سے مطالعہ کریں تو ہماری زمین کی گہرائیوں اور نچلے طبقوں میں ہماری گزرے ہوئے اور سابقہ دور کے لوگوں کے جو آثار اور نشانیاں موجود ہیں وہ ہمارے مقصد کی رہنمائی کرینگی جو کہ ہمیشہ بڑی بڑی مقتدر طاقتوں کے مقابلہ میں انسانی معاشرہ پر حکومت کرتی آئی ہیں۔

مصری مشہور سائنسداں محمد فرید وجدی کہتا ہے:

ہم (زمین کی کھدائی کرکے اور زمین کو چیر کر) جس قدر بھی گزشتہ لوگوں کے آثار کی تلاش کرینگے ہمیں معلوم ہوگا کہ بت پرستی اور صنم پرستی ان کے عقلی اور مادی مشاغل تھے۔ یہی دانشور اس مطلب سے پہلے چند سطریں لکھتا ہے:

مبدء (بنیاد) پر اعتقاد کا وجود اس وقت سے ہے جب سے انسان پیدا ہوا ہے [1]

کیا اب یہ مناسب ہے کہ ہم ایسی چیز کو جو روحانی اور فطری جذبات کے ماسوا ہو اس حیرت ناک احساس کی بنیاد تصور کریں جو ماقبل تاریخ کے زمانے سے آج تک پائدار اور باقی تصور کیا جاتا ہے؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ اس عمل اور اس کردار کو جو اس مقدس احساس کی پیداوار ہے ہم عادت کہیں؟

تاریخ انبیاء ؑ

اگر ہم تاریخ انبیاء ؑ کا مطالعہ کریں تو یہ دلچسپ نکتہ سامنے آئے گا کہ ان کی دعوت کے دو پہلو تھے۔ مثبت اور منفی۔ وہ بت‘ چاند‘ سورج اور ستاروں وغیرہ کی پرستش سے منع کرتے تھے اور اس مقدس ذات اور مبداء حقیقی کی عبادت کا حکم دیتے تھے۔ ان کی تعلیمات کی بنیاد ایک خدا کی پرستش تھی نہ کہ صرف پیدا کرنیوالے کو ماننا۔ وہ کہتے تھے صرف خدائے واحد کی پرستش کرو‘ اس ذات یگانہ کے سوا کوئی خدا اور کوئی معبود موجود نہیں۔ مختصر یہ کہ پیغمبروں کا مذہبی فریضہ یہ تھا کہ معاشرہ کو معبود و مبداءِ حقیقی سے

روشناس کرائیں وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ فطری اور اندرونی قوت کو (خداپرستی کی روح کو) جو ان کی جان و روح سے براہ راست تعلق رکھتی ہے خارجی غلط چیزوں سے جیسے بت‘ چاند‘ ستارے آفتاب‘ حیوانات اور آگ وغیرہ پر اعتقاد رکھیں۔

ان بیانات سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں:

انسان کی پیدائش کے وقت سے ہی انسانوں میں خداپرستی کا رواج ہے اور اب دنیاوالوں کی اکثریت خداپرست ہے اور انسانوں کے مختلف طبقات اور مختلف نسلوں میں اس کا (خداپرستی کا) وقوع‘ پائداری اور پختگی‘ رسم و عادت سے ہزاروں میل دور ہے۔

مادہ پرستی کا زمانہ

مکتب مادہ پرستی کے آغاز کا پتہ چلانا کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ ہر زمانے میں انسانی معاشرہ میں ایسے کچھ لوگ پائے جاتے ہیں۔ عجب نہیں کہ مادہ پرستی کا آغاز ماقبل تاریخ کے زمانے سے بھی پہلے شروع ہو چکا ہو لیکن جو بات مسلم ہے اور جس کا ثبوت اکثر تاریخوں میں ملتا ہے یہ ہے کہ اس مکتب کی بنیاد کا قبل از مسیح چھٹی اور ساتویں دو صدیوں میں ہونا پایا جاتا ہے اور اسی زمانے میں اس مکتب کے چند طرفدار فلسفی بھی موجود تھے جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ طالس ملطی [1]

۲۔ ہرقلیطوس (ہراکلیت) [2]

۳۔ ذیمقراطیس (دموکریت) [3]

۴۔ اپیکور [4]۔ لیکن قطعی طور پر ان تمام کو مادہ پرست نہیں سمجھا جا سکتا۔

”بانگون“ نے کتاب تاریخ فلسفہ میں ان سے متعلق کچھ باتیں نقل کی ہیں اور اسی کے وسیلہ سے ان کو خداپرستان عالم کے نام سے یاد کیا ہے۔ وہ طالس کے بارے میں کہتا ہے:

”وہ معتقد تھا کہ ہر مادی تبدیلی‘ روحانی عوامل کے اثر سے ہوتی ہے“ [5] اور ہراکلیت کے بارے

---

[1] [ملاحظہ کیجئے کتاب ”مادہ الدوشن“ دائرۃ المعارف فرید وجدی]

میں اس طرح بیان کرتا ہے: وہ کہتا ہے کہ اس متبدل کائنات میں ایک پائدار اور عقل الٰہی موجود ہے جو ناقابل تبدیلی ہے [۱] اور ذیمقراطیسی کے بارے میں اس کا یہ خیال ہے:

ذیمقراطیسی مادہ پرست نہیں ہے بلکہ وہ روح کے وجود کا قائل ہے [۲]

نامور مصری سائنس داں فرید وجدی اپنی کتاب "علی اطلال المذہب المادی" (مادہ پرستوں کے مذہب کے ٹیلوں پر) میں above mationed philosephess اور دوسرے چند فلسفیوں جیسے "اناکز یماندرو" و "اناکز یمین" و "امبیدوکل" اور "لوسیب" [۳] وغیرہ کا نام لیتا ہے اور اس طرح بیان کرتا ہے کہ ان تمام فلسفیوں کو مادہ پرست سمجھا جاتا تھا حالانکہ وہ تمام خدا پرست تھے۔ [۴]

مادہ پرستوں کا مکتب فکر اٹھارویں اور انیسویں صدی میں کچھ آگے بڑھا اور اس کے بہت سے خیر خواہ پیدا ہو گئے جن میں سے ایک گروہ علوم طبیعی کے ماہروں کا تھا اور بعض افراد جیسے شوپنہاور [۵] اس مسلک کے پیروں میں سے شمار ہوتے ہیں لیکن انیسویں صدی کے آ کر سے انحطاط شروع ہوا اور پھر ان کا زوال شروع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اس کے طرفداروں کی تعداد گھٹنے لگی (قوس صعودی اور قوس نزولی کے بنیادی سبب کو آپ مادہ پرستوں کے اشکال کی بحث میں ملاحظہ کریں گے۔

مادہ پرستوں کے عقاید کی بنیاد

۱ [ملاحظہ کیجئے کتاب "مروج الذہب" مسعودی صفحہ ۲۸۔۲۸۳ مطبوعہ قدیم]

۲ [بلکہ اس بات کا دعوی کیا جا سکتا ہے کہ اگر ہم معاشرہ کے ہر ہر فرد کا سینہ چاک کریں اور ان کے دلوں کے گوشوں میں جھانکیں تو پتہ چلے گا کہ وہ بھی اس مادی دنیا کے باہر کسی ماوراء وجود پر عقیدہ رکھتے ہیں کیونکہ فطرت یعنی وہ پاکیزہ مشینری اور وہ تمام افراد کے اندرونی ادراکات کی قوت کی فیکٹری تمام افراد کی سرشت میں موجود ہے لیکن گمراہ کرنیوالوں کی تعلیمات و تبلیغات کی مضبوط زنجیروں نے ان افراد کی فطرت کو مقید کر دیا ہے اور انہیں اجازت نہیں دیتے کہ وہ اپنے طبعی راستہ پر چل کر حق کا اور حقیقت کا ادراک کر سکیں۔]

۳ [فروید (۱۸۵۶۔۱۹۳۹) آج سے برسوں پہلے اپنے فرضی امور کے علم کو جو بعد میں مکتب کی صورت میں آ گیا جو جنسی رجحانات میں کمی کرنے کے بارے میں ہے۔]

۴ [توتمیسم (Totemism)]

ہم مادہ پرستوں کے اعتقادات کی بنیاد کو حسب ذیل چار اصولوں پر قائم کر سکتے ہیں۔

پہلی بنیاد:

کوئی چیز سوائے مادہ اور اس کے آثار کے دنیا میں وجود نہیں رکھتی [۱]

دوسری بنیاد:

دنیا مادی علل و معلول کا مجموعہ ہے اور ہر قابل تعلیل و توجیہ حادثہ مادی اسباب کی وجہ سے ہوتا ہے۔

تیسری بنیاد:

تمام موجودات ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے واسطے علت و معلول ہیں یعنی ہر معلول اپنی نوبت پر علت اور ہر علت اپنے وقت پر دوسری علت کا معلول بن جاتی ہے اور تمام وقوعات و حادثات میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے لیکن اس میں قدر مشترک موجودات جہاں یعنی مادہ ازلی ہے۔

چوتھی بنیاد:

سورج، چاند، ستارے، زمین و آسمان۔ اس عالم کائنات کے در و دیوار اور یہاں تک کہ تمام دنیا اور اس کے اجزاء حادثات و اتفاقات کا معلول ہیں اور اس دنیا کے بنانے میں کسی نقشہ (پلان) یا کسی سوچ اور فکر کا کوئی واسطہ نہیں ہے [۱]

اس بناء پر مادہ پرستوں کے تمام منصوبوں اور افکار کا سرچشمہ یہی چار اصول ہیں اور باقی سب اسی کی شاخیں ہیں اور ہم آئندہ مباحث میں ان دلیلوں پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

۱ [توتم Totem کا لفظ سنہ ۱۷۹۱ء میں انگریزی محقق جے لونگ J. Long کے توسط سے شمالی امریکہ کے سرخ پوستوں کی زبان سے توتام Totam کی صورت میں اقتباس کیا گیا ہے۔]

حصہ دوم

توحید کی روشن ترین دلیل

۱ [دائرۃ المعارف مادہ ''وثن'' صفحہ ۶۳۹]

نظم کی دلیل

خدا پرستوں نے خالق کائنات کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے بہت سی دلیلیں پیش کرتے ہیں جن

---

۱ [طالس یونان کا مشہور فلسفی ہے جو سنہ ۶۴۳ ء میں پیدا ہوا اور سنہ ۵۶۰ یا سنہ ۵۶۷ ء قبل مسیح میں فوت ہوا۔ فلسفہ کی تمام تاریخوں میں طالس کے جن عقائد کو بیان کیا گیا ہے اس عبارت کو اس کے اعتقادات کی سرخی کے طور پر لکھا جاتا ہے۔

''مادہ یا تمام چیزوں کی بنیاد پانی ہے۔ ڈاکٹر درانی نے کتاب ''عرفان واصول مادی'' کے صفحہ ۷ پر طالس کے بارے میں یہ لکھا ہے: طالس نے سب سے پہلے سورج گرہن کی پیشن گوئی کی تھی۔ وہ ہر چیز کی بنیاد پانی کو جانتا تھا۔ چونکہ طالس کی سوچ مادی اور منطقی تھی اس لئے وہ تمام موجودات کی بنیاد کا کی معلوم کرنے میں کامیاب ہوگیا اور یہ فکر آج بھی دقیق طبیعی علوم کی اساس (طبیعات) اور طبیعی کیمیا (فزیکوشیمی) کی تشکیل کرتی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ طالس بندرگاہ کا رہنے والا تھا اور ہمیشہ پانی کے قریب رہنے کی وجہ سے اور پانی کے جانوروں کے ساتھ اس کا اکثر واسطہ ہونے کی وجہ سے طالس کی سوچ پر اثر پڑا اور وہ پانی کو اساس طبعی سمجھنے لگا۔ طالس کو مادہ پرست کی حیثیت سے پیش کرنا تاریخ سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے یا پھر خود غرضی کی بنا پر ہے کیونکہ فلسفہ کی تمام تاریخوں نے اس کو خدا پرست کی حیثیت سے پیش کیا ہے فقط تقفظی ہے جس نے اسے مادہ پرست سمجھا اور اسی لئے تمام معتبر تاریخوں نے اس پر اعتراض کیا ہے۔ آقای ڈاکٹر نے اس بنا پر

میں سے سب سے زیادہ مدلل اور جاذب نظر دلیل، دلیل نظم ہے کیونکہ یہی دلیل عقل کو مطمئن کرتی اور

کہ ہر چیز اپنے محیط کے تابع ہوتی ہے اور طالس کا نظریہ بھی اساس طبیعی کے بارے میں یہی ہے اس لئے اسی نظریہ نے آقای ڈاکٹر کو طالس کا ہم خیال بنا دیا ہے۔ چونکہ اس کے مشہور شاگرد "انکسیمندروس" نے جو خود بھی اسی بندرگاہ "ملطہ" پر پانی کے نزدیک زندگی بسر کرتا تھا وہ مادہ کی بنیاد ایک ایسی چیز کو خیال کرتا تھا جو "بے پایان ہو" اور اس کے دوسرے شاگرد "انکسیمانوس" کا عقیدہ تھا کہ موجودات عالم کا مادہ اول "ہوا" ہے۔ اس بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ یا تو طالوس بالغ نہ تھا یا دوسرے فلسفیوں نے محیط کے تابع رہنے والے نظریہ کو روبہ عمل نہ لایا تھا (ملاحظہ کیجئے کتاب "النفس" اور "مابعد الطبیعیات" تالیف ارسطو اور کتاب "تاریخ الفلسفۃ الیونانیہ" تالیف یوسف کرم استاد آرٹس کالج مصر یونیورسٹی اور کتاب "ارتباط انسان و جہان" جلد اول تالیف آقای جعفری تبریزی اور کتاب "فلسفہ ہائے بزرگ" تالیف پیر دوکاسہ استاد بزانسون کالج مترجمہ آقای احمد آرام)]

۱؎ [ہراکلیت (۵۳۵۔۴۷۵ق م) موجودات کے مادۂ اصلی سے متعلق ہراکلیت کے کئی نظریات نقل کئے گئے ہیں۔

فلسفہ کی اکثر تاریخوں نے اس کے نظریہ کے بارے میں اس طرح لکھا ہے: وہ موجودات کا مبداء اور مادۂ اول "آگ" کو سمجھتا ہے۔ تاریخ الفلسفۃ الیونانیہ کے صفحہ ۲۶۹ پر اور ربیع الفکر الیونانی کے ص ۸۷ پر تحریر ہے: ہراکلیت نے موجودات کا مبداء (لوگوس) (عقل منبسط) کو قرار دیا ہے۔ ارسطو کتاب نفس ص ۱۴ پر کہتا ہے: ہراکلیت مادۂ اول کو بھاپ قرار دیتا ہے۔

ان تمام نظریات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بنظر فلسفہ مادہ کے سلسلے میں ہراکلیت طالس کے مشابہ ہے یعنی طالس کی نظر میں جو مرتبہ اور حیثیت "پانی" کو حاصل ہے۔ ہراکلیت کی نظر میں وہ مرتبہ "آگ" کو حاصل ہے اور اسی طرح مافوق مادہ قوت پر اعتقاد کے بارے میں دونوں نے مقتدر اور متفکر قوتوں کو وجود کی پیدائش میں شامل کیا ہے۔ طالس اس کو روح سے تعبیر کرتا ہے اور ہراکلیت اسے عقل منبسط (عقل کل) کہتا ہے جسے ساری دنیا (لوگوس) کے نام سے جانتی ہے۔

مندرجہ بالا فلسفی کو یونان کے فلسفہ کی تاریخ میں "فیلسوف گریہ" کا نام دیا گیا ہے کیونکہ معاشرہ کا تاریک پہلو ہمیشہ اس کے سامنے ہوتا تھا اور وہ اکثر اوقات روتا رہتا یا خاموش رہتا اور آخر کار اس نے معاشرے سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور پہاڑوں اور بیابانوں میں رہنے لگا۔]

وجدان کو راضی کرتی ہے اور اسی لئے یہ دلیل ہمیشہ سے سائنسدانوں اور فلسفیوں کے لئے باعث توجہ رہی ہے۔

اس دلیل کے بنیادی ستون

اس دلیل کے دو بنیادی ستون ہیں:

۱۔ اس وسیع دنیا کے ہر گوشہ میں نظم و نسق، اصول و قانون اور مقصد نظر آتا ہے۔

۲۔ ہر کارخانہ کو ایک ایسا شخص بناتا ہے جو علم و عقل رکھتا ہے۔

اب دو باتوں کی وضاحت پر توجہ فرمائیے۔

۱؎ [ذیمقراطیس (۳۶۰ق م) میں مکتب تعلیم میں داخل ہوا۔ وہ پانچویں صدی قبل مسیح میں موجود تھا۔ سقراط کے بڑھاپے اور افلاطون کی جوانی کا زمانہ اس نے دیکھا ہے۔ اس نے بہت سے مصریوں کلدانیوں اور ایرانیوں کے ساتھ زندگی بسر کی ہے۔ اس کا عقیدہ تھا کہ دنیا کی تمام چیزیں ذروں پر مبنی ہیں جس کا نام ایٹم ہے اور ذرہ (ناقابل تقسیم ہے) اس کو تقسیم یا جدا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ایک زمانہ گزرنے کے بعد سائنسدان اس امر کے قائل ہو چکے ہیں کہ ہر چیز جدا (تقسیم) کی جا سکتی ہے۔ اس نظریہ پر اختلاف تھا اور علم طبیعیات میں اس کا تھوڑا سا دخل تھا سنہ ۱۹۱۹ء میں ایک شخص نے جس کا نام "رودرفورٹ" تھا ثابت کر دیا کہ ایٹم قابل تقسیم اور قابل تجزیہ ہے]

۲؎ [اپیکور (۳۴۶ق م) سالقیں یونان اسکو (سب سے پہلے نمبر پر) میٹریالسٹ یعنی مادی اصول کا معتقد (دوسرے نمبر پر) اس کو اوولوسیونیسٹ یعنی اصول تکامل (ارتقاء) کا معتقد (تیسرے نمبر پر) فیلانتروپسٹ یعنی انسان دوست اور بنی نوع انسان کا روشن پہلو دیکھنے والا (چوتھے نمبر پر) ۲ تھیسٹ یعنی ملحد اور خدا کے وجود کا منکر جانتے تھے۔

اس مکتب کے فلسفی "فلاسفہ باغ" کے نام سے مشہور ہیں اور یہ باغ اپیکور کی ملکیت تھا جسے اس نے مرتے وقت فلسفیوں کے لئے وقف کر دیا تھا (دیکھئے کتاب فلسفہ سیاسی ڈاکٹر پازارگاد اور کتاب ارتباط جہان و انسان)]

۳؎ [دیکھئے کتاب علی اطلال المادی حصہ اول صفحہ ۱۳]   ۴؎ [اسی کتاب کا صفحہ ۱۵ دیکھئے]

پہلا ستون

اس وسیع دنیا کے ہر گوشہ میں' منظم کارخانے اور منظم ادارے نظر آتے ہیں جو اپنے پروگرام پر اصول وقوانین کے مطابق دنیا کے تمام حصوں پر بلکہ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر بھی حکومت کرتے ہیں اور اس گونا گوں مخلوقات میں سے ہر ایک مخلوق کسی عظیم لشکر کے سپاہیوں کی طرح جو مختلف چھوٹے چھوٹے دستوں میں بٹے ہوتے ہیں یا منظم صفوں کی صورت میں پورے نظم ونسق کے ساتھ کسی ایک حاکم کے حکم کے ماتحت اپنی خاص منزل کی طرف قدم زن ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ: اس دنیا کا وجود غیر منظم اور درہم برہم نہیں ہے اور تمام موجودات اور تمام حوادث (اتفاقات) ایک معینہ خط

---

۱ [اسی کتاب کا صفحہ ۱۵ دیکھئے] ۲ [دیکھئے کتاب علی اطلال المادی حصہ اول کا صفحہ ۱۶ "تاریخ المذہب المادی" کے عنوان کے نیچے]

۳ [بہتر یہی ہے کہ ہم شکاکین (سوفسطائین) کے زمانے سے تاریخ کا جائزہ لیں جو "ڈیموکریٹ" کے بعد وجود میں آئے ان میں سے ایک "پروتاغوراس" ہے جو سنہ ۴۲۰ ق م میں پیدا ہوا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے خدائے تعالیٰ کا صریحاً انکار کیا۔ اس کے بعد کرتیاس (ہے جو) کہتا ہے: "خدا سوائے خیالی پیداوار کے اور کوئی چیز نہیں ہے"۔

سولھویں صدی میں اطالوی فلسفی (پطرس بومباتیوس) مادہ پرستوں کے پیروکاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے سنہ ۱۵۱۶ء میں ایک کتاب شائع کی اور اس کتاب میں ارسطو کے نظریہ کے برخلاف دائمی زندگی کے بارے میں اسطرح رقمطراز ہے:

دائمی زندگی کی بات کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ شخص بغیر جسم کے زندہ رہے اور یہ محال ہے]

۴ [آرتھر شوپنہا ۲۲ رفروری سنہ ۱۷۸۸ء کو جرمنی کے دانتزیک (شہر) میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۸۶۰ء میں وفات پائی۔ "ویل ڈورانٹ" مولف تاریخ فلسفہ کہتا ہے: ظاہر تو یہ ہوتا ہے اس نے (شوپنہار نے) سنہ ۱۸۵۰ء میں خودکشی کی۔ (تاریخ فلسفہ صفحہ ۲۵۴) لیکن وہی شخص اسی کتاب کے صفحہ ۲۵۸ پر اس طرح لکھتا ہے: ۲۱ ستمبر سنہ ۱۸۶۰ء میں وہ اکیلا ناشتہ کر رہا تھا۔ بظاہر وہ صحتمند نظر آتا تھا تھوڑی دیر بعد ایک عورت نے جو اسکی دیکھ بھال کرنے والی اور خدمت گار تھی اسے کھانے کی میز پر مردہ پایا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ "ویل ڈورانٹ" کا یہ آخری

جملہ حقیقت سے قریب ہے اس لئے کہ فلسفہ کی تمام تاریخوں نے شوپنہاور کی وفات سنہ ۱۸۶۰ء میں بتائی ہے۔ پھر "ویل ڈورانٹ" "تاریخ فلسفہ" کے صفحہ ۲۵۲ پر فصل ہفتم میں "شوپنہاور اور اس کا زمانہ" کے عنوان کے تحت شوپنہاور کے زمانے میں یورپ کے انحطاط کے بارے میں لکھتا ہے۔ بعد ازآں صفحہ ۲۵۴ پر اس طرح رقمطراز ہے: کیا دنیوی بلائیں انتقامی تھیں جنہیں خدائے عادل نے عقل والحاد کی صدی پر نازل کی تھیں۔ کیا وہ ایک آواز تھی جو نادم اور پشیمان عقلوں کو ان کے سابقہ دین کے فضائل کے بارے میں باعزت طریقے سے دوبارہ اپنی امیدوں اور عنایتوں کی دعوت دے رہی تھی۔

"شلہ گل" اور "نووالیس" وغیرہ اس طرح سوچتے تھے وہ لوگ ان بچوں کی طرح فضولخرچی سے اپنی تمام رقم خرچ کرکے گھر کی طرف لوٹتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں وہ اپنے قدیم ایمان پر واپس آجانے سے خوش تھے لیکن دوسرے لوگوں نے بڑا سخت جواب دیا ہے اور کہا کہ یورپ کا فتنہ وآشوب اور بے چینی دنیا کی بے ثباتی اور بے چینی کی وجہ سے ہے اور کسی خدائی تنظیم اور امید بہشتی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ "بائرن" "ھانیہ" اور ہمارا زیر بحث فلسفی (یعنی شوپنہاور) اسی طرح خیال کرتے تھے۔

ان حالات میں ہم شوپنہاور کو مادہ پرستی کا الزام نہیں دے سکتے کیونکہ ایسے کلمات اس سے نقل کئے گئے ہیں جن کا ایک مادہ پرست کی زبان سے ادا ہونا قرین قیاس نہیں ہے وہ کہتا ہے۔

مادہ پرست عقل کو کس طرح مادہ سے منسوب کرتے ہیں حالانکہ ہم مادہ کو عقل کی وساطت سے پہچانتے ہیں (ملاحظہ کیجئے کتاب "قصۃ الفلسفۃ الحدیثۃ" ص ۴۰۲) شوپنہاور جو پیسیمسم (بدبینی) کے عقیدہ کا بہت بڑا مفسر ہے اس کی اہم ترین کتاب "دنیا ارادے اور تصور کے مطابق" کے نام سے موسوم ہے سنہ ۱۸۱۸ء میں شائع ہوئی۔

فرڈایک نیچہ جو خود ایک مشہور فلسفی ہے اس کی (شوپنہاور) کی کتاب کا مطالعہ کرکے کتاب کے مصنف کے فوق العادت افکار سے بہت متاثر ہوا اور شوپنہاور کو ابو الفلسفہ (فلسفہ کا باپ) کا نام دیتا ہے۔

ملاحظہ کیجئے تاریخ الفلسفۃ الحدیثۃ۔ ص ۲۸۶ اور کتاب فلسفہ سیاسی جلد سوم صفحہ ۱۷۱ اور کتاب فلسفہ ہائے بزرگ تالیف پیرڈوکاسہ صفحہ ۲۱۴] اور ژان ژاک روسو ۱ [۱۔ ژان ژاک روسو فرانس کے فلسفیوں اور سائنس دانوں میں سے ایک ہے۔ ۲۸ رجون سنہ ۱۷۱۲ء شہر ژنو میں پیدا ہوا (ژنو سوئس کے جنوب مغرب میں ایک شہر ہے) جو اس زمانہ میں ایک مستقل ملک تھا اور ۲ رجولائی سنہ ۱۷۷۸ء (انقلاب فرانس

سے ایک سال قبل)وفات پائی ۔شہر مصر کے سائنسداں فرید وجدی نے کتاب دائرۃ المعارف میں ژان ژاک روسو کو اپنے زمانے کے خدا پرستوں میں شمار کیا ہے ۔

فرید وجدی کہتا ہے :''ژان ژاک راسو'' حسب ذیل الفاظ میں عقیدۂ (توحید) کا اعتراف کرتا ہے :
محسوس ہونے والا مادہ کبھی متحرک رہتا ہے اور کبھی ساکن و ...... حتی کہ وہ کہتا ہے جو چیز ثابت ہو چکی ہے وہ یہ ہے کہ ہم اسی وجود کا ایک جزء ہیں لیکن اس وجو کو سمجھنے کا ہم میں کلی شعور نہیں ہے ان منظم اور متلاطم حرکتوں میں جو وجود ہے وہ ان قوانین فطرت کے سامنے عاجز ہے جو اپنی جگہ پر موجا ور قائم ہیں ۔اور جو آزادی حیوان اور انسان کے ارادوں میں ہے وہ یہاں نہیں پائی جاتی ۔اس کے بعد کہتا ہے :(نیوٹن نے)جاذبۂ عمومی کے اصول کو دریافت کیا لیکن قوت جاذبہ خود وجود کو ایک مرکز پر لاکر بغیر کسی حرکت کے آگے بڑھاتی ہے نتیجۃً نیوٹن پر لازم ہو گیا کہ وہ اس قوت کے ساتھ ایک دوسری قوت ''قوت دافعہ'' کا اضافہ کرے ۔دیگر چند جملوں کے بعد اس طرح رقمطراز ہے :

''ڈوکارٹ'' کو چاہئے کہ وہ ہمیں جواب دے کہ وہ کونسی طبعی قوت ہے جس نے اس پُر ہیجان ہوا کو رواں دواں رکھا ہوا ہے جسکے بارے میں وہ کہتا ہے (کہ وہ اصل مادہ ہے)نیوٹن کو چاہئے کہ وہ ہمیں اس ہاتھ کے متعلق بتائے جو ستاروں کو اس طرح سنبھال رکھا ہے کہ وہ مدار کے گرد گھوم رہے ہیں ......

اس کے بعد پھر وہ کہتا ہے :وہ تمام حادثات جنہیں طبعی قوت رونما کرتی ہے وہ وجود پذیر ہو جاتے ہیں ۔ہم عمیق نظر سے بعض کی بعض پر تاثیر کی کیفیت کے بارے میں غور کریں تو انتقال (مادہ) کے سلسلے میں ہماری رائے بدل جائے گی کیونکہ سبب کو اولاً لازمی طور پر ارادہ سے بہرہ مند ہونا پڑے گا چند سطروں کے بعد اس طرح اظہار خیال کرتا ہے :اس بناء پر میرا خیال ہے کہ اس کا (خدا کا) ارادہ وجود کو حرکت میں لاتا ہے اور مردوں کو زندہ کرتا ہے ......

لیکن تم مجھ سے کہو گے کہ وہ (خدا) کہاں ہے ؟ تو جواب میں ہم کہیں گے موجود ہے ۔وہ آسمانوں میں موجود ہے جنھیں وہ متحرک رکھتا ہے ۔وہ ستاروں میں موجود ہے جہاں سے وہ ہم پر نور افشانی کرتا ہے ۔وہ نہ صرف مجھ میں ہے بلکہ اس بھیڑ میں بھی ہے جو چرتی ہے اور اس پرندہ میں بھی ہے جو اڑتا ہے اور اس پتھر میں بھی ہے جو زمین پر پڑا ہوا ہے اور اس درخت کے پتے میں بھی ہے جسے ہوا اس طرف اور اس طرف لیجاتی ہے وہ ہر جگہ ہے ......

اس بناء پر یہ تمام مفروضات کس قدر بعید از عقل ہیں جن کی بناء پر ہم سمجھتے ہیں کہ یہ نادر انتظام' متلاطم الاجزاء ایک اندھی حرکت کا نتیجہ ہے جو مادہ میں اتفاق سے پیدا ہو گیا ہے !اور یہی (عوامل) جس کام کو چاہتے ہیں کرتے لیکن یہ بات محال ہے کہ میں سب کچھ دیکھنے کے باوجود اور موجودات کے مستقل نظام جاریہ کو محسوس کرنے کے باوجود اس حکمت کو نہ سمجھوں جو اس نظام کو بخشی گئی ہے ۔

میں ایسا شخص نہیں ہوں جو اس بات کا قائل ہو جاؤں کہ بے جان مادۂ زندہ موجودات کو پیدا کر سکتا ہے ۔ایک اندھی ضروری' ایک عاقل کائنات کو وجود بخش سکتی ہے ۔وہ چیز جو خود عقل نہ رکھتی ہو وہ عاقل مخلوق پیدا کر سکتی ہے ۔

ژان ژاک روسو بالفاظ دیگر اسی طرح کہتا ہے :

''خدا شناسی کا راستہ عقل شکوک اور توہمات پر منحصر نہیں ہے بلکہ فطری شعور اس موضوع کو ثابت کرنے کا بہترین ذریعہ ہے ۔ان تمام باتوں کا بحیثیت مجموعی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نہ صرف یہ ژان ژوک روسو مادہ پرست نہ تھا بلکہ وہ مکتب ''منافزیک'' کا سخت حامی تھا ۔ژان ژاک روسو کو مادہ پرست ثابت کرنے کا منشاء غالباً ارباب کلیسا اور اولیاء مسیحیت سے اس کی وہی پرانی مخالفت تھی ۔

استاد معظم نے اس بارے میں اشارتاً کہا ہے :

مرحوم فروغی کتاب ''سیر حکمت دراروپا'' جلد دوم ص ۱۱۹ فصل ششم میں اس طرح لکھتے ہیں :

عقاید روسو کے متعلق خصوصاً جو کچھ کتاب ''امیل'' میں بیان کیا گیا تھا یقیناً ارباب سیاست اور اولیاء مسیحیت کے درمیان شور برپا ہو گیا ۔اس کتاب کو جلا دیا گیا اور لکھنے والے کو سزا دی گئی لیکن وہ اسی طرح روپوش رہ کر دربدر پھرتا رہا یہاں تک کہ سنہ ۱۷۷۸ء میں ۶۶ سال کی عمر میں عالم جاودانی کی جانب لوٹ گیا اور اس کی قیمتی زندگی اختتام کو پہنچی اور اس کی وفات کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس کے معتقدین کی تعداد بڑھ گئی اور اس نے اپنی زندگی میں جو تکالیف برداشت کی تھیں اس کی تلافی کے طور پر اس کی بہت زیادہ قدر کی گئی اور اسے عظمت دی گئی یہاں تک کہ اس کی لاش کو وہاں سے پانتھون کے قبرستان میں جو فرانس کے محترم ترین قبرستانوں میں سے ایک ہے منتقل کر دیا گیا ۔اگر چہ کہ ژان ژاک روسو کی تالیفات بہت ہیں لیکن ان میں سے مشہور ''قراردادہائے اجتماعی'' یا ''پیمان اجتماعی'' ہے اس کا ترجمہ فروردین سنہ ۱۳۲۵ ش میں مرحوم غلام حسین زیرک زادہ نے کیا جو تہران یونیورسٹی کے نامور پروفیسر تھے ۔اہل سیاست اور قانون کے طالب

پر حرکت کر رہے ہیں تا کہ اس مقررہ منزل پر پہنچیں جو قدرت نے ان کے لئے مقرر کر دی ہے اور اس کو مزید دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ عالم ہستی کے تمام موجودات اور تمام اجزاء میں ایک طرح کا رابطہ اور مکمل ہم آہنگی موجود ہے جس کو ہم پہلی نظر میں ہی محسوس کر لیتے ہیں۔

اس غرض سے کہ آپ پر یہ حقیقت پوری طرح آشکارا ہو جائے ہم آپ کی توجہ حسب ذیل نکات کی طرف مبذول کراتے ہیں:

۱۔ اس دنیا میں ہمیشہ خاص شرائط کے ماتحت قوانین (فطرت) کا سلسلہ جاری رہنا چاہئے تا کہ مخلوق پیدا ہوتی رہے اور زندگی بسر کرتی رہے اور اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک ان قوانین (فطرت) سے بہرہ مند ہوتی رہے۔ مثلاً: جو دانہ مٹی سے اپنا سر ابھارنا اور سرسبز درخت کی صورت میں ظاہر ہونا اور آخر کار پھل دینا چاہتا ہے تو اسے مناسب زمین، مناسب موسم اور مناسب حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تنفس، تغذیہ، تولید مثل اور تمام دوسری ضروری باتیں جو زندہ رہنے کے لئے ضروری ہیں ان ہی خاص شرائط اور مخصوص قوانین (فطرت) کے مطابق انجام پائیں اور پھر جڑ سے لے کر تنہ اور شاخوں تک تکوینی قوانین (فطرت) کی ایک سلسلے کے زیر نگرانی ہوتا کہ وہ اپنے مخصوص کمال کو

علموں کی نظر میں یہ کتاب "روح القوانین" منتسکیو (۱۶۸۹-۱۷۵۵) نامی کتاب کی ہم پلہ ہے۔ چونکہ اس کی تحریر کے اثرات کو انقلاب فرانس کے عظیم عوامل میں شمار کیا جاتا ہے اس لئے لوگ اسے انقلاب فرانس کا پیغمبر کہتے ہیں۔]

۱؎ [مادہ سے مراد ہر وہ چیز ہے جس میں زمان و مکان پایا جاتا ہے اور جو قابل تقسیم اور قابل تجزیہ ہو۔ مادہ کے بارے میں طبیعیات کے عالموں کے درمیان تاریخ کے وسیع دور میں جدید نظریات پیدا ہوتے رہے اور متاخرین کی علمی تحقیقات سے جن باتوں کا پتہ چلا ہے وہ یہ ہیں: اس سے مراد قوت اور مادہ کا مجموعہ تو وہ ہے۔

ڈاکٹر ارانی مادہ کی حقیقت کے بارے میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔ مادہ ہمیشہ متغیر رہتا ہے۔ اس تغییر کے پیدا کرنے والے عامل کو قوت کہتے ہیں۔ جو مشتری کوئی کام کر سکتی ہے کہتے ہیں کہ اس میں قوت (انرجی) ہے۔ حالانکہ مختلف قسم کی قوتیں "مکانیک کا کام" حرارت، نور، الکٹریسٹی، کیمیائی قوت، سب آپس میں مختلف ہیں لیکن ان کی بنیاد ایک ہے کہ اسی قوت کا وجود مادہ کی اکائیوں میں ہے۔]

پہنچے۔ یہ بات واضح ہے کہ ان شرائط سے ذرا سی بھی روگردانی انہیں تباہی کی طرف دھکیل دے گی۔

اس بات سے ہم پر پوری طرح واضح ہو گیا کہ ہر مخلوق بلا شرط وجود میں نہیں آ سکتی۔

۲۔ موجودات میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی ایسی خصوصیت اور اثر ضرور موجود ہوتا ہے کہ اس کے ہونے سے اس کا وجود باقی رہتا ہے اور نہ ہونے سے وہ معدوم ہو جاتا ہے مثلاً: آگ کی تاثیر اور خاصیت جلانا اور زہریلے اثرات کو ختم کرنا ہے۔ آگ کا جلانا اور زہریلے اثرات کو ختم کرنا اس کی سرشت کا اقتضاء ہے لیکن قوانین فطرت سے بالا کوئی قوت ان کو ان کے عام راستے سے ہٹا دیتی ہے اس خاصیت اور اس اثر کا وقوع پذیر ہونا بھی اس عالم کائنات کے مظاہر نظم میں سے ایک ہے۔

۳۔ ہر موجود ایک معین راستہ پر اور ایک خاص منزل کی طرف متحرک ہے اس کے تمام اجزاء و اعضاء وجودی اس کے اس کام میں پوری طرح اس کے ساتھ اتحاد عمل کرتے ہیں اور اس کے ہم آہنگ ہوتے ہیں مثلاً: اس عالم کے موجودات میں سے ایک انسان کا جسم ہے اس بدن کے تمام اعضاء، زندگی اور حیات کو باقی رکھنے کے سلسلے میں ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ اس طرح کہ اگر ہاتھ میں ذرا سی خراش بھی آ جاتی ہے تو خون کے سفید جسیمے جو دراصل بدن کے سپاہی سمجھے جاتے ہیں ہجوم کر کے اور حیرت انگیز اتحاد عمل سے اس زخم کو مندمل کر دیتے ہیں۔ ہاضمہ کی مشنری کا کام غذا کے ہضم کرنے کے سلسلے میں معدہ کے افعال، معدہ کے ستر لاکھ غدودوں سے نکلا ہوا لعاب، ہضم کو آسان بنانے کے لئے، فم معدہ کا دست بستہ ہو جانا، جسم کے تمام خلیات میں قلب کے توسط سے خون کی تقسیم اور صفائی وغیرہ کرنا ایک مشترک اور اعلیٰ مقصد کے لئے بدن کے اعضاء کی ہم آہنگی کا ایک نمونہ ہے۔

۴۔ ایک موجود کی خصوصی ہم آہنگی سے قطع نظر تمام موجودات عالم میں ایک ہم آہنگی اور ایک عام اتحاد پایا جاتا ہے گویا وہ تمام ایک دوسرے سے مل کر ایک معین اور مقرر راستہ پر گامزن ہیں اور حقیقتاً ہر

۱؎ [حادثہ سے مراد یہ نہیں ہے کہ وجود کی تخلیق میں کسی علت کو دخل نہیں ہے بلکہ مادہ پرست کہتے ہیں: دنیا غیر عاقل اور بے شعور علتوں کے ایک تسلسل کی وجہ سے وجود میں آئی ہے۔]

ایک کے کام میں دوسرے کی فعالیت کا دخل ہے۔ مثلاً: گھاس کی افزائش و نمو کے لئے پانی' ہوا' چاند' سورج اور آسمان کی ضرورت ہے۔ سورج چمکتا ہے' سمندر کا پانی بخارات میں تبدیل ہوتا ہے۔ ہوا' انہیں (اڑا کر) اِدھر اُدھر لے جاتی ہے۔ بارش اور برف بہت دلکش اور مسرت انگیز طریقہ پر اوپر سے نیچے آتے ہیں اور گھاس وغیرہ کو تازگی اور فرحت بخشتے ہیں اور دوسری جانب زمین حسب ضرورت' ان کے لئے غذا فراہم کرتی ہے اور اس کے نتیجے میں گھاس پیدا ہو کر کچھ دن زندہ رہتی ہے۔ اس اتحاد عمل کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ مختلف سیاروں میں نظام شمسی پایا جاتا ہے اور ہر سیارہ کا دوسرے سیاروں سے ہم آہنگی کا انحصار ایک مقررہ اصول کے مطابق ہوتا ہے۔

دوسرا ستون

اس قدر منظم اور مرتب کارخانہ ہستی کا وجود اتفاق اور حادثہ کی پیداوار نہیں ہو سکتا یعنی وہ ایک بے شعور اور بے عقل علتوں کے سلسلہ کی وجہ سے وجود میں نہیں آ سکتا۔ ان باتوں سے (کہ دنیا منظم ہے اور اس کا انتظام بغیر عاقل اور دانا فاعل کے ممکن نہیں) ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس جہاں کا کوئی خالق ہے جو دانا اور مقتدر ہے جس نے اس عظیم کارخانے کو ایک خاص پلان اور خاص نقشہ کے مطابق بنایا ہے اور اس کو چلا رہا ہے۔ اب جبکہ اس استدلال کی بنیاد پر اجمالی روشنی پڑ چکی ہم ان دو مقدمات میں سے ہر ایک پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے اور چونکہ دوسرے مقدمہ کی باتیں پہلے مقدمہ سے زیادہ آسان ہیں اور ایک لحاظ سے مطالعہ کے سلسلے میں بھی وہ پہلے مقدمہ سے مقدم ہے لہٰذا اس لئے اولاً دوسرے مقدمہ کو ثابت کریں گے اس کے بعد ہم پہلے مقدمہ کے بارے میں بحث کریں گے۔

تنظم کس لئے عقل و فکر کی ترجمان ہے؟

اس حقیقت کو معلوم کرنے کے لئے تنظیم ہمیشہ کسی عاقل اور مفکر خالق کی نشاندہی کرتی ہے ہمارے سامنے دو راستے ہیں ہم دونوں میں سے اپنے کسی ایک پسندیدہ طریقہ سے مقصد تک پہنچ سکتے ہیں لیکن بہتر ہے کہ ہم دونوں کو یہاں جمع کر دیں۔

پہلا راستہ

ہم سب جانتے ہیں کہ ایک عمدہ عمارت یا ایک معمولی مکان کی تعمیر کے لئے ہر قسم کا مصالحہ استعمال نہیں کیا جا سکتا مثلاً: گچ' کاغذ' لکڑی' لوہا' سیمنٹ اور اس جیسی چیزیں درکار ہیں اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ مصالح خاص مقدار میں درکار ہیں اور سب مصالحوں کی ایک ہی مقدار بھی کافی نہیں ہے بلکہ ہر چیز کی مقدار اس کی معین نسبت سے درکار ہے یہ بات بھی مسلم ہے کہ مذکورہ مصالح مقررہ معیار کے مطابق ہوں تاکہ مفید ثابت ہو سکیں مثلاً: اگر لوہا طور برادہ کے اور لکڑی بہت ہی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں لی جائے خواہ ان کی تعداد کتنی ہی ہو اس عمارت کی تعمیر میں ذرہ برابر بھی مفید نہ ہوں گے۔

اس بات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر عمارت کے لئے مخصوص سامان خاص مقدار میں اور خاص معیار کے مطابق لازمی ہے۔ اس لئے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے ہمیں چاہئے کہ دنیا کے مختلف مصالحوں اور ساز و سامان میں سے اپنے مطلب کا مصالحہ اور سامان منتخب کر کے اسے علیحدہ کر لیں اور اس کے علاوہ اس کی مقدار اور تعداد کو بھی پیش نظر رکھیں تاکہ اس میں کمی زیادتی نہ ہونے پائے علاوہ ازیں مصالحے کی کیفیت اور خاصیت کا بھی خیال رکھیں ورنہ ہم اپنے مقصد میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہم ابھی جن تین مرحلوں سے گزرے ہیں اس میں سے ان مختلف مصالحوں کے طریقہ آمیزش کے بارے میں گفتگو کی جاتی ہے کہ کس طرح ان کو مناسب طریقے سے ملانا چاہئے تاکہ مطلوبہ عمارت تعمیر ہو سکے۔

یہ بات عیاں ہے کہ ان چار مرحلوں یعنی مصالحوں کی نوعیت کا انتخاب' ضروری مقدار' ضروری کیفیت' ان مصالحوں کی آپس میں ملاوٹ' کے لئے ایک عاقل اور دانا عامل کی ضرورت ہے جو اسے بنائے۔ اس کے بغیر ان مرحلوں میں سے کوئی مرحلہ بھی قابل عمل نہیں ہو سکتا۔

اندھے اور بہرے اتفاقات' مناسب مصالحوں اور ان کی مناسب مقدار و کیفیت کا انتخاب کر کے خاص ترکیب سے ان کی آمیزش نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم کسی عمارت کو دیکھتے ہیں تو اس عاقل اور دانا کی طرف ہمارا خیال جاتا ہے جس نے اس عمارت کی تعمیر کی ہے لے

دوسرا راستہ حساب احتمالات کا۔ لے

ایک علمی کتاب ہے اس کا مضمون مسلسل صفحات پر تحریر ہے اس میں سو ورق ہیں۔ اس کے اوراق

کو منتشر کردو اور پھر ان کو اس طرح ملا دو کہ مضمون کی ترتیب اور اوراق کا سلسلہ بالکل درہم برہم ہوجائے۔ اب اس کتاب کو ایک ناخواندہ یا نابینا شخص کے ہاتھ میں دیدو اور اس سے کہو کہ وہ اس کتاب کو ترتیب دیدے۔ ان میں خواہ ناخواندہ ہو یا نابینا پہلے ورق کا نمبر پڑھ سکتا' وہ پہلا ورق حاصل کرنے کے لئے ان منتشر اوراق میں سے ایک ورق اٹھالیگا اس امید پر کہ وہی اس کا پہلا ورق ہوگا۔ یہ بات تو بالکل عیاں ہے کہ اس کے اپنے مقصد میں کامیابی کا ایک فیصد امکان ہوسکتا ہے۔ یہ ورق جس نمبر کا بھی ہے وہ اسے علیحدہ کرکے رکھ دیتا ہے اب وہ ایک دوسرے ورق کو ورق نمبر ۲ سمجھ کر اٹھاتا ہے۔ اب اس کی کامیابی کا امکان ۱/۹۹ ہوگا اس لحاظ سے اسے ورق نمبر ۱ و ۲ کو باترتیب رکھنے میں کامیابی کا امکان ۱/۱۰۰۰۰ ہے یعنی ۱/۱۰۰ × ۱/۱۰۰ = ۱/۱۰۰۰۰ یا ان دس ہزار امکانات میں سے ایک اس کے صحیح ہونے کا ہے اور وہ بھی اس صورت میں جبکہ اس نے پہلے مرحلہ میں پہلا اور دوسرے مرحلہ میں دوسرا ورق اٹھایا ہو اور اسی طرح تیسرے ورق کو ورق نمبر ۳ سمجھ کر اٹھائے تو اس کی کامیابی کا امکان ۹۸ میں سے ۱ ہے یعنی ورق ۱' ۲' ۳ کے مسلسل و مرتب رکھنے کے بارے میں دس لاکھ میں سے ایک امکان ہے۔ (۱/۱۰۰ × ۱/۱۰۰ × ۱/۱۰۰ = ۱/۱۰۰۰۰۰۰) پس اس نابینا یا ناخواندہ شخص کے اس کتاب کو جوڑنے اور ترتیب سے قائم کرنے میں بے انتہا اعداد میں سے ایک امکان ہے یعنی ایک ایسے عدد میں جس کے سیدھی جانب ۲۰۰ صفر ہوں اس کی کامیابی کا ایک امکان ہوسکتا ہے۔

اگر لوگوں کو دوسرے سیاروں میں بھیج دیا جائے

اس لحاظ سے کہ ہم اوپر والے عدد کو دریافت کرسکیں ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ موجودہ تمام انسان جو کرۂ زمین پر زندگی بسر کررہے ہیں اور جن کی تعداد تقریباً تین ارب ہے ان میں سے ہر ایک کو ایک ایک آسمانی سیارہ میں لے جاکر وہاں بسا دیا جائے۔ پھر ہم فرض کرتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک افزائش نسل کرکے دنیا کی موجودہ تعداد کے مطابق اپنی نسل پیدا کرتا ہے (یعنی ہر ایک کی تعداد بڑھ کر تین ارب ہوجائے گی) اس طرح تمام افراد کی مجموعی تعداد جو ان سیاروں میں زندگی بسر کررہے ہونگے ایک ۹ کے عدد کے سامنے ۱۸ صفر لگادیئے جائیں تب معلوم ہوگی۔ چونکہ فرض کرنے کا کام ہم نے اپنے ذمہ لیا ہے

اس لئے اب پھر فرض کرو کہ ان تمام افراد میں سے ایک ایک فرد کو ایک مستقل کرہ میں روانہ کردیا جائے اور وہاں وہ تمام لوگ پہلے کی طرح افزائش نسل کریں تو ان کی تعداد ۸۱ کے ہندسے کے سامنے ۳۶ صفر لگانے سے معلوم ہوگی۔ اب ہم فرض کرتے ہیں کہ ہم میں خیر اندیشی پیدا ہوئی اور اب خواہش پیدا ہوئی کہ اپنے مال میں سے تمام یا اس میں سے کچھ حصہ قرعہ اندازی کے ذریعہ سے ان تمام افراد میں سے ایک فرد کو دیدیں۔ میں اور آپ سب ہی ان لوگوں میں شامل ہیں۔ اب آپ سوچئے کہ ان تمام افراد میں سے جن کی تعداد کا اندازہ لگانے سے عقل عاجز ہے آپ کے نام یا میرے نام قرعہ نکلنے کی کتنی امید کی جاسکتی ہے۔

اس بے انتہا تعداد میں سے ایک امکان ہے جو صفر کے مساوی ہے (۱/۱۰۰۰۰) لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کہ عدد مذکور جس پر ۳۴ صفر تھے اس عدد کا کس طرح حساب ہوگا جس کے پہلے ۱۰۰ یا ۲۰۰ صفر لگے ہوں۔ واقعی یہ عدد بھی عجیب اور دیوانہ بنادینے والا ہے اور اس عدد کے مقابل میں ایک امکان اس قدر کم اور ضعیف ہے کہ عملی طور پر اس میں اور صفر میں کوئی فرق نہیں ہے یعنی اس ان پڑھ یا نابینا شخص کے اس کتاب کو ترتیب دینے کے سلسلے میں محض اتفاق کی بناء پر کامیاب ہونے کا امکان صفر کے برابر ہے یا بالفاظ دیگر ایسا ہونا محال ہے۔

دوسری مثال

فرض کریں کہ ایک فصیح شعر ایک کاغذ پر لکھا ہوا ہے اس شعر میں ایک اخلاقی بات بتائی گئی ہے اور یہ شعر نہایت موزوں' خوش قافیہ ہے اور ایک بہترین دیوان میں موجود ہے اور معنوی لحاظ سے بھی وہ شعر اعلیٰ پیمانے کا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہزار سال پرانا ہے۔ کیا کوئی شخص یہ گمان کرسکتا ہے کہ یہ شعر کسی چھوٹے سے بچے کے کھیل میں پنسل گھمانے کے نتیجے میں پیدا ہوگیا۔ اور یہ شعر اتفاق سے معرض وجود میں آگیا ہے؟

یا یہ فرض کریں کہ ایک بہت عمدہ منقش تختی کسی کھدائی میں ملی ہو اور ماہرین آثار قدیمہ نے اسے دو ہزار سال پرانی قرار دیا ہو کیا یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ یہ تختی کسی ایسے شخص کے ہاتھ کی بے ترتیب حرکت

سے وجود میں آ گئی جس شخص کو نقاشی کے اصول کی کوئی خبر ہی نہ ہو؟ ظاہر ہے کہ آدمی ان آثار کو دیکھ کر اندازہ لگاتا ہے کہ شعر واخلاق سے واقف کسی زبردست شاعر نے یہ شعر کہا ہوگا یا کسی ہنرمند نقاش نے اس تختی پر نقاشی کی ہوگی۔

انسانی بدن کو پیش نظر رکھیئے

فرض کریں اس بدن کے سو اجزاء ہیں جس کی تشکیل سو طریقوں سے ہوتی ہے۔ ان اجزاء میں سے ہر جزو ایک خاص ترتیب سے منظم کیا گیا ہے اور ہر ایک منظم طریقے سے اپنا کام انجام دے رہا ہے۔ اب کیا بدن کا ان تمام کیفیتوں کے ساتھ اتفاق اور حادثہ کے ذریعہ پیدا ہو جانے کا امکان حساب احتمالات کی رو سے صفر کے برابر نہیں ہے؟ اور کیا اس منظم وجود کو بلکہ اور دوسرے سینکڑوں بلکہ ہزاروں موجودات کو جو اس عالم کائنات میں نظر آرہے ہیں ارادہ اور عقل سے محروم علتوں کی پیداوار کہہ سکتے ہیں؟ بنیادی طور پر دنیا کے وجود کا ایک ایسے وجود کے ذریعہ جو مبداء عقل ہے ظہور پذیر ہونا مسلمات میں سے شمار کیا جاتا ہے۔

یہاں تک کہ مشہور مصری سائنسدان محمد فرید وجدی اس کو "نظریات" میں سے سمجھتا ہے۔ ان مندرجہ بالا بحثوں سے چار نتیجے نکالے جاسکتے ہیں کہ (یہ بحثیں) مادہ پرستوں کے ان چار اصولوں کو جو اعتقادات کی بنیاد ہیں متزلزل کر دیتی ہیں اور ان سے مراد:

۱۔ اس عالم کائنات سے ماوراء ایک مقتدر اور دانا قوت ہے جس نے اس کارخانہ ہستی کی تخلیق کی اور جو اسے چلا رہی ہے۔

۲۔ تمام حوادث اور موجودات کو طبیعی اسباب کی بناء پر نہیں بدلا جاسکتا۔

۳۔ دنیا کی اس عمارت کا صحیح نقشہ تیار کیا گیا اور اسی بناء پر اس کی بنیاد بامقصد ہے۔

۴۔ یہ حیرت انگیز کارخانہ ان تمام باریک نقش و نگار کے ساتھ حادثہ کی بناء پر وجود میں نہیں آیا ہے اور اتفاق کی بناء پر اس کے وجود میں آنے کا امکان صفر کے برابر ہے۔

---

[1] [یہ بات منطق کے معمول کے برخلاف ہے کیونکہ اس کے مطابق "صغری" کبری سے پہلے آتا ہے۔]

تمام عالم کائنات کا انتظام

عالم بالا میں

بے انتہا چھوٹی دنیا میں

وجود کے اندر

عالم بالا میں تنظیم

اس عالم طبیعی کے انتظام کی چگونگی کا پتہ چلانے کے لئے اور اس کا تعلق مبداء سے قائم کرنے کے لئے جس کی تشریح "علم و ارادہ کے ماتحت تنظیم" کے سلسلہ میں کر دی گئی ہے اب صرف ایک راستہ جو نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ جہاں کے مختلف موجودات کے بارے میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ بات بالکل عیاں ہے کہ اس مقصد کے لئے بغیر کسی تحقیق کے عالم کائنات کا سرسری مطالعہ کافی نہیں ہے بلکہ اس عالم کائنات کے ہر گوشہ کو جاننے کے لئے تجربہ گاہوں اور سائنسی آلات کی ضرورت ہے نیز غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ اس کے لئے طویل عمر بھی صرف کرنی پڑے گی اس لئے ہم صرف اپنے حواس خمسہ کے ذریعہ اس عالم کی ظاہری چیزوں کا مطالعہ کرنے پر اکتفا نہیں کر سکتے اور ہم اپنی محدود حواس اور محدود عقل سے تنظیم عالم کا اور اسرار خلقت کا پتہ نہیں چلا سکتے۔

لیکن خوش قسمتی سے ہم سے پہلے دانشوروں نے اپنی عمر کو اس راہ میں صرف کر کے اس راستے کو پہلے ہی ہموار اور مسطح بنا دیا ہے جس پر چل کر ہم اسے عبور کرنا اور منزل مقصود تک پہنچنا چاہ رہے ہیں۔ کروڑوں سائنس دانوں نے ہزاروں سال علمی تحقیق میں گزارے ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے اس جہان مشغول کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر مطالعہ اور غور میں وقت صرف کیا ہے اور اپنی فکری کارگزاریوں اور اپنے سائنسی نتائج کو معاشرۂ بشری کے حوالے کر دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں موجودات عالم کے کچھ اسرار

---

[1] [یہ بیان بالکل اچھوتا ہے اور کسی مذہبی عالم کی تقریر سے یہ بات ماخوذ نہیں ہے۔] [2] [یہ حساب جسے حساب احتمالات کہتے ہیں سنہ ۱۶۵۴ء میں فرانس کے مشہور سائنس دان بلز پاسکال کے توسط سے وجود میں آیا اور آج سائنس کے مختلف شعبوں میں خصوصاً "علم طبیعیات" میں اس سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔]

انسانوں پر آشکارا ہو گئے ہیں۔

یہ بات مسلمہ ہے کہ ان تمام سائنسدانوں کا مقصد ان تمام رنجوں اور تکلیفوں کے برداشت کرنے سے وہ نہیں تھا جو ہمارا مقصد ہے وہ موجودات عالم کا توحید اور خدا پرستی کے نقطہ نظر سے مطالعہ نہیں کرتے تھے بلکہ ہم روشن پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوتے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس تمام تفکر اور کوشش سے جو موجودہ سائنس کے بارے میں کرتے رہے ہیں ان کا مقصد صرف سائنس کا ارتقاء تھا اور بس لیکن ہر حال میں ہم خدا پرستی کے ذرہ بین آلہ سے ان کے سائنسی حاصل شدہ چیزوں کا مطالعہ اور تحقیق اسی بنیاد پر کریں گے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ انتہائی نادانی ہوگی اگر ہم سائنسی میراث سے اور ان حیرت انگیز انکشافات اور باریک باتوں سے جو ان علوم طبیعی کے ماہروں کے توسط سے اس قدر آسانی سے ہمارے قبضہ میں آ گئی ہیں توحیدی نتیجے حاصل نہ کریں اور ان سے فائدہ نہ اٹھائیں۔

تنظیم عالم کے بارے میں کیوں سوچنا چاہئے؟؟

ہم اس سوال کا دو حصوں میں خلاصہ کر سکتے ہیں:

۱۔ یہ بات ظاہر ہے کہ انسان کی معلومات جس قدر زیادہ ہوں گی اس کی معرفت خدائے تعالٰی کے ساتھ اسی قدر زیادہ ہوگی اور وہ جس قدر اس عالم کائنات کے اسرار و رموز سے واقف ہوگا اس کا ایمان خالق کائنات کے ساتھ اتنا ہی زیادہ راسخ اور زیادہ مستحکم ہوگا اور اسی لئے اس سوال کے کرنے کا یہ بہترین موقع ہے کہ کیا یہ صحیح ہے کہ سابق ماہرین فلکیات جو دنیا کو بہت مختصر و محدود کر کے اور فلک الافلاک کے ایک کرہ میں اسے جگہ دے کر سطح زمین سے اس کی نچلی سطح تک کا فاصلہ ریاضی کے حسابات سے متعین کر چکے تھے۔ ان کی معلومات اس جہان کے مبدء کے بارے میں زیادہ تھیں یا آج کا سائنسدان جو طاقتور دوربینوں اور بڑے بڑے ٹیلسکوپ کے ذریعہ جہان کا مطالعہ کر رہا ہے اس کی معلومات زیادہ ہیں۔ کیا دوسری صدری میلادی کا سائنسدان بطلیموس جس کا خیال تھا کہ ستارے آسمان پر کیل کی طرح گڑے ہوئے ہیں اس نے خدائے تعالٰی کی عظمت کو زیادہ پہچانا ہے یا آخری دور کے ماہر فلکیات نیوٹن ۱ نے جو کہتا ہے: ستاروں کے مدار اور ان کے فاصلے مقرر ہیں اگر

ان میں کا کوئی ستارہ اپنے مدار سے ہٹ جائے تو دنیا درہم برہم ہو جائے گی۔

یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ جو شخص دنیا کو دنیائے عظیم اور اسی طرح منظم اور مرتب جانتا ہو اس کا ایمان اس شخص کے ایمان کے مقابلہ میں بڑھ کر ہے جو دنیا کو ایک مختصر قالب میں ڈھالے اور اسی نظر سے اس کی تنظیم و ترتیب کو دیکھے۔ اس بناء پر نظم جہاں میں غور و فکر کرنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ ہماری فکر کے مطابق قدرت و عظمت کا ہم پر انکشاف ہوگا اور اسی لحاظ سے ہمارا ایمان پختہ اور قوی ہوگا۔

۲۔ نظم عالم کا مطالعہ کرنے سے انسان میں شکر گزاری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ انسان ایک وسیع اور منظم دنیا کے مقابلہ میں اپنے آپ کو ایک چھوٹی اور منظم دنیا سمجھتا ہے اگر وہ یہ جان لے کہ دل یا اس کے تمام اعضاء کس طرف جا رہے ہیں اور کس طرح منظم طور پر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں اور پھر وہ یہ سمجھ لے کہ تمام موجودات عالم اس کی طرح منظم اور پابند ہیں اور وہ سب اس کی زندگی کی بقاء و دوام کے لئے کام کر رہے ہیں اور اگر بفرض محال دنیا کا کوئی گوشہ اپنے پروگرام اور اپنے مقررہ راستے سے ہٹ جائے تو اس (انسان) کے لئے زندہ رہنا محال ہو جائے گا۔ فطری طور پر اس کا جذبہ شکر گزاری اس خالق بزرگ و برتر کے بارے میں جس نے اس عظیم جہان کو پیدا کیا بڑھ جائے گا اور اس کا دل خدائے تعالٰی کی محبت و عشق کے ساتھ اس کے سامنے جھک جائے گا۔ لیکن وہ شخص جو اس دنیا کو سطحی نظر سے دیکھتا ہے اس کا عاجزی اور اس کی شکر گزاری بھی خدائے تعالٰی کے ساتھ سطحی ہوگی۔

اب ہم دنیا کے منظم اور حیران کن صفحات میں سے چند کی ورق گردانی کریں گے۔

پہلے ہم تمام دنیا پر پرواز کریں گے لیکن یہ خیال رہے کہ ہماری اس پرواز کا مقصد پرانی خشک مٹھی بھر اطلاعات کا حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ ہمارا مقصد اس ازلی اور ابدی حقیقتوں کے آثار کو دریافت کرنا ہے۔

اب اس نیلگوں آسمان کی طرف بغور دیکھیں

سورج چمکتا ہے۔ چاند روشنی دیتا ہے۔ ستارے خاص دلکش انداز میں جھلملا رہے ہیں۔ سورج کا

طلوع وغروب' منظم طور پر رات دن کی آمدورفت' چار فصلوں کا وجود میں آنا۔ کسوف وخسوف کا ہونا اور آخر میں تاریخ راتوں میں ستاروں کا خوبصورتی اور دلاویزی کے ساتھ چمکنا۔ یہ تمام باتیں پہلے دن سے ہی فکر بشری کو عالم بالا کے متعلق سوچنے کی دعوت دے رہی ہیں اور یہ موضوع سب سے پہلا موضوع ہے جو فکر انسانی کا ہدف بنا۔

پس یہ خوبصورت اور نیلگوں آسمان جسے تم دیکھ رہے ہو یہ وہی آسمان ہے کہ انسانی فکر نے اس کے بارے میں غور کرنے سے کبھی پہلو تہی نہ کی اور ہمیشہ سے عالم کے اسرار سمجھنا اور اس کے نقشہ اور وضع کی کھوج لگانے میں منہمک رہی لیکن ہمیشہ سے اس کی عظمت انسان کی نظر میں اس کی فکروسوچ کے مطابق جلوہ گر ہوتی ہے۔

قدیم ماہرین فلکیات اپنی معلومات اور اپنی فکری رسائی کے مطابق آسمان کی کیفیت اور اس کے بارے میں اپنے نظریات کی تشریح کرتے تھے۔ مدت ہوئی کہ ماہرین فلکیات اور ماہرین علوم نجوم میدان میں آگئے ہیں اور ہر ایک نے اپنے گہرے مطالعہ کے ذریعے رازوں پر سے پردے اٹھائے ہیں اور کئی گتھیوں کو سلجھایا ہے اور جہل کے پردوں کو اٹھا کر آسمان کی تازہ خبریں بنی نوع انسان کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کی ہیں اور نئے آلات ووسائل دریافت کر کے ان کی مدد سے آسمان کا مطالعہ کیا اور علم ہیئت کو موجودہ باعزت مقام تک پہنچا دیا ہے۔

سولھویں صدی عیسوی تک انسان اپنی کمزور اور ناتوان آنکھ کی قوت سے ہی آسمان کی وضع قطع کو دیکھتا تھا لیکن یہ طریقہ اطالوی منجم گیلیلی

کے ظہور کے بعد باقی نہ رہا کیونکہ پہلا شخص جس نے آلات کی مدد سے آسمان کی طرف بغور دیکھا وہی (گیلیلو) تھا۔ گیلیلو کے بعد بڑے بڑے ٹیلسکوپ اور طاقتور دوربینیں ایجاد ہو گئیں۔

اور عقل ومعرفت کے نتیجے میں انسان عالم ہائے آسمانی میں تیزی سے پہنچ گیا اور اس میں اس نے کمال حاصل کیا۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ ریاضی کے حسابات نے اسرار عالم کو حل کرنے میں بہت مدد کی کہا جا سکتا ہے کہ فلک بینی کے آلات اور ریاضی کے حسابات دو ایسے عامل ہیں جن سے

ستاروں کا علم حاصل کرنے اور فضا کی کیفیت معلوم میں مدد لی۔

اب پھر اس نیلگوں آسمان کی طرف نظر کیجئے

تاکہ ہم آپ کے لئے اس کی عظمت بیان کریں پھر آپ تصدیق کریں گے کہ اگر ریاضی کے فارمولے اور حسابات اور اعداد نہ ہوتے تو ان کا تصور ہماری محدود سوچ کے لئے کس قدر مشکل ہوتا؟ واقعی حیرت ہوتی ہے جب ہم اپنے کو اس عجیب عظمت کے روبرو دیکھتے ہیں۔ ہم فرانس کے سترہویں صدی عیسوی کے مشہور سائنسدان پاسکال

کی بات کو خوب اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اس نے بار بار کہا ہے: بشر طبیعی حیثیت کے لحاظ سے کیا ہے؟ ایک لامحدود کے مقابلہ میں عدم! ......اور عدم کے مقابلہ میں لامحدود! یہ عدم اور وجود کے درمیان ایک مرکزی نقطہ ہے۔

یہ ۴۰۰ سال پہلے کی بات ہے لیکن اب دنیا نے بہت زیادہ عظمت حاصل کر لی ہے یعنی اس کی عظمت بہت زیادہ آشکار ہو چکی ہے اب اس کی عظمت کے کیا کہنے؟

سیارات اور ثوابت

آسمان کے ستاروں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے وہ ستارے جن کی وضع اور جن کی حرکتیں مختلف ہیں اور ان کو سیارے کہتے ہیں ان میں سے صرف پانچ ستاروں کو آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے لیکن جو اپنی حالت پر قائم ہیں اور ان کی حرکت یکساں ہے ان کا نام "ثوابت" ہے۔ اس قسم کے ستاروں کی حالت کو ایسی قندیلوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو ایک بڑے محراب میں نصب کر دی گئی ہوں اور کوئی شخص اس محراب کو حرکت دے رہا ہو۔ ستاروں کے ان دو گروہوں سے کامل واقفیت حاصل کرنے کیلئے مسلسل چند راتوں میں حوصلہ اور باریک بینی سے آسمان کو دیکھتے رہئے۔ ہر سیارہ جو آپ کے سامنے جھلملاتا ہے اور لگاتار اس کی روشنی میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اس کا تعلق ثوابت سے ہے اور جو ستارہ ایک حالت میں ہے اور آپ کو گھور رہا ہے وہ سیارات میں سے ہے۔ اس کا سبب ثوابت کی دوری اور سیاروں کی قربت ہے۔

اس سائنسدان نے عالم بالا کی وضاحت کی خاطر "نظریہ افلاک نہ گانہ[۱]" (نو آسمانوں کا نظریہ) پیش کیا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ دنیا کا مرکز زمین ہے اور ہر ایک ستارہ ایک فلک شفاف کے درمیان قائم ہے اور اسکے ساتھ ساتھ زمین کے اطراف گردش کرتا ہے اور یہ نو آسمان اس ترتیب سے زمین کے اطراف قائم ہیں:

۱۔ فلک ماہ ۲۔ فلک عطارد ۳۔ فلک زہرہ ۴۔ فلک خورشید

۵۔ فلک مریخ ۶۔ فلک مشتری ۷۔ فلک زحل ۸۔ فلک ثوابت[۱]

۹۔ فلک الافلاک (اطلس)[۲]

بطلیموس کا خیال تھا کہ افلاک میں سے ہر ایک فلک کی' ایک خاص حرکت مقرر ہے اور ہر ایک (فلک) کئی سال کے بعد کرۂ زمین کے اطراف اپنا ایک چکر مکمل کر لیتا ہے اور فلک نہم (فلک اطلس) اپنی تیز اور رات دن کی گردش سے باقی ان تمام آسمانوں کو اپنے ساتھ گردش میں رکھتا ہے اور تمام افلاک' فلک اطلس کی اتباع میں ۲۴ گھنٹے کے اندر کرۂ زمین کے اطراف ایک چکر پورا کر لیتے ہیں۔ دنیا اس ہیئت داں کی نظر میں فلک الافلاک یعنی فلک نہم تک محدود تھی اور اس سے آگے وہ کسی موجود کا قائل نہ تھا۔ یہ نظریہ پندرھویں صدی عیسوی تک یعنی ۱۴۰۰ سال کی مدت تک آسمانوں کے بارے میں سائنس کے اعلیٰ ترین نظریہ کی حیثیت سے مقبول رہا لیکن آج سے تقریباً پانچ سو سال پہلے پندرھویں صدی عیسوی میں "کوپر نیک لہستانی[۲]" کے نظریہ کے ظہور سے اس نظریہ کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں اور بطلیموس کا نظریہ لوگوں کے ذہنوں پر ۱۴۰۰ سال حکومت کرتا رہا بعد ازاں ایک لخت اسکے رو ہام وخرافات کا بھرم جاتا رہا۔ کوپر نیک کے نظریات نے زمین کے تیرہ سو سالہ مرکزیت کے نظریہ کی تکذیب کی اور اسے (زمین کو) اس عالی منصب سے معزول کر دیا اور اس کی جگہ سورج کے آتشیں اور چمکتے ہوئے سیارہ نے لے لی (سیارات کی نسبت سے)۔ اس کے بعد زمین کو سورج کے اطراف گھومنے والا ایک سیارہ قرار دیا۔

کوپر نیک نے افلاک نہ گانہ کے نظریہ کو تہ کر کے رکھ دیا۔ اور ستاروں کو فضا میں معلق اجسام قرار دیا

لیکن اس کے پاس اپنے ادعا کی تائید میں واضح ثبوت موجود نہ تھا حتیٰ کہ جرمن ریاضی دان اور منجم "کیپلر[۱]" اور ایتالوی منجم "گیلیلو" نے اپنی بنائی ہوئی چھوٹی دوربین کے ذریعہ سے کوپرنیک کے نظریات کی تائید کی اور اس کے بعد "راویلہ" نامی ایک شخص نے گالیلیو کی دوربین کی مدد سے اس کے خیالات کی تائید کی اور آخر کار قدیم ہیئت کے کھنڈرات کے اوپر ہیئت جدید کی اس طرح بنیاد رکھی گئی کہ "عالم (نظام شمسی) کا مرکز آفتاب اور چھ گردش کرنیوالے ستارے:

عطارد[۱]' زہرہ[۲]' زمین[۳]' مریخ[۴]' مشتری[۵]' زحل[۶] ہیں جو اس کے اطراف گھومتے ہیں اور بعض ستارے ان سیاروں کے اطراف گردش کرتے ہیں اور ان کو قمار (جمع قمر) کہتے ہیں مثلاً چاند کا سیارہ' زمین کے سیارہ کے اطراف گھومتا ہے اور یہ زمین کے چاندوں میں سے ایک (چاند) ہے لیکن ثوابت ستارے ہر ایک بذات خود ایک دنیا ہے اور اس لامحدود فضا میں ہم سے بہت دور وہ گردش کر رہے ہیں "۔

اس آخری دور کے فلک شناس سائنسدانوں کی تحقیقات کے وسیلہ سے یہ نظریات پوری طرح ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔

سنہ ۱۷۸۱ء میں تقریباً ۱۸۲ سال پہلے انگریز "ولیم ھرشل[۱]" کے ذریعہ ایک دوسرے سیارہ کا پتہ لگا ہے جس کا نام "اورانوس[۲]" ہے اس طرح نظام شمسی میں ایک سیارہ کا اضافہ ہو گیا۔ یہ ستارہ مطلع صاف ہونے کی صورت میں صحتمند آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے اس کے چار چاند ہیں۔

۱ [اسحٰق نیوٹن مشہور انگریز ماہر فلکیات نے گالیلہ کے مرنے کے ٹھیک ایک سال بعد یعنی ۴ رجنوری سنہ ۱۶۴۳ء کو وُوں تھورپ میں جو لنکول شائر کے مضافات میں ہے پیدا ہوا اور سنہ ۱۷۲۷ء میں وفات پائی۔ وہ بھی گالیلہ کی طرح حکومت کے خلاف غیر معمولی نفرت رکھتا تھا سنہ ۱۶۸۴ء تا سنہ ۱۶۸۶ء کتاب "اصول ریاضی فلسفہ طبیعی" لکھنے میں مشغول رہا اور یہ کتاب سنہ ۱۶۸۷ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔

تازی اس کتاب کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کرتا ہے:

علوم مثبت کے بارے میں آج تک کبھی کوئی ایسی کتاب جو اس قدر اہمیت کی حامل ہو نظر سے نہیں گزری جو اس قدر ضخیم کی ہو اور اس میں اس قدر جدید حقائق اور اس قدر اہم معلومات ہوں۔]

تقریباً سو سال پہلے ایک اور ستارہ جس کا نام "نپتون [3]" ہے دو ماہرین فلکیات "ہال [4]" اور "لوریہ [5]" کے تعاون سے دریافت ہوا۔ یہ ستارہ بغیر آلات کے نظر نہیں آسکتا۔ اس ستارہ کا ایک چاند ہے۔

سنہ ۱۹۳۰ یعنی ۳۴ سال پہلے ایک اور ستارہ جس کا نام "پلوتون [6]" ہے امریکی ڈاکٹر "لاول [7]" کے توسط سے اسکا انکشاف ہوا اور نظام شمسی کے ستاروں کی تعداد ۹ تک پہنچ گئی اب معلوم نہیں آئندہ کیا ہوگا۔

نظام شمسی کی عظمت

۱۔ سیارات

سورج [8]۔ یہ چمکتا ہوا اور روشن سورج یہ مرکز حیات اور سرچشمۂ نور یہ منبع حرارت و لطافت اور یہ کرۂ عظمت و شوکت، ہاں یہی سورج ہے جو ہمارے کرۂ خاکی پر خوب نور افشانی کرتا اور اپنی جبین درخشندہ سے ہمیں زندگی بخشتا ہے۔ ہاں یہی آفتاب جس کے پرنور چہرے کو ہم روزانہ آسمانوں پر دیکھتے ہیں، مرکز و محور نظام شمسی ہے۔ بظاہر ہمیں اس کا (سورج کا) حجم چاند کے برابر نظر آتا ہے لیکن وہ اس زمین سے (جو چاند سے پچاس گنا بڑی ہے) ۱۳ لاکھ گنا بڑا ہے۔ زمین سے چاند تک کا اوسط فاصلہ تین لاکھ چھیاسی ہزار کلومیٹر ہے جبکہ سورج سے زمین تک کا فاصلہ ۱۵۰ ملین کلومیٹر قرار پایا ہے۔ کرۂ خورشید کی سطح کی عظمت و بزرگی معلوم کرنے کے لئے ہم فرض کرتے ہیں کہ چاند اور زمین کے کرے اپنے اس فاصلے کو درمیان میں قائم رکھ کر جوان کے درمیان ہے اگر وہ آفتاب کے کرہ میں راستہ پالیں تو دونوں میں کسی ایک کو سورج کے حدود سے باہر ہوئے بغیر چاند آسانی سے زمین کے گرد گھوم سکتا ہے بلکہ اب بھی اس کے محیط تک پہنچنے کے لئے کافی فاصلہ باقی رہے گا۔

کرۂ خورشید کی سطح کے اوپر درجۂ حرارت ۶۰۰۰ درجہ ہے اور اس کے مرکز میں (درجۂ حرارت) ایک ملین سے بھی زیادہ ہوگا۔

عطارد۔ یہ خوبصورت عطارد یہ جلتا ہوا کرہ جو آفتاب سے قریب ترین سیارہ ہے، اس وقت اس کا فاصلہ سورج سے ۵۸ ملین کلومیٹر ہے۔ وہ (عطارد) اس نوری اور آتشیں کرہ کی تعظیم بجالاتا ہے اور اس

کرہ کے آگے اس طرح جھک جاتا ہے جیسے کوئی بچہ سورج کی سنہری کرنوں کے سامنے سر جھکا دیتا ہے اور وہ اس لامحدود فضا کے اندر اس سرچشمۂ نور (سورج) کی موجوں کے فلا کے درمیان دوڑتا ہے۔ عطارد سورج کے ساتھ ہی طلوع ہوتا ہے اور سورج کے ساتھ ہی غروب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیں بہت کم نظر آتا ہے لیکن کبھی کبھی سورج کے طلوع و غروب کے وقت نظر آجاتا ہے۔ اس ستارہ کا حجم چاند سے زیادہ اور زمین سے کم ہے اور قریبی فاصلہ پر سورج کے اطراف گردش کرتا ہے۔

زہرہ۔ یہ چمکنے والا ستارہ عطارد کی طرح خوبصورت ہے اور تقریباً آفتاب کے ساتھ ہی طلوع اور غروب ہوتا ہے۔ چونکہ وہ طلوع صبح کے وقت نمودار ہوتا ہے اس لئے وہ ستارۂ صبح کے نام سے موسوم ہے اس کا فاصلہ سورج سے ۱۰۸ ملین کلومیٹر ہے یہ ستارہ عطارد سے چند گنا بڑا اور زمین سے تھوڑا سا چھوٹا ہے [1]

زمین۔ یہ کرۂ خاکی اور یہ پرورش کا گہوارہ، ان تمام دلکش اور روح افزا نظاروں، ان صحراؤں، ان کھیتوں، فرحت بخش باغوں اور ہزاروں حیرت انگیز وسیلوں اور گوناگوں عجائبات کے ساتھ (موجود

---

[1] [سنہ ۱۵۴۶ء میں "پیز" میں پیدا ہوا۔ ۱۹ سال کی عمر تک اپنا پورا وقت یونانی اور لاتینی ادبیات کے گہرے مطالعہ میں صرف کرتا رہا۔ اتفاقاً اس نے ایک روز کلیسا کی کسی مذہبی رسم میں شرکت کی اور اپنے سر پر لٹکے ہوئے ۴۰ چراغوں کا فانوس کو دیکھا جو اس کے لئے جاذب نظر ثابت ہوا۔ یہ موضوع نہایت سادہ اور معمولی تھا لیکن بڑے مفکرین کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ کسی معمولی بات کو بھی فضول اور سادہ نہیں سمجھتے اور نہایت معمولی مسائل اور معمولی باتوں سے وہ بڑے بڑے درس حاصل کرتے ہیں۔ بہت سے ایسے اشخاص ہیں جنہوں نے معلوم کرلیا ہے کہ پانی میں ان کے بدن کا وزن کم ہوجاتا ہے یا یہ کہ سیب درخت سے نیچے گرتا ہے یا چالیس فانوس ان کے سر کے اوپر حرکت کرنے لگتا ہے لیکن فقط "ارشمیدس" ہے جس نے مائعات کے دباؤ اور کشش ثقل سے نتیجہ اخذ کیا ہے اور صرف "نیوٹن" نے جاذبہ عمومی کا پتہ لگایا اور صرف "گیلیلو" نے "اجسام کا گرنا" کا اصول دریافت کیا...... گیلیلو کی پہلی ایجاد ایک ایسی دوربین تھی جس نے اسے آسمان کی جانب متوجہ کیا اور اس نے سیارات کے بارے میں اپنے نظریات بیان کئے۔ گیلیلو نے اپنی ایجاد کردہ دوربین کے ذریعہ سے

ہے) ہاں۔ یہی زمین جو باوجود اس قدر عظمت کے بنی وع انسان اور دوسرے صدہا موجودات کی آسائشوں کا گہوارہ اور پرورش گاہ ہے۔ نظام شمسی کے سیاروں میں سے ایک سیارہ ہے۔ یہ سیارہ ۱۵۰

مشاہدہ کیا۔ ارسطو کا نظریہ تھا کہ چاند صاف اور چمکدار ہے لیکن اس کے برعکس گیلیلو نے چاند کو پہاڑوں اور دڑوں سے ڈھکا ہوا بیان کیا اور سورج کی روشنی کی وجہ سے ان پہاڑوں وغیرہ پر کی ابھار صاف نظر آنے لگے۔ کئی نظر نہ آنیوالے ستاروں کا پتہ چلایا جنھیں اس وقت تک کوئی نہ جانتا تھا۔ اور خصوصاً اس بات کا اس نے پتہ لگایا کہ کہکشاں کے بمشکل دھبے ستاروں کے گرد وغبار کی صورت میں تبدیل ہوگئے ہیں نیز اس نے چار چھوٹے چھوٹے چاند بھی دیکھے جو سیارۂ مشتری کے اطراف حرکت کرتے رہتے ہیں اور آخر کار اس نے سورج کے دھبوں کو بھی اپنی آنکھ سے دیکھا۔

گیلیلو نے سنہ ۱۶۱۰ء میں اپنے مشاہدات کے نتیجوں کو "قاصد آسمان" کے نام سے شائع کیا۔ جس طرح بہت سے لوگوں نے اس کے نام سے شائع کیا۔ جس طرح بہت سے لوگوں نے اس کی تعریف وتوصیف کی بعض لوگوں نے اس پر اعتراضات بھی کئے۔ اس سے پوچھا گیا کہ سیاروں کی تعداد کو وہ سات کیوں نہیں سمجھتا حالانکہ دھاتیں سات قسم کی ہیں اور عبادت گاہوں کے شمعدانوں میں بھی سات شاخیں ہوتی ہیں اور انسان کے چہرہ پر بھی سات سوراخ ہیں۔ کیا یہ بات باور کی جاسکتی ہے کہ ایسے ستارے بھی موجود ہیں جن کے متعلق بطلیموس کچھ نہ جانتا تھا؟ لیکن ان تمام سوالات کا جواب وہی تھا کہ دوربین کے ذریعہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلو تا کہ تمہارا شبہ دور ہوجائے۔

آخر کار سنہ ۱۶۳۲ء میں گلیلیو کا اور اہل کلیسا کا تصادم ہوگیا اور اسپر محکمہ عقائد میں مقدمہ چلا کر اسے سزا دیدی گئی اور جیل بھیج دیا گیا اور چونکہ وہ آسمان کا مزید مشاہدہ نہ کرسکتا تھا اس لئے وہ اپنے سابقہ تجربات کی مدد سے میکانک پر غور کرتا رہا اور ستر سال کی عمر میں علم "ڈینامیک" کا پتہ چلالیا۔ یہ وہ علم ہے جس میں قوت کے ذریعہ حرکت پیدا کرنے پر بحث کی گئی ہے۔

اس کے بعد مخالفین نے اس سے بحث کرنے کی جرائت نہ کی اور آہستہ آہستہ مصالحت کا میدان ہموار ہوتا رہا اور لوگ اس سائنسدان کے اطراف جمع ہونے لگے اس حال میں کہ اس کی قوت بینائی زائل ہوچکی تھی اور دنیا اسے احترام کی نظر سے دیکھتی تھی اس نے ۸/ جنوری سنہ ۱۶۴۲ء کو اس جہان فانی سے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور اس کی باعث افتخار زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔]

ملین کلومیٹر کے فاصلے پر ۱۲/۸۰۰ کلومیٹر قطر کے ساتھ مع اپنے ایک چاند کے سورج کے اطراف گردش کررہا ہے۔

مریخ۔ اس نورانی ستارہ کا امتیاز یہ ہے کہ یہ چاند کا ہمسایہ ہے اس کا حجم زمین کے حجم سے کم ہے اور ۲۲۷ ملین کلومیٹر کے فاصلہ پر اپنے دو چاندوں کے ساتھ سورج کے اطراف گردش کررہا ہے۔ کہتے ہیں کہ زندگی کے لوازمات اس سیارہ میں موود ہیں بلکہ یہ بھی گمان ہے کہ وہاں پر زمین کے لوگوں سے زیادہ ہوشیار زیادہ متمدن اور زیادہ عقلمند لوگ زندگی بسر کررہے ہیں!

مشتری۔ یہ عظیم کرہ زمین سے ۱۳۰۰ گنا بڑا اور اس کا فاصلہ سورج سے ۷۷۸ ملین کلومیٹر ہے اور اس کی رفتار اپنے مدار پر اس قدر تیز ہے کہ یہ ساڑھے نو گھنٹے میں اپنے اطراف پورا ایک چکر کاٹ لیتا ہے اور ۱۲ سال کے عرصہ میں سورج کے اطراف اسکی ایک گردش مکمل ہوجاتی ہے۔ اس ستارے کے بارہ

---

۱ [بلز پاسکال فرانس کا سترہویں صدی عیسوی کا ادیب انجینئر، ماہر طبعیات اور فلسفی ماہ جون سنہ ۱۶۲۳ء میں "کلرمون فران" میں پیدا ہوا۔ اس قدر صاحب صلاحیت اور صاحب فکر تھا کہ بارہ سال کی عمر میں کسی کتاب سے مدد لئے بغیر علم جیومٹری کے مشکل مسائل حل کیا کرتا تھا اور ۱۶ سال کی عمر میں مقاطع مخروطی کے بارے میں اس نے لکھا جو شہر فرانسہ کے فلسفی ڈکارٹ کے لئے باعث حیرت ہوا۔ اور اس کی اسی موضوع کی ایک تصنیف جو اسی کے نام سے مشہور ہے ۱۸ سال کی عمر میں یعنی سنہ ۱۶۴۱ء میں اسی غرض سے لکھی کہ اس کے باپ کو سہولت بہم پہنچائے جو "رواں" کے حاکم کی خدمت کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ سب سے پہلے حساب کی مشین ایجاد کی جو آج بھی محکمہ صنعت وحرفت کی نگرانی میں محفوظ ہے۔ اور ہم نے جیسا کہ پہلے کسی فٹ نوٹ میں بیان کیا ہے اس نے سنہ ۱۶۵۴ء یعنی ۳۱ سال کی عمر میں "حساب احتمالات" کو وجود بخشا تھا۔ ایک روز نویی کے پل کو عبور کرتے وقت پاسکال کی گاڑی کے گھوڑے ایک خطرناک گزرگاہ کی طرف دوڑے اور اس کے درے کی گہرائی میں گرنے میں کوئی کسر باقی نہ رہ گئی تھی لیکن "پاسکال" بچ گیا۔ اس واقعہ کا اس کے دل پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ اس نے اپنا راستہ تبدیل کردیا اور دنیا سے بالکل کنارہ کش ہوگیا اور "پر روایل" کے کلیسا میں معتکف ہوگیا۔ اور خدا کی پناہ حاصل کرلی اور سنہ ۱۶۶۲ء میں وفات پائی۔

چاند ہیں جو تمام اس کے اطراف گھومتے ہیں۔غور کیجئے یہ منظر کس قدر قابل دید اور کس قدر دلکش اور حسین ہوگا[۱]

زحل۔یہ ستارہ زمین سے سینکڑوں گنا بڑا ہے اور مشتری سے چھوٹا ہے۔اس کا فاصلہ سورج سے ۱۴۲۸ملین کلومیٹر ہے اور ہر ۲۹ سال میں سورج کے اطراف ایک گردش مکمل کر لیتا ہے اس ستارے کے دس چاند ہیں اور یہ آنکھ سے دیکھا جاسکتا ہے اور ۱/۲ ۱۰ گھنٹوں میں اپنے اطراف ایک گردش مکمل کر لیتا ہے۔

اورانوس۔یہ وہی ستارہ ہے جسے سنہ ۱۷۸۱ء میں انگریز ولیم ہرشل نے دریافت کیا تھا۔اورانوس' زمین سے دسیوں گنا بڑا ہے اور ایک حیرت انگیز فاصلے یعنی ۲۸۷۰ملین کلومیٹر پر اپنے چار چاندوں کے ساتھ خورشید کے اطراف گردش کر رہا ہے اور ۸۴ سال میں گردش مکمل ہوتی ہے۔

نیپچون۔یہ وہی سیارہ ہے جسے تقریباً سو سال پہلے دو سائنسدانوں نے دریافت کیا تھا۔یہ سیارہ بھی مرتبہ میں زمین سے زیادہ بڑا اور سورج سے حیرت انگیز فاصلے یعنی ۴۵۰۰ کلومیٹر پر واقع ہے اور اپنے ایک چاند کے ساتھ ۱۶۴ سال کی مدت میں سورج کے اطراف ایک گردش مکمل کرتا ہے۔

پلوٹون۔یہ نظام شمسی کا آخری سیارہ ہے جسے ۳۲ سال پہلے امریکی ڈاکٹر لاول نے دریافت کیا تھا۔خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سیارہ زمین سے بلکہ چاند سے بھی چھوٹا ہوگا کیونکہ چاند کی شعاعوں کا اندازہ ۱۲۰۹ کلومیٹر لگایا گیا ہے۔پلوٹون حیرت انگیز فاصلے ۵۹۲۹ملین کلومیٹر پر (زمین سے تقریباً ۴۰ گنا فاصلہ پر) سورج کے اطراف گردش کرتا ہے[۲]

ادیب لوگ حیران ہیں کہ اس کو فلسفہ کا حامی سمجھیں یا اسکا دشمن۔ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پاسکال کا نام فلسفیوں اور ماہرین طبیعیات کی تاریخ میں لکھیں یا زاہدوں اور موحدوں کی تاریخ میں۔"پی یر روسو" نے تاریخ علوم میں پاسکال کو "عارف ریاضی داں" کا لقب دیا ہے۔(دیکھئے کتاب لغت لاروس وفلسفہ وتاریخ علوم صفحہ ۲۱۴)]

۱[بطلیموس (ولادت ۹۰ وفات ۱۶۸ میلادی۔مشہور ریہئیت داں ہے جسکے نظریات کپلر اور کوپر نیک کی تحقیقات سے تہ و بالا ہو گئے]

نظام شمسی میں زندگی

یہ موضوع مدت سے ماہرین فلکیات کو اپنی طرف متوجہ کیا ہوا ہے اور انہوں نے اس سلسلے میں بہت گہرا مطالعہ کیا ہے ان کی مجموعی تحقیقات سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کے خیال میں اکثر ستاروں میں زندگی کی موجودگی کا مسئلہ محض خیالی اور شاعرانہ حیثیت رکھتا ہے نہ کہ کوئی تحقیقی مسئلہ۔کیونکہ اکثر سائنسدان ان سیاروں میں زندگی کے لوازمات کی موجودگی نہیں پاتے اور اسی بناء پر ان کو (انسان کے لئے) قابل سکونت نہیں سمجھتے۔اب ہم اس حصہ میں ماہرین فلکیات کے مطالعہ کے نتائج آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

خورشید۔یہ چمکدار اور جلا دینے والے بھٹی اور یہ کرۂ آتشین و روشن جس کا ٹمپریچر ۶۰۰۰ درجہ کے برابر ہے کسی طرح بھی قابل رہائش نہیں اور کوئی بھی مخلوق اس عجیب حرارت کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔

ماہ[۱]۔باوجود اس قدر خوبصورتی اور دلربائی کے زندہ مخلوقات کی سکونت کے قابل نہیں ہے کیونکہ اس میں پانی' ہوا اور تمام دوسری ضروریات زندگی نہیں ہیں اور چونکہ وہاں ہوا نہیں اس لئے گرمی اور سردی اعتدال پر نہیں رہ سکتی۔اسی سبب سے چاند کا کرہ دن میں بہت گرم ہو جاتا ہے جس کا درجہ حرارت ۱۰۰ درجہ ہوتا ہے اور راتیں بہت سرد ہو جاتی ہیں اور ٹمپریچر صفر سے بھی ۸۰ سے لیکر ۱۰۰ درجہ نیچے چلا جاتا ہے۔

عطارد۔سورج کی قربت کی وجہ سے اس کا درجہ حرارت ۳۰۰ درجہ رہتا ہے اور حرارت کی اسی زیادتی

۱[بطلیموس کے خیال کے مطابق ثوابت ستارے اسی آسمان پر قائم ہیں]

۲[اس میں کوئی ستارہ موجود نہیں ہے اور اسی لئے اس کو فلک اطلس کہتے ہیں۔بطلیموس نے اس آسمان کے جو فرائض بتائے ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ آسمان دنیا کی رات دن کی حرکت کا باعث ہے۔]

۳[کوپر نیک بتاریخ ۱۹ر فروری سنہ ۱۴۸۳ لہستان کے شہر تھورن میں پیدا ہوا......وہ خود لکھتا ہے: میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ یونانی فلاسفر کی تمام تصنیفات کا مطالعہ کروں اور دیکھوں کہ ان میں سے کوئی شخص آسمانی کروں کے بارے میں ان حرکتوں کے سوا جنہیں یونیورسٹیوں میں تسلیم کر لیا گیا تھا کوئی نئی حرکت بیان کرتا ہے یا نہیں؟ میں سیسرون کی کتاب مطالعہ کیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ: نیتاس زمین کو متحرک سمجھتا تھا اور

کی وجہ سے وہ ان ذرات سے جن سے ہوا اور فضا قائم رہتی ہے محروم ہے۔ اس کے علاوہ عطارد کے اطراف وہ بادل دیکھنے میں نہیں آتے جو ہوا اور بخارات کی نشانی ہوتے ہیں۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس خوبصورت سیارہ میں بھی حیات موجود نہیں ہے۔

زہرہ[۲]۔ اس ستارہ کے چہرہ کو گھنے بخارات اور ابر کے بڑے بڑے انباروں نے چھپا رکھا ہے اور سورج سے قربت کی وجہ سے اس کی حرارت زمین سے زیادہ ہے۔ سنہ ۱۸۳۴ء میں دو امریکی منجموں نے[۱] اپنے مطالعہ اور تحقیقات کے ذریعہ سے سیارہ زہرہ کے کرہ میں کاربانک گیس کا پتہ چلایا ہے اور کہتے ہیں کہ زمین کی جوانی کا زمانہ بھی اسی طرح کا تھا اور ممکن ہے کہ آئندہ کرۂ "زہرہ"، "زمین" کی موجودہ حالت میں آجائے۔ اس بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ فی الحال یہ سیارہ بھی قابل رہائش نہیں ہے۔[۲]

میں نے "پلوتارک فیلولاؤس" کی کتاب پڑھی تھی جس میں اس نے اس طرح اپنا خیال ظاہر کیا ہے: زمین اپنے اطراف گردش کرتی ہے اور اس کا محور بیضوی ہے اور ہماری ظاہر بین نظر میں اس محور کے اطراف چاند اور سورج گردش کرتے ہیں۔ سنہ ۱۵۰۴ء میں کوپرنیک فیلولاؤس کا ہم خیال ہوگیا اور اس بات کو تسلیم کرلیا کہ (زمین) ۲۴ گھنٹے میں ایک بار اپنے اطراف ایک گردش مکمل کرلیتی ہے پھر سورج کو کرۂ فلک کے مرکز میں ساکن قرار دیا اور زمین کو ایک سال کی مدت میں اس کے (سورج کے) اطراف گھمایا۔ اس کے عقیدے کے مطابق ہر سمت چمکتے ہوئے ستارے ثوابت ہیں اور دوسرے تمام سیارے زمین کی طرح سورج کے اطراف گردش کرتے ہیں کوپرنیک امن و آشتی کا اس قدر شیدا تھا کہ چالیس سال تک اس نے اپنے نظریات کی اشاعت نہ کی۔ اس حوصلہ مند سائنسداں نے آنے والے طوفان کا اندازہ کرلیا تھا اور چاہتا تھا کہ آغاز جنگ کو حتی المقدور پیچھے ڈھکیل دے۔ آخر کار ایک مدت کے بعد اس کا تذبذب ختم ہوگیا اور اس نے اپنی کتاب کا قلمی نسخہ وتمبرگ کے ریتکوس (۱۵۱۴۔۱۵۷۴) نامی ایک نوجوان سائنسدان کے حوالہ کیا وہ کوپرنیک کے انتہائی جاں نثار شاگردوں میں سے تھا۔ ریتکوس نے اسے انتہائی تیزی کے ساتھ (پریس) میں بھیج دیا اور اس کی طباعت کی نگرانی کا کام اپنے ایک دوست آندرہ اور سیاندر کے ذمہ لگا دیا۔ اس وقت کوپرنیک کی عمر تقریباً ستر سال تھی۔ ابھی اسے اپنی طبع شدہ کتاب کے مطالعہ کے لئے کافی مہلت بھی نہ ملی تھی کہ ۲۴ رمئی سنہ ۱۵۴۳ء کو اس کا انتقال ہوگیا]

[۱] [ژان کپلر بتاریخ ۱۶ رمئی سنہ ۱۵۷۱ء ول (وورتمبرگ) میں پیدا ہوا اور ۱۵ رنومبر سنہ ۱۶۳۱ء کو شہر "راتسبون"

مشتری[۵]۔ سورج سے زیادہ فاصلہ ہونے کی بناء پر اس پر برف جمی رہتی ہے اور وہاں ہمیشہ شدید سردی کی حکمرانی رہتی ہے اس لئے اس کرہ میں زندہ موجودات کی سکونت کی گنجائش نہیں ہے۔

مریخ[۴]۔ یہ واحد سیارہ ہے جو سورج اور زمین سے مناسب فاصلہ پر ہے اس لئے اس میں زندگی کے آثار پائے جانے سے نہ تو قطعی انکار کیا جا سکتا ہے نہ ہی اسے ثابت کیا جا سکتا ہے۔[۱] دوسری طرف یہ موضوع کہ اس وقت کرۂ مریخ میں مخلوق موجود ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں منجموں کا شدید اختلاف ہے۔[۲] یہ تھا اجمالی ان فلک شناس سائنسدانوں کے نظریات کا جو نظام شمسی میں جانداروں کی سکونت سے متعلق تھے۔

لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ ان منجموں نے مذکورہ بالا کروں میں بھی زندگی کے لوازمات کا اسی طرح اندازہ لگایا ہے جس طرح زمین پر جینے کیلئے ضروری ہیں اور اس لحاظ سے ان سیاروں کو قابل سکونت نہیں سمجھتے۔ ممکن ہے کسی اور صورت میں موجودات آسمانی ان ہی لوازمات کے ساتھ جوان کروں کے لئے

میں وفات پائی۔ ماہر فلکیات پی یر روسو کے قول کے مطابق کپلر تین اصول ایجاد کرنے میں کامیاب ہوگیا کیونکہ نیوٹن کے پاس یہ اصول موجود ہونے کی وجہ سے وہ نظریہ کشش ثقل دریافت کرسکا تھا اور ان ہی اصولوں کی بناء پر موجودہ منجم سیاروں کی حرکتوں کے بارے میں پیشن گوئی کرتے ہیں اور آسمان پر ان کی (سیاروں کی) رفتار کا نقشہ کھینچتے ہیں وہ تین قانون یہ ہیں:

قانون اول: ہر سیارہ گردش کرتے ہوئے سورج کے اطراف ایک بیضوی مدار سے گزرتا ہے۔

قانون دوم: اس مدار کا جو سیارہ سورج سے جتنا زیادہ نزدیک ہوگا اس کی رفتار اتنی ہی زیادہ تیز ہوگی۔

قانون سوم: اگر ہم سال کو وقت کی ایک اکائی اور سورج سے زمین کے فاصلہ کو فاصلہ کی اکائی فرض کریں تو سورج کے اطراف ایک سیارہ کی گردش کی مدت کا جذر اس سیارے کے خورشید سے فاصلہ کے مکعب کے برابر ہوگا۔ پس اس قانون کی مدد سے سورج کے اطراف ہر سیارہ کی گردش کی مدت معلوم ہونے پر ہم سورج سے اس سیارہ کا فاصلہ بتا سکتے ہیں۔

کپلر نے سیاروں کی حرکت کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے جو سنہ ۱۶۰۹ء میں چھپ کر شائع ہوئی]

۱_Mepeue ۲-Venus ۳_Laterre ۴_Maps ۵_Jupiter ۶_Saturne

ضروری ہیں وہاں زندگی گزار رہے ہوں۔ یہ بات دراصل ایک قسم کی خودغرضی پر مبنی ہے کہ ہم ان سیارات پر جینے کے لئے وہی شرائط عائد کریں جو ہمارے لئے ضروری ہیں اور یہ ان لوگوں کی سوچ ہے جو ہر چیز کو بشری پیمانے پر ہی ناپنا چاہتے ہیں۔

۲۔ثوابت

گزشتہ بحث میں ہم نے ثوابت کی شناخت کا طریقہ بتایا تھا لیکن اب ان کی کیفیت کے بارے میں آپ کو بتائیں گے۔

ان کو آنکھوں کے ذریعہ سے دیکھا جا سکتا ہے: جس وقت فضا صاف ہو اس وقت زمین کے نصف کرہ شمالی اور نصف کرہ جنوبی میں تقریباً ۶۰۰۰ ثوابت دکھائی دیتے ہیں لیکن فضا کی رکاوٹوں اور موانعات کے باعث ہر نصف کرہ میں عام طور پر ۲۰۰۰ سے زیادہ نظر نہیں آتے لیکن آلات اور بڑے بڑے ٹیلسکوپوں کے ذریعہ ان ستاروں میں سے سینکڑوں ملین ستاروں کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

ان کا فاصلہ ہم نے سیاروں کو ناپنے کے لئے کلومیٹر کو پیمانہ قرار دیا تھا لیکن یہاں فاصلہ اسی قدر زیادہ ہے کہ ہمیں اسی مناسبت سے پیمانہ مقرر کرنا پڑے گا اور وہ پیمانہ ''نور'' کا ہے۔ نور کے حرکت کی رفتار فی سکنڈ تین لاکھ کلومیٹر ہے۔ یعنی ذرات یا امواجِ نور ہر سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر کا راستہ خط مستقیم میں طے کرتے ہیں۔ اس پیمانے کی عظمت کا اندازہ کرنے کیلئے فرض کیجئے کہ ایک ہوائی جہاز جس کی رفتار نور کے برابر ہو اور وہ ایک سیکنڈ میں کرۂ زمین کے اطراف (جس کا فاصلہ استوا پر ۴۰ ہزار کلومیٹر ہے) سات

۱؎ [مشہور انگریز منجم ولیم ہرشل ۲۵ نومبر سنہ ۱۷۳۸ء کو ''ھانوور'' میں جو اس وقت انگلستان کے زیر حکومت تھا پیدا ہوا۔ چودہ سال کی عمر تک بکریاں چراتا رہا اور ۱۸ سال کی عمر تک شاہی محافظوں کی موسیقی کے دستہ کے ساتھ کام کرتا رہا حتیٰ کے ستارۂ ''اورانوس'' کا پتہ چلانے کے بعد دنیا میں اس کی شہرت ہو گئی اور شاہی یونیورسٹی کا چانسلر اور فرانس کی سائنس اکیڈمی کا رکن بن گیا۔ اور ایک سائنسدان کو بطور حق جس قدر مراعات اور اعزازات مل سکتے تھے وہ سب اس کو حاصل ہو گئے اور ان تمام چیزوں کے باوجود وہ نہایت سادہ متواضع اور نیکوکار تھا۔ ۲۵ اگست سنہ ۱۸۲۲ء کو ۸۴ سال کی عمر میں وفات پائی]

۲؎ Uranus ۳؎ Naptune ۴؎ Hale ۵؎ Leverrier ۶؎ Plotone ۷؎ Lowell ۸؎ Le Soleile]

مرتبہ یا اس سے بھی کچھ زیادہ چکر لگاتا ہے۔

یا اگر کوئی پیدل مسافر ہر روز دس فرسخ کا فاصلہ طے کرتا ہے۔ اگر وہ چاہے کہ نور کی رفتار کے ایک منٹ کا فاصلہ طے کرے تو اسے ۸۴۰ سال کی مدت درکار ہوگی اور اسی حساب سے آفتاب جو ہم سے ۱۵۰ ملین کلومیٹر دور ہے اسی کی روشنی ہم تک صرف ۸ منٹ میں پہنچ جاتی ہے اور چاند کی روشنی ۱/۵ سیکنڈ میں زمین تک پہنچ جاتی ہے اب اندازہ کیجئے کہ سورج کی روشنی کی رفتار ایک دن میں کتنی ہوگی؟!

یا اس حساب کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ یقین کر سکتے ہیں زمین سے قریب ترین ثابت ستارہ وہ ہے جس کا نام ''پروکسیما'' ہے جس کا فاصلہ زمین سے ۴۲ ماہ نوری کا ہے اور ستارۂ ''شعرا'' کی روشنی نو سال نوری میں ہم تک پہنچتی ہے اور بعض ایسے ثوابت بھی ہیں جن کی روشنی سترہ ہزار نوری سال میں زمین پر پہنچتی ہے اور بعض ایسے بھی ثوابت ہیں جن کی روشنی تین ملین نوری سال میں ہم تک پہنچتی ہے؟!!

سچ تو یہ ہے کہ اس فاصلہ کا تصور ہوش ربا ہے۔ ان لوگوں کی تعداد جو دنیا کو مختصر اور محدود کہتے ہیں اور دنیا کے لئے ایک حد مقرر کر رکھی ہے ان لوگوں سے کم نہیں ہے جو دنیا کو لامحدود اور غیر متناہی کہتے ہیں۔ موخر الذکر کہتے ہیں کہ اگر روشنی کی شعاعیں عالم ہستی کے ایک سرے تک کر دوسرے عالم کے سرے تک حرکت کرے تو اسے پہنچنے میں ۱۰۶۸ ملین نوری سال درکار ہونگے یعنی نور تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کے حساب سے اس مسافت کو ۱۰۶۸ ملین سال مین طے کرے گا۔

پھر دنیا کو اس قدر محدود کس طرح تسلیم کر لیا گیا ہے؟ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ یہ مقررہ فاصلے جو بیان کئے گئے ہیں یہ افسانہ نہیں بلکہ یہ تمام سلسلہ بلحاظ علم ریاضی درست ہے جسکی تردید نہیں کی جا سکتی۔

عالم بالا کی عظمت سے متعلق چند نکات

جہان بالا کی عظمت کے بارے میں تفصیلات کے لئے ہم حسب ذیل پانچ موضوعات پر روشنی ڈالیں گے۔

۱۔ بہت باریکی سے حساب کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ روزانہ ۳۵۰,۰۰۰ ملین ٹن سورج کا حجم' حرارت اور قوت میں تبدیل ہو جاتا ہے لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ یہ عظیم کی مدت دراز سے چلی آ رہی ہے

لیکن اس کے باوجود اس کے نور اور حرارت میں کسی قسم کی کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ غور کیجئے کہ اس کرہ کا حجم اور وزن کس قدر رہوگا کہ روزانہ ۳۵۰،۰۰۰ ملین ٹن وزن گھٹنے کے باوجود اس کے وزن میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی؟

۲۔ صاف اور بغیر ابر کی راتوں میں ستاروں کے ایک جھرمٹ کو دیکھا جا سکتا ہے جو خاص وضع سے تشکیل پائے ہیں جبکہ آنکھ سے چند ستاروں سے زیادہ نظر نہیں آتے۔ یہ ایک خاص شکل میں ملے ہوئے ہیں اور قدیم ہیئت دانوں نے ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام رکھا ہوا ہے اور اب بھی وہ اسی نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ منجملہ ان ستاروں کے ایک ستارہ ''الجاثی علی رکبتیہ'' (بوجھ سے لدا ہوا اونٹ جو اپنے دونوں گھٹنوں پر بیٹھا ہوا ہے) ہے جو بظاہر چند ستاروں سے زیادہ معلوم نہیں ہوتا لیکن دوربین کی مدد سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان ستاروں کی تعداد ۳۰،۰۰۰ ہے اور ان کا فاصلہ ہم سے ۳۶ ہزار نوری سال ہے۔

۳۔ اس بات کو پیش نظر رکھنے کے بعد کہ پانی کو کھولنے کے لئے ۱۰۰ درجہ حرارت کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر حرارت اس سے زیادہ ہو جائے تو پانی بخارات کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ستاروں کی حرارت کی داستان بہت دلچسپ ہے جس طرح کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے سورج کی بیرونی سطح پر درجہ حرارت ۶۰۰۰ درجہ اور اس کے اندر درجہ حرارت لاکھوں درجہ سے بھی زیادہ ہے۔ اس درجہ حرارت میں ہر چیز حتیٰ کہ جمادات اور دھاتیں بھی بھاپ میں تبدیل ہو جائیں گی۔

''جدی'' اور ''شعریٰ'' ستاروں کی سطح پر درجہ حرارت ۸۰۰۰ اور ۱۱۰۰۰ درجہ تک پہنچ جاتا ہے اور ان کے اندر درجہ حرارت لاکھوں درجہ سے بھی بڑھ کر ہے۔

۱۔ [روسی سائنسدانوں نے سیارۂ زہرہ کے موجوں کی رفتار سے یہ معلوم کر لیا ہے کہ زہرہ کرۂ زمین کے دس دنوں کے برابر وقت میں ایک دفعہ اپنے اطراف پوری گردش کر لیتا ہے اس لحاظ سے جو مسئلہ آج تک پردۂ تاریکی میں تھا وہ روشن ہو گیا۔ زہرہ کی رفتار کا پتہ ریڈیائی لہروں کے ذریعہ چلا۔ جو لہریں روسی سائنسدانوں نے ستاروں پر بھیجی تھیں دس دن بعد ان کا انعکاس ہوا تھا]

۴۔ کہکشاں کا سلسلہ جو لاکھوں ستاروں کا مجموعہ ہے فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ ہمیں ایک سفید پٹی کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ ہیئت دانوں کی دوربینوں کے ذریعہ جو آسمانوں کا مطالعہ کیا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک (بذات خود) ایک وسیع دنیا ہے یہاں تک کہ باوجود اس عظمت کے ہمارا نظام شمسی بھی کہکشاں کے ایک ستارہ کے اجزاء کے ایک جزو کے برابر ہے اور سورج ان کے ستاروں میں سے ایک متوسط ستارہ کے برابر ہے۔ کہکشاں کے ان دو ستاروں کے قطروں کے درمیان اس قدر فاصلہ ہے کہ نور اس فاصلہ کو ۲۰۰ تا ۳۰۰ ملین سال میں طے کریگا۔

۵۔ ابر: صاف راتوں میں ستارے ہلکے اور پھیکے رنگ کے ابر کی طرح نظر آتے ہیں ان کو ہی سحابی (ابر) کہتے ہیں ان میں سے ہر ایک بجائے خود ایک علیحدہ عالم ہے اور ان میں جو ستارہ زمین سے قریب ترین ہے اس کا نام ''المرئۃ المسلسلۃ[۲]'' ہے جس کے چند ستارے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بادل ایسے ''کہکشاں'' کے ہیں جن میں نظام شمسی سے بھی بڑے ستارے موجود ہیں اور ان کا فاصلہ زمین سے ۹۰۰ ہزار سال نوری کے برابر ہے۔

جہان بالا میں تنظیم کی روشنی

۱۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے ہیئت دان بطلیموس افلاک کا قائل تھا وہ کہتا تھا کہ ہر ایک ستارہ کسی ایک فلک پر نصب کر دیا گیا ہے اور وہ فلک کی حرکت کے ساتھ ساتھ حرکت کرتا جاتا ہے اس نظریہ کا سبب یہ تھا کہ ستاروں کا مقام ان افلاک کے ساتھ معین کر دیا گیا تھا۔

لیکن کپر نیک کے فلکی نظریہ نے بطلیموس کے ہیئت کے دستاویزات کا بنڈل تہہ کر کے رکھ دیا اور

۱۔ [اس سیارے اور نظام شمسی کے دوسرے بعض سیاروں کے فاصلے کے بارے میں ماہرین فلکیات کے درمیان تھوڑا سا اختلاف ہے۔ ہم جو بیان کر رہے ہیں یہ آسمانی فاصلوں کا مختصر تذکرہ ہے ورنہ ہمارے اور ہماری زمین کے فاصلوں کی تفصیل بہت زیادہ ہے]

۲۔ [نظام شمسی کا خاندان دراصل سورج کے علاوہ ۱۴۰ ارکان پر مشتمل ہے جن میں ۹ سیارے ۳۱ چاند ہیں۔ کیا ان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے؟ (نقل از کتاب سفر بہ جہانہائے دور دست (اپنے سے دور جہانوں کا سفر)]

بنیادی طور پر اس نے افلاک سے انکار کر دیا کیونکہ اس نے افلاک کی بجائے ایک قوت کو ستاروں کا نگہبان بنا دیا لیکن فضا کے اندر ستاروں کے معلق رہنے کو وہ کس چیز سے تعبیر کرتا ہے؟

مشہور ماہر فلکیات نیوٹن: اس بارے میں اس نے اپنے جاذبہ عمومی کے نظریہ کو پیش کیا اور ستاروں کی حرکت اور گردش کو ایک منظم اور باضابطہ قانون کے تابع شمار کیا۔ وہ کہتا ہے: قانون جاذبۂ عمومی "مرکز سے گریز" کی قوت کے تحت تمام سیاروں پر حکم چلا رہا ہے اور ان اجرام بالا میں سے ہر ایک میں دو قوتیں ایک دوسرے کا توازن قائم رکھنے کے لئے موجود ہوتی ہیں اور چونکہ ایک طرف تو قوت جاذبہ کا دو جسموں کے حجم سے براہ راست تعلق ہوتا ہے دوسری طرف اس کی نسبت معکوس دونوں اجسام کے مجذور کے برابر ہوتی ہے، اسی سبب سے سیاروں میں سے ہر ایک کا وزن ان کے فاصلے اور ان کی گردش کی رفتار کے تناسب سے ہوتا ہے۔ اس بناء پر اگر ان دونوں قوتوں میں مساوات باقی نہ رہے یعنی اگر قوت جاذبہ، قوت دافعہ سے بڑھ کر ہو جائے تو بڑا جسم، اپنے چھوٹے جسم کو اپنی طرف کھینچ لیگا اور اگر قوت دافعہ زیادہ ہو جائے تو سیارے آہستہ آہستہ اپنے مرکز سے دور ہو کر تباہ ہو جائیں گے۔

نتیجہ یہ نکلا: کہ اجرام فلکی میں یہ دو قوتیں مساوی طور پر حکومت کر رہی ہیں اگر اس میں تھوڑا سا بھی انحراف ہو جائے یعنی قوت جاذبہ یا مرکز سے گریز کی قوت میں کمی یا زیادتی ہو جائے یا اگر کلی طور پر سیارے فاصلہ یا حجم یا گردش کی رفتار سے محروم ہو جائیں تو وہ بالکل تباہ ہو جائیں گے۔ یہ تمام باتیں خود جہان بالا میں تنظیم کی تصدیق کرتی ہیں۔

۲۔ سیاروں کی حرکت خود تنظیم کی روشن دلیل ہے جو ایک مقررہ حساب کے مطابق منظم ہیں اور ہر وقت یکساں رفتار سے حرکت کر رہے ہیں حتیٰ کہ ہزاروں سال گزرنے پر بھی ان کی حالت میں ذرا سا بھی تغیر دیکھنے میں نہیں آیا۔

۳۔ جرمنی کا مشہور سائنسدان "بدٔ" جو اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی میں گزرا ہے اس نے سیاروں

ا [LaLune]

کے فاصلوں کو ایک معین قانون کے ماتحت لے آیا۔ وہ کہتا تھا: ہر سیارے کا سورج سے فاصلہ بے قاعدہ نہیں ہے بلکہ ہر ایک سیارہ ایک خاص حساب کے ماتحت ایک خاص فاصلہ پر رہتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا سائنسدان نے اسی قانون کی رو سے ستارہ "نپتون" کی جگہ کا تعین کیا اور منجموں نے بعد میں ٹیلسکوپ کی مدد سے اسی جگہ پر اس ستارہ مذکور کا مشاہدہ کیا۔

۴۔ خسوف و کسوف کا مسئلہ بھی قابل توجہ موضوعات میں سے ہے کیونکہ برسوں پہلے اس کے بارے میں درست پیشین گوئی کی جا سکتی ہے اور اس بات سے ہی بخوبی واضح ہے کہ ستاروں کی گردش کس قدر منظم اور درست ہے۔ کلیہ کے طور پر ہر سال ۱۸ سال ۱۱ روز میں ۴۳ مرتبہ سورج گہن اور ۲۸ مرتبہ چاند گہن ہوتا ہے۔ پس اس مدت کے گزرنے کے بعد پھر اپنے مقررہ وقت پر دوبارہ چاند گرہن اور سورج گرہن کا عمل ہوگا یعنی ہر ۱۸ سال اور ۱۱ روز میں سورج، چاند اور زمین ایک مناسب حالت میں سابقہ حالت کے مطابق ہو جائیں گے۔

یہ تھا اجمالی خاکہ آسمان کی عظمت اور نظم کا جو ہم نے مختصراً پیش کر دیا۔ قارئین کرام! زیادہ معلومات کے لئے اس مضمون سے متعلق کتابوں کی طرف رجوع کر سکتے ہیں اور جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اپنے تحقیقی مطالعات کے سلسلے میں مسئلہ توحید کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس سے نتائج اخذ کئے جائیں۔

ا [ان دو آدمیوں سے مراد آدامس اور ڈونہام ہیں] ۲ [دیکھئے کتاب "نجوم بے تلسکوپ" اور کتاب "آنا تیم تا ستارہ" تالیف پی یر روسو] ۳ [پی یر روسو کہتا ہے: میں یقین کے ساتھ تم سے یہ بات نہیں کہہ سکتا کیونکہ نہایت افسوس کے ساتھ میں اعتراف کرتا ہوں کہ ان کی موجودگی کی شدت سے تردید کی جا سکتی ہے لیکن اس صورت میں قطعی طور پر اعلان نہیں کیا جا سکتا کہ مریخ قابل سکونت نہیں ہے کیونکہ کرۂ مریخ میں ہوا نہ ہونے کے برابر، پانی مختصر لیکن نباتات وغیرہ بکثرت ہیں (دیکھئے کتاب نجوم بی تلسکوپ ص ۳۴)]

۴ [امریکہ کا خوش مذاق منجم لاول اور شیاپارلی اور جارج فو رنیر نہروں کی موجودگی کو مانتے ہیں بلکہ مریخ پر لوگوں کی موجودگی کے بھی قائل ہیں اور بہت سے مشہور منجمین جن کے پاس طاقتور دوربینیں بھی موجود ہیں وہ خیال کرتے ہیں کہ یہ جو نہروں کے آثار نظر آ رہے ہیں وہ نجومی آلات کی خرابی کی وجہ سے ہے]

اب جبکہ آپ جہان ہستی کی عظمت و تنظیم سے واقف ہو چکے ہیں ہم نے وہ حقیقتیں جو سورج' چاند' مریخ' زہرہ' مشتری اور آخر میں کہکشاں اور بادلوں کے بارے میں بیان کی ہیں ان پر غور کیجئے اور دوسری طرف سیارات کی حرکت ان کے فاصلے اور ثوابت کی عظمت اور جاذبہ عموی اور مرکز سے گریز کرنے والی قوت کے بارے میں غور کیجئے اور پھر اپنے وجدان کی طرف متوجہ ہو کر اس سے سوال کیجئے کہ کیا اس کا امکان ہے کہ یہ کارخانہ جس کی عظمت اور جس کا نظم و ضبط اتنا شاندار ہے اتفاق و اسباب کے ماتحت وجود میں آ گیا ہوگا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ثوابت اور ان کے حیرت انگیز فاصلوں اور سیاروں اور ان کی درست حرکتوں کو ہم اتفاق اور حادثہ کے باعث سمجھیں۔ اس سوال کا جواب تو بغیر کہے آپ پر واضح ہے۔

چھوٹی دنیا کا نظام پیدائش

ہمارے اس عالم کائنات کے حیرت انگیز نظام اور اس کے مطالعہ اور دنیا کے انتظام کے بارے میں ہم نے جو بحث کی ہے آخر کار اس نے ہمیں آسمانوں کی جانب کھینچ ہی لیا۔ دنیا کے اس سرے سے اس سرے تک توحید کی نشانیوں اور تنظیم کے وجود کو ثابت کرنے کا کام دو عظیم بنیادی دلیلوں میں سے ایک تھا (اب دوسری دلیل کی تکمیل کے لئے ہم نے) آسمانوں کی سیر اور اس لامتناہی اور عظیم عالم بالا کے حیرت انگیز نظام کے مطالعہ کی غرض سے اپنا رخت سفر باندھ لیا۔

اب جبکہ ہمارے مطالعات' ہماری اس دنیا کے بارے میں اختتام پذیر ہو چکے ہیں۔ ایک دوسرا گوشہ جو بہت چھوٹا گوشہ ہے اس دنیا کی پر اسرار باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اپنے توحیدی مطالعات اور تحقیقات کو جاری رکھتے ہیں لے

یہ چھوٹے چھوٹے عالم اگرچہ اس قدر عظمت کے مالک نہیں ہیں جو عظیم اور لامتناہی آسمانوں میں ظاہر ہو سکے لیکن اس کے مقابل میں ان کی حیرتناک اور فوق العادت ریزہ کاری (نقش و نگار بنانا) بہت جاذب نظر ہے اور وہ خدائے تعالیٰ کے بے انتہا لطف و کرم کی روشن نشانیاں ہیں۔ عالم ہستی کے عام نظام کی روشنی کا نمونہ ہیں اور جس طرح کہ عالم افلاک میں دو موضوع نہایت حیرت انگیز اور دلچسپ ہیں

(ایک تو آسمانوں کی حیران کر دینے والی عظمت ہے اور دوسرا ان کا اعلیٰ و مرتب نظام ہے) ان چھوٹے عالموں میں بھی دو چیزیں بہت زیادہ قابل توجہ ہیں:

۱۔ ان کا حیرتناک چھوٹا پن اور ان عالموں کے پیچیدہ اور نہایت باریک اجزاء۔

۲۔ ایک بہت ہی عجیب اور نازک نظام جو ان کے وجود پر حکومت کر رہا ہے۔

اس بناء پر یہ بات بالکل حق بجانب ہے کہ ہم خالق کائنات کی جستجو میں آسمان کی بے کراں وسعت میں اپنی فکر و توجہ مبذول کریں اور وہ چھوٹے چھوٹے عالم جو ہمارے قدموں کے نیچے ہیں ان کی طرف توجہ کر کے اور علمی تحقیقات کی رو سے (معمولی اور سادہ نظر سے نہیں) ان کے عجائبات اور ان کی حیرتناک باتوں کا قریب سے مطالعہ کریں۔ اس وقت ہمیں بخوبی معلوم ہوگا کہ ان عوالم کے توحیدی اسرار و دقائق اور حیرتناک عجائبات بہت دلچسپ ہیں یہاں تک کہ آسمانوں کے دقائق اور عجائبات سے بھی زیادہ دلچسپ ہیں اور ان کا نظم و نسق بھی زیادہ پیچیدہ اور زیادہ باریک ہے۔

اس موضوع سے متعلق نمونے ہمیں صنعتی کارخانوں میں ملیں گے۔ یہ بات واضح ہے کہ جو کارخانہ جتنی زیادہ چھوٹی چیز بنانے کا ہوگا اس چھوٹی چیز کے اجزاء بھی زیادہ باریک اور نازک ہوں گے اسکے بنانے کا انتظام کرنا بھی اتنا ہی زیادہ پیچیدہ اور زیادہ مشکل ہوگا۔ اور زیادہ دلچسپ بھی ہوگا۔ ایک بڑی دیواری گھڑی کا بنانا' ایک بہت چھوٹی کلائی کی گھڑی کے بنانے کے مقابلہ میں زیادہ آسان ہے کیونکہ اس کے تمام پرزے تقریباً ایک انگل موٹے ہوتے ہیں لیکن باریک پرزوں کا بنانا اور جوڑنا زیادہ پیچیدہ اور زیادہ مشکل ہوگا۔

یہ بات تو ظاہر ہے کہ جس طرح ہم نے آسمانوں کے بارے میں بہت زیادہ معلومات حاصل کی ہیں اور انسان کو ایک بہت بڑے عالم سے روشناس کرایا ہے اسی طرح اس عالم ہستی جسکے اندر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں کے ایک چھوٹے سے احاطہ میں ہم نے کئی منطقوں کا پتہ چلایا ہے اور انسان کے علمی مطالعہ کے احاطہ کو وسیع منطقوں تک وسعت دیدی ہے اور وہاں کے بہت سے رازوں اور عجائبات کا انکشاف کیا ہے جو خود راہ توحید کے رہرووں کے لئے خالق کائنات کے لامحدود علم اور اس کی عظمت و

قدرت کے مطالعہ کا بہترین وسیلہ بنیگا۔

ہم ان چھوٹے موجودات کو تین گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

اول: وہ زندہ موجودات جو بہت چھوٹے لیکن انہیں آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے جیسے چیونٹی اور اس جیسے دوسرے حشرات الارض۔

دوم: بہت چھوٹے جاندار جسے خالی آنکھ سے بغیر آلات کے مدد کے نہیں دیکھا جا سکتا لیکن خاص سائنسی ذرائع (طاقتور مائیکروسکوپوں) سے دیکھے جا سکتے ہیں جیسے بیکٹیریا کے جراثیم اور وائرسی جراثیم۔

سوم: ایسے موجودات جو آلات اور طاقتور الیکٹرانک مائیکروسکوپ سے بھی نظر نہیں آ سکتے لیکن صرف سائنسی تجربوں اور دلیلوں کی بناء پر ان کا وجود ثابت ہوتا ہے اور موجودات کا یہ گروہ ایٹم اور مولیکول کے تحت آتا ہے۔

اب ہم موجودات کے ان ہی تین گروہوں کے بارے میں تحقیقات کرینگے اور خدائے تعالیٰ کے توحیدی نکات و اسرار کا اور نظم و نسق کا مطالعہ کریں گے۔

حصۂ اول

چھوٹے حشرات الارض

چھوٹے جانداروں کے عالم کا مطالعہ مفکر انسان کے لئے واقعی قابل توجہ ہے ایک بڑے جانور جیسے گھوڑے یا ہاتھی کا مشاہدہ انسان کے تجسس کے جذبہ کو اتنا متحرک نہیں کرتا جس قدر ایک چیونٹی کا چھوٹا اور مختصر سا جسم خصوصاً زندگی بسر کرنے کے متعلق بڑے حیوانات کی کارکردگی کا اس چھوٹی سی چیونٹی کے کاموں میں بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور یہ بات طبیعی ہے کہ یہ موضوع انسان کو اس بات پر بہت زیادہ آمادہ کرتا ہے کہ وہ ان چھوٹے جانداروں کے بدن کی مشنری کی نازک ساخت اور اس کی کارکردگی کے متعلق اور ان کے زندگی بسر کرنے کے طریقوں کے بارے میں غور کرے۔ یہ بات نہایت ہی اہم اور ساتھ ساتھ بہت دل خوش کن بھی ہے کہ کئی سائنسدانوں نے اپنی عزیز اور گراں مایہ زندگی کے کئی سال اس کام میں صرف کر کے اور بہت زیادہ کوشش سے ان کے حیرت انگیز اسرار اور کافی سائنسی معلومات حاصل کی ہیں[1]

اگر چہ کہ جو چھوٹے جاندار اور آنکھ سے دیکھے جاتے ہیں وہ تمام جثۂ بدنی ساخت اور زندگی گزارنے کے طریقوں میں یکسانیت نہیں رکھتے اور ان میں بعض ایسے بھی ہیں جنھیں بغیر آلات کے استعمال کے ننگی آنکھ سے بمشکل دیکھا جا سکتا ہے اور ان میں سے بعض ایسے ہی جن کی زندگی بڑی پیچیدہ ہے اور وہ وسیع اجتماعی حالت میں زندگی گزارتے ہیں اور ان کے گروہ حیرتناک نظم و ضبط کے پابند ہوتے ہیں[1] اور اس کے مقابلے میں بعض کی زندگی نہایت سادہ اور بغیر کسی لوازمات کے ہوتی ہے۔

لیکن ہر حال میں وہ تمام زندگی کے آثار و خواص سے پوری طرح بہرہ مند ہیں اور وہ زندگی سے متعلق قوتوں اور وسائل اور کارگزاریوں کے ایک سلسلہ کے مالک ہیں جن کا وجود ہر جاندار کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ [2] ان کی اعلیٰ درجہ کی قسمیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ جنبش اور حرکت کرنے کا ذریعہ

ایک مخصوص حرکت جو تمام حیوانات میں پائی جاتی ہے وہ وسیلوں کی محتاج ہے کیونکہ مختلف قسم کے حیوانات میں اس حرکت کی کیفیت و کمیت میں فرق ہوتا ہے۔ لہٰذا ''سلسلہ اعصاب'' کی مشنری اور دوسرے مخصوص اعضاء جو حرکت کے وسائل و عوامل سمجھے جاتے ہیں تمام (حیوانات) میں یکساں نہیں ہیں اس کے باوجود تقریباً تمام حیوانات کو یہ وسائل مہیا ہیں یعنی سلسلۂ اعصاب کی حیثیت مواصلاتی لائن کی ہے جو اپنے مخصوص مراکز کی حرکتوں پر کنٹرول کرتے ہیں۔

۲۔ مادہ اور قوت میں تبادلہ کا ذریعہ

ہر جاندار اور جنبش اور حرکت کرنے کے لئے قوت اور طاقت کا محتاج ہے اور زندگی کے افعال کی

---

[1] [Andromede]

انجام دہی کے لئے اپنے بدن کے کچھ مواد کو صرف کرتا ہے اور جس طاقت کی اس کو ضرورت ہے وہ اسے اس ذریعہ سے حاصل کر لیتا ہے اور جو چیز ہاتھ سے نکل گئی ہو یا فرسودہ ہوگئی ہو اسے از سرِ نو حاصل کرتا ہے۔

اس لئے تمام جاندار ایسی مشنری کے محتاج ہیں جو لازمی مواد کے پانے کے بعد اپنے ہاتھ سے نکلی ہوئی طاقت کو دوبارہ حاصل کر سکیں اور اس طاقت کے ایک حصہ کو زائل شدہ طاقت کی بحالی پر صرف کر سکیں۔

البتہ زائد مواد جو ان تغیرات کے بعد باقی بچ جائے اسے جاندار کے بدن سے خارج ہو جانا چاہئے۔ اس مجموعی مشنری کو ہاضمہ کی مشنری کہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ مشنری بعض حیوانات میں زیادہ مکمل اور زیادہ آراستہ ہوتی ہے اور اس میں بھی کئی حصے ہوتے ہیں اور ہر ایک کے ذمہ ایک علیحدہ کام ہوتا ہے۔ ہضم کا عمل مادہ کا جذب ہونا اور قوت میں تبدیل ہونا اور ضروری طاقت اور قوت مدافعت کا پیدا ہونا ان میں سے ہر ایک کام ایک خاص اور جداگانہ مشنری کے ذریعہ انجام پاتا ہے لیکن بعض دوسروں میں یہ عمل بالکل سادہ ہوتا ہے اور یہ تمام کام ایک چھوٹی مشنری کے توسط سے انجام پاتے ہیں۔

۳۔ افزائش نسل

حیوانات خواہ کسی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں وہ مخصوص شرائط اور عوامل کے تحت زندگی بسر کرتے اور کچھ مدت کے بعد مر جاتے ہیں لہٰذا اپنی نسل کی بقاء کے لئے انہیں (اپنے جیسے کے پیدا ہونے) کی ضرورت ہوتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو اس حیوان کی نسل ختم ہو جائے گی کیونکہ علوم طبیعی نے ثابت کر دیا ہے کہ کسی قسم کے حیوان کی نسل اس قسم کے حیوان کے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔

بعض حیوانات اپنی بقاء نسل کے لئے انڈے دیتے ہیں اور بعض بچے دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ جاندار جو صرف ایک خلیہ رکھتے ہیں وہ بھی یہ کام بذریعہ تقسیم انجام دیتے ہیں اور ہر حال میں خواہ وہ جاندار کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو اپنی نسل کی بقاء ضروری جانتا ہے[1]

رابطہ کی مشنری

حیوانات کے عام لوازمات میں سے یہ بات بھی ہے کہ وہ سب اپنے ماحول کے باہر سے رابطہ رکھتے ہیں۔ یہ رابطہ ایک خاص مشنری یعنی حواس کے ذریعے سے برقرار رہتا ہے اور حیوان اس کے توسط سے اپنے اطراف کی باتوں کو سمجھ سکتا ہے۔

مختلف حیوانات میں احساس کرنے کی کیفیت اور صلاحیت بھی مختلف ہوتی ہے کیونکہ بہت سے حیوان ایسے ہیں جن میں سونگھنے کی صلاحیت نہیں ہے اور بعض ایسے ہیں جن میں بینائی نہیں ہوتی بر خلاف اس کے بعض حیوانات میں یہ قوت بہت زیادہ ہوتی ہے اور وہ پوری طرح تمام ساز و سامان سے آراستہ ہوتے ہیں لیکن بعض میں یہ باتیں ہی ضعیف اور کمزور ہوتی ہیں۔

البتہ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے سب حیوانات کا اوپری حصہ ایک جیسا ہے لیکن چھوٹے جانداروں میں عام طور سے یہ بہت سادہ اور انسانوں اور بڑے حیوانوں کی طرح مکمل اور قسم قسم کا نہیں ہے۔

اب ہم اوپر کے حصے کو دیکھ کر یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ بہت چھوٹے جاندار بھی مختلف اعضاء اور مختلف مشنری رکھتے ہیں۔ یہ چھوٹے اعضاء اور چھوٹی مشنری بھی اپنے مقام پر ایک عجیب اور نازک عمارت ہے۔ ان چھوٹے جانداروں کے اندر جو بمشکل آنکھ سے نظر آ سکتے ہیں ان مشنریوں کا اجتماع قابل توجہ ہے اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے بارے میں یہ مشنریاں عجیب و غریب نظر آتی ہیں حتیٰ کہ بعض لحاظ سے وہ ہم سے (یعنی بنی نوع انسان سے) بھی زیادہ کامل ہیں۔

اب ہم نمونہ کے طور پر اس ہی سے کچھ آپ سے سامنے پیش کرتے ہیں:

مصر کا مشہور سائنسدان طنطاوی[1] چھوٹے حیوانات و عجائبات کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالتا ہے کہ منجملہ ان کے ''بروان'' یونیورسٹی کے استاد پروفیسر ''باکرد'' نے اپنی کتاب ''حشرات شناسی'' میں یہ بات نقل کی ہے کہ: حشرات کو تین چشم بسیط (تین عدد آنکھیں کہ سب ایک سطح پر واقع ہوتی ہیں) اور دو آنکھیں مرکب ہوتی ہیں جن میں سے ہر ایک آنکھ میں کئی کئی آنکھیں تشکیل پاتی ہیں۔

''ٹیسپریا'' کے نام سے موسوم ہونے والے کیڑے میں ان آنکھوں کی تعداد ۱۲۱ اور چیونٹی میں ۲۰۰

سے ۲۰۰ تک ہوتی ہے۔اور اسفنکس کونفونغولائی "نامی کیڑے میں جو چگاڈر اور آفت روئی کے لئے مصیبت ایک کیڑا کا ہم شکل ہے اس میں حیرت انگیز یعنی ۲۷ ہزار کی تعداد میں آنکھیں ہوتی ہیں [۱]

واضح رہے کہ عالم نباتات میں بھی بعض بہت زیادہ چھوٹی بوٹیاں نظر آتی ہیں کہ ان کی باریک اور نازک ساخت بہت زیادہ دلچسپ اور قابل حیرت ہے [۲]

اس بحث کا نتیجہ

موجودات کے اس گروہ کی ساخت ہمیں بڑے دلچسپ معلومات فراہم کرتی ہے اور اس سے سرچشمۂ حیات کی جانب ہماری رہبری کرتی ہے جس کی قدرت اور بے پایان علم سے یہ تمام کائنات وجود میں آئی ہے۔

ہم نے اپنے مطالعات کے ضمن میں مشاہدہ کیا ہے کہ ایک چھوٹا سا حیوان جو بمشکل آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے اس کی ساخت میں کس قدر مختلف مشنری ہوتی ہے اور اس کے زندہ رہنے کے وسائل کتنے مختلف ہوتے ہیں جو اس جاندار کو زندگی بسر کرنے میں مدد دیتے ہیں۔یہ اعضاء اور ذرائع اگر چہ بہت چھوٹے اور باریک ہیں لیکن ان کی ساخت میں عجیب باریکی اور عجیب نظم سے کام لیا گیا ہے یہاں تک کہ بحث کے آغاز میں دیے ہوئے گزشتہ بیانات کے خلاصہ سے اس بات کا قطعی کوئی امکان باقی نہیں رہتا کہ یہ تمام چیزیں بے شعور اسباب و حادثات کی بناء پر وجود میں آئی ہونگی بلکہ جیسا کہ بیان کیا

---

[۱] [یہ بات نہ بھولنی چاہیئے کہ ہمارا یہ مطالعہ صرف خشک بحثوں کے لئے نہیں ہے بلکہ ہمارا مقصد ان بحثوں سے بہت زیادہ اعلیٰ وارفع ہے۔ہم چاہتے ہیں کہ اس دنیا کے بارے میں جن چیزوں کا علم طبعیات کے ذریعہ سے انکشاف ہوا ہے اس کا "خداشناسی" کے لحاظ سے تحلیل وتجزیہ کر کے ثابت کریں کہ ان ہی تحقیقات کے ضمن میں ایک ایسے دقیق اور حیرت انگیز نظام کا پتہ چلا ہے جو دنیا پر حکومت کرتا ہے اور یہی بات اس امر کی دلیل ہے اور وہی سرچشمۂ قدرت ہے۔اگر چہ کہ اس علم کے بعض محقق اور دانشور اس روشن حقیقت سے چشم پوشی کرتے ہیں اور ان کے واضح توحیدی نشانات سے صرف نظر کر لیتے ہیں۔البتہ ان روشن حقائق کے سامنے ان کی غفلت کے اسباب کے بارے میں مادہ پرستوں کے اشکالات کے بیان میں ہم اس موضوع پر کافی بحث کرینگے]

گیا ہے کارخانہ عالم کے اس چھوٹے سے حصہ کے مطالعہ سے جو درس ہم حاصل کر سکتے ہیں وہ توحید کی بڑی نشانیوں اور افلاک کے عظیم عالم کے مطالعہ سے بھی زیادہ واضح اور روشن ہے کیونکہ جو مخلوق جس قدر زیادہ چھوٹی اور زیادہ باریک ہوگی اسی قدر اس میں زندگی کا نظام باریک اور مشکل ہوگا بلکہ اتنی چھوٹی چیز کے بطور حادثہ وجود میں آجانے کا امکان صفر کے برابر ہے۔

حصۂ دوم

وہ حیوانات جو خوردبین سے نظر آسکتے ہیں

چھوٹے موجودات کی ایک عظیم دنیا

مشہور ہے کہ سو سال پہلے تک انسان ان جانداروں کے وجود کے بارے میں صحیح معلومات نہ رکھتا تھا جو آنکھ سے نظر نہ آتے تھے اور پہلا شخص جس نے اس راز پر سے پردہ اٹھایا وہ فرانس کا مشہور کیمسٹ "پاستور" (۱۸۲۱۔۱۸۹۵) تھا جس نے اپنے تجربوں اور علمی تحقیقات سے ان حیوانات کا پتہ چلایا جنھیں خوردبین سے دیکھا جا سکتا ہے [۱]

جانداروں کا یہ گروہ اگر چہ کہ وافر تعداد میں ہوا میں، پانی میں اور مختلف ٹھکانوں میں زندگی بسر کرتا ہے لیکن بغیر آلات کے ننگی آنکھ سے بالکل نظر نہیں آسکتا۔لیکن جب ہم مائیکروسکوپ کے ذریعہ پانی کے ایک قطرہ کو دیکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بڑا تالاب ہے (ان کے لحاظ سے) جس میں وہ تیر رہے ہیں اور اس وسیع اور اس کشادہ پانی کے اندر وہ شور وغوغا اور آفت مچائے ہوئے ہیں۔

بیکٹیریا اور وائرس (جراثیم)

ان میں سے کچھ جاندار یعنی (بیکٹیریا کے جراثیم) معمولی مائیکروسکوپوں سے جو اجسام کو کئی ہزار گنا بڑا کر کے دکھاتے ہیں قابل ملاحظہ ہیں۔اور ان کا دوسرا گروہ (یعنی وائرس) قوی ترین مائیکروسکوپوں سے بھی نظر نہیں آتا بلکہ انہیں خاص ذرائع سے یعنی الیکٹرونیک مائیکروسکوپ سے دیکھنا پڑتا ہے تب وہ نظر آتے ہیں۔

بیکٹیریا کے جراثیم کی جسامت

بیکٹیریائی جراثیم کی جسامت کا اندازہ کرنے کے لئے ایک خاص اکائی کا انتخاب کیا گیا ہے جو ۱۰۰۰/۱ ملی میٹر کے برابر ہوتی ہے جسے "مائیکرون" کا نام دیا گیا ہے یعنی اس حقیر ملی میٹر کو ۱۰۰۰ سے تقسیم کریں تو اس کا ایک حصہ ایک مائیکرون کہلائے گا۔ چونکہ بیکٹیریائی جراثیم اس قدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ معمولی پیمانے ہمارے ضرورت پورا کرنے کے لئے اور ان کے جثہ اور جسامت کو ناپنے کے لئے ناکافی ہیں مثال کے طور پر اگر ان جانداروں میں سے دو ہزار کو لے کر سپاہیوں کی طرح ایک صف میں کھڑا کر دیں تو اس طولانی صف کی لمبائی ایک ملی میٹر ہوگی۔ اس کے مشاہدہ کے لئے ہمیں بہت غور سے دیکھنا پڑیگا اور آنکھوں کو خوب کھولنا پڑے گا اور اپنے کو اس صف سے بہت قریب کرنا پڑے گا تب کہیں جا کر وہ ہم کو ایک جسم واحد کی طرح نظر آئیں گے۔

یہ بات بالکل اس بات کے برعکس ہے جو عالم بالا کے عظیم ستاروں اور آسمانوں کے مطالعہ کے وقت ہمیں درپیش تھی کیونکہ وہاں ان کے بڑے پن کی وجہ سے ہمارے معمولی پیمانے ناکارہ ہو رہے تھے اور یہاں ان کے چھوٹے پن کی وجہ سے (لہٰذا جس طرح عالم افلاک میں ان کی غیر معمولی عظمت اور بڑے پن کی وجہ سے معمولی پیمانے اور اکائیاں دقیق حسابات کے سلسلے میں ناکام ہو گئے تھے اس لئے ہم کو مجبوراً ایسے فاصلے کو جسے نور ایک سال میں طے کرتا ہے اکائی قرار دینا پڑا اور اسے ہم نے نوری سال کا نام دے کر آسمانی فاصلوں کے حساب کے لئے استعمال کیا لیکن یہ اکائی اس لحاظ سے کہ نور ایک سیکنڈ میں ۳۰۰ ہزار کلیومٹر کا فاصلہ طے کرتا ہے معمولی حساب سے یہ ہوشربا فاصلہ ۹,۴۶۵,۶۰۰,۰۰۰,۰۰۰ کلومیٹر ہوگا)۔

بیکٹیریائی جراثیم کی جسامت ۱۰/۱ مائیکرون سے چند مائیکرون تک ہوتی ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہئے کہ جو قوتیں اور جو ذرائع زندگی کے اعمال اور آثار کو انجام دیتے ہیں وہ قوتیں بھی ان ہی بہت چھوٹے اجسام میں پوشیدہ ہیں۔

ماشاءاللہ ان کی افزائش نسل

بیکٹیریائی جراثیم میں تولید نسل کی داستان بھی اس بے انتہا چھوٹی دنیا کے حیرت انگیز بھیدوں میں سے ایک بھید ہے۔

یہ درست ہے کہ بیکٹیریائی جراثیم ہرگز جفتی اور ازدواج نہیں کرتے لیکن ان کا تولید نسل کا معاملہ عجیب تیزی سے "تقسیم" کی رو سے انجام پاتا ہے۔ اس ترتیب سے ہر بیکٹیریا جرثومہ جس وقت نشو ونما پا لیتا ہے تو اس کی کمر میں شکستگی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ جھکاؤ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور یہ تقسیم شدہ دو ٹکڑے پھر ایک ایک بیکٹیریائی جرثومہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور پھر ان دونوں میں سے ہر ایک اپنے وقت پر نشو ونما پا کر اور بالغ ہو کر دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور اسی ترتیب سے یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

عام حالات میں ہر بیکٹیریائی جرثومہ ہر آدھے گھنٹے میں کافی حد تک نشو ونما پا کر اپنا مثل پیدا کر دیتا ہے اب اگر ایک عدد بیکٹیریائی جرثومہ کو مناسب احاطہ میں (مثلاً دودھ میں) ڈال دیں تو وہ آدھے گھنٹے کے بعد دو بیکٹیریائی جرثومہ میں تقسیم ہوتا ہے۔ اور ہر آدھے گھنٹے کے بعد ان کی تعداد میں مزید دگنی ہو جاتی ہے اور اس حساب سے اس ایک بیکٹیریائی جرثومہ کی تقسیم سے حاصل شدہ بیکٹیریائی جراثیم کی تعداد پہلے ۲۴ گھنٹوں میں ۱۰۰ ہزار ارب سے بھی زیادہ ہو جائے گی[1] حالانکہ ان تمام بیکٹیریائی جراثیم کا مجموعی حجم ۱۰۰ مکعب سنٹی میٹر ہوگا۔[1]

اب ہم اسی ترتیب سے آگے بڑھیں تو ۴۸ گھنٹوں میں ان بیکٹیریائی جراثیم کی تعداد ایک مربع کلومیٹر تجاوز کر جائیں گی اور دو تین روز گزرنے پر (ہاں فقط دو تین روز بعد) ان کی تعداد بڑھ کر زمین

---

[1] بعض سائنسدانوں نے اس قسم کے حیوانات کے بدنوں کی ساخت کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے علاوہ ان کی زندگی بسر کرنے کے طریقوں کو بھی اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا ہوا تھا۔ ان سائنسدانوں میں "میشلہ"، "لوودیگ" جرمنی کے "شخر" اور قدیم فلسفی "ارسطو فانوس" اور فن لینڈ کے "کلوئیوس" اور ہالینڈ کے "سوبردان" اور فرانس کے "روسوز" اور فرانسوا ہوبر" اور آخر میں مشہور ادیب "موریس متر لینگ بلو یکی" امریکا کے اور فرانک الیوارے کا نام لیا جا سکتا ہے۔]

کے حجم کے برابر ہو جائے گی لیکن آپ گھبرائیں نہیں کیونکہ جیسا ہم آگے بتائیں گے ان کی افزائش نسل اس قدر نہیں ہوتی اور ہمیشہ رکاوٹیں پیش آتی ہیں کہ ان کی اس افزائش نسل کا سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد رک جاتا ہے۔

حساب تصاعدی

جاننا چاہئے کہ یہ بیکٹیریائی جراثیم کی ہوش ربا افزائش حساب تصاعدی کی وجہ سے ہے کیونکہ ہر دفعہ موجود عدد دگنا ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کو معمولی جمع اور ضرب کا حساب نہ سمجھنا چاہئے۔

اب مزید وضاحت کے لئے حساب تصاعدی سے اعداد کس طرح تیزی سے بڑھتے ہیں اس کو

[۱۔ چھوٹے حیوانات میں چیونٹیاں عجیب اجتماعی حیثیت رکھتی ہیں کہ بلاشک ان کی اجتماعی زندگی کا مطالعہ انسان کو گہری حیرت میں ڈال دیتا ہے اسی طرح جنگلی شہد کی مکھیاں اگرچہ وہ تنظیم اور زندگی گزارنے کے طریقہ کار کے لحاظ سے گھریلو شہد کے مکھیوں کے پایہ کو نہیں پہنچ سکتیں لیکن وہ بھی نظم و نسق کی پابند ہیں اور اچھی سمجھ بوجھ کی مالک ہوتی ہیں۔ قارئین کرام مزید معلومات کے لئے مترلینک کی دو مشہور کتابوں "مورچگان (چیونٹیاں)" اور "زنبور عسل (شہد کی مکھی)" کا مطالعہ کر سکتے ہیں جو چھپ چکی ہیں اور وہ ان دو عجیب جانداروں کے بارے میں ہی ہیں]

۲۔ [حیات کے معنی اور زندگی کی حقیقت کا شمار ان معموں میں ہوتا ہے جسے حل کرنے میں بشری عقل اور سائنس نے آج تک کامیابی حاصل نہیں کی۔ فزیالوجی کا فرانسیسی ماہر "کلوڈ برنارڈ" کہتا ہے: "زندگی کی تعریف نہیں کی جا سکتی بلکہ ہم اسے علامتوں اور آثار سے پہچانتے ہیں یعنی ذی حیات کو غیر ذی حیات سے ممیز کر سکتے ہیں"۔

زندہ موجودات کے تشخص اور ان کی حیات کی علامت کے طور پر ہم حسب ذیل چیزوں کا نام لے سکتے ہیں جنہیں زندگی کے آثار اور حیات کی علامت سمجھا جاتا ہے:

(۱) تنفس (۲) مادہ اور طاقت کا تبادلہ (۳) افزائش نسل (۴) عوامل خارجی کے اثرات کو قبول کرنے اور رد کرنے کی صلاحیت (۵) مادہ سازی (۶) تحلیل ہونے والے مادہ کی حفاظت (۷) مخصوص کیمیائی مرکب (۸) نشو و نما کا عمل ہونا (۹) بناوٹ کی پیچیدگی (۱۰) اضمحلال اور بڑھاپا]

شطرنج کے موجد کی داستان کے ذریعہ سنئے:

مشہور ہے کہ شطرنج کے بانی اور موجد نے جس وقت اس مشہور کھیل اور ۶۴ خانوں کے ایک کاغذ پر مکمل کیا اور بادشاہ وقت کو اس کی اطلاع دی۔ بادشاہ نے اس سلسلہ میں حکم دیا کہ اس کے لئے اس کی حسب خواہش انعام دے دیا جائے۔ اس نے اس پیش نہاد کے بعد نہایت لاپروائی سے کہا: میں کچھ نہیں چاہتا لیکن بادشاہ اس قدر رحم مرحمت فرمادیں کہ ایک گندم کا دانہ پہلے خانہ میں رکھا جائے اور دوسرے خانہ میں اسے دگنا کر کے رکھا جائے اور اسی ترتیب سے ہر ایک خانے کے بعد دوسرے خانے میں اس تعداد کو دگنا کر لیا جائے۔ بادشاہ پہلے تو اس پیش نہاد سے جو بظاہر بہت احمقانہ اور معمولی نظر آ رہی تھی بہت خوش ہوا لیکن جب بعد میں اس کا ٹھیک ٹھاک حساب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ نہ صرف یہ کہ اس کی پیش نہاد احمقانہ نہ تھی بلکہ شاید بادشاہ خود اس قدر عظیم انعام دینے سے عاجز تھا کیونکہ اگر چند کلومیٹر مربع زمین کو گندم سے بھر دیں تو اس کا حساب نہیں کیا جا سکتا۔

آپ بھی اگر اس موضوع میں کچھ شک و شبہ رکھتے ہوں تو آپ بھی حساب کر لیجئے یعنی ایک کے عدد کو ۶۴ دفعہ دگنا کرتے جائیں آپ ملاحظہ کریں گے کہ یہ اتنا بڑا عدد ہو گا جس سے آپ کا سر چکرا جائے گا۔

ضبط تولید

لیکن اس کے باوجود یہ نہ بھولنا چاہئے کہ یہ عجیب پیدائش اور افزائش نسل صرف موافق حالات میں اور کوئی رکاوٹ نہ ہونے کی صورت میں ہوتی ہے اور ان عام حالات میں جن میں رکاوٹیں بہت زیادہ ہوتی ہیں بیکٹیریائی جراثیم کے لئے اس قدر کثیر تعداد میں افزائش نسل کرنا ممکن نہیں ہے اور ہمارے کلمہ "بشرطیکہ" اور "اگر" کو جو ہم نے حساب کی ابتداء میں کہا تھا نہ بھولنا چاہئے۔

جو کچھ بیان کیا گیا وہ فرضی تھا صرف غیر معمولی حالات میں ایسا ہو سکتا ہے ورنہ عام حالات میں ایسا ہونا ناممکن ہے اور ایسے بہت سے اسباب اور رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں جن سے بیکٹیریائی جراثیم کی پیدائش بند ہو جاتی ہے اور وہ نابود ہو جاتے ہیں اور اس تباہی کو لانیوالا عامل خود بیکٹیریائی جراثیم ہی کو

سمجھنا چاہئے کیونکہ وہ خود اپنے بڑے دشمن ہیں اور خود ایک دوسرے کو ختم کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

یہ چھوٹے جراثیم کس قدر مفید ہیں

بیکٹیریائی جراثیم کے بدن کی ساخت نہایت ہی پر اسرار طریقہ پر ایک حصہ پانی اور مختلف قسم کے نمکوں سے وجود میں آتی ہے اور ان کی زندگی کی کارکردگی خصوصاً تغذیہ اور تنفس دوسرے اسرار آمیز نکات ہیں جو قابل مطالعہ اور قابل غور ہیں۔

ہاں یہ تمام جہتیں اور یہ تمام نکات اس جاندار کے وجود میں چھپی ہوتی ہیں جو سر سے پیر تک صرف ۱/۱۰۰۰ ملی میٹر یا اس سے بھی کم ہوتا ہے لیکن جو کچھ ہمارے موضوع سے متعلق بحث کے لحاظ سے قابل

[1] [ہم سب سمجھتے ہیں کہ حیوانات جیسے کیڑے مکوڑے، بھڑ اور چیونٹیاں اور مچھلیاں وہ جاندار جو خشکی اور تری دونوں میں (جیسے مینڈک وغیرہ) ہیں انڈے دے کر اپنی نسل بڑھاتے ہیں اور دوسرے جانور جیسے گھوڑے، بھیڑ، بندر وغیرہ بچے دے کر اپنی نسل بڑھاتے ہیں۔ لیکن قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان دونوں قسموں میں افزائش نسل ایک قسم کے نر اور دوسری قسم کی مادہ کے میل سے ہی پیدا ہوتی ہے اس نر کو "اسپرماتوزوئید" اور اس مادہ کو "اوول" کہتے ہیں اور ان دو علیحدہ قسموں کے ملنے سے جو جنسی وجود میں آتی ہے وہ مسلسل تقسیم ہو کر اور مختلف مرحلوں سے گزر کر اس جاندار جیسی ہو جاتی ہے جو انڈے دینے والا تھا۔ دراصل گروہ اول کے جانداروں میں اس عمل کی تکمیل جاندار کے جسم سے باہر عمل میں آتی ہے لیکن دوسرے گروہ کے جانداروں میں اس کی تکمیل بچہ دانی کے اندر ہوتی ہے۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض جاندار تناسل کے دونوں ہی اعضا اپنے اندر رکھتے ہیں اور ان میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ اپنی جنس سے ہٹ کر دوسری قسم کی نسل پیدا کریں۔ جونک یا اسی قسم کے نرم جسم رکھنے والے جاندار اور بعض دوسرے جاندار جو زیادہ تر حشرات الارض میں سے ہوتے ہیں وہ انڈے دیتے ہیں جو بغیر نر و مادہ کے میل کے وجود میں آتے ہیں اور ان انڈوں سے اسی جیسے جاندار پیدا ہو جاتے ہیں لیکن یہ حیوانات جن کو اصطلاح میں دو جنسی کہتے ہیں ان میں ایک تو یافتۂ نر پیدا کرتا ہے اور دوسرا یافتۂ مادہ۔ اپنی جنسی اولاد کی پیدائش ہمیشہ نر و مادہ کی جفتی کے ذریعہ عمل میں آتی ہے جس کے ذریعہ ان کے انڈے پیدا ہوتے ہیں اور انڈے ایک خاص مرحلے سے گزر کر نر یا مادہ جاندار کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس موضوع کی زیادہ وضاحت انشاء اللہ "تولید مثل انسان" (انسان کا اپنا جیسا پیدا ہونا) کے باب میں بیان کی جائے گی]

توجہ بات ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں جاننا چاہئے کہ یہ نظر نہ آنے والے حیوانات کا گروہ جس کو بیکٹیریائی جراثیم کہتے ہیں وہ کس کام آ سکتے ہیں؟ اور اس وسیع عالم کائنات میں اور اس زندگی کے شور و غوغا میں ان کا کیا کردار ہے؟ ان کے وجود کا فائدہ اور اثرات کیا ہیں اور سب سے آخری بات یہ کہ ان کی زندگی کی کارکردگی اور طاقت کس کام میں خرچ ہوتی ہے؟ اس سوال کے جواب میں کہا جا سکتا ہے:

بیکٹیریائی جراثیم کے دو گروہ ہیں "تکلیف دہ" اور "بے ضرر" اگر آپ متعجب نہ ہوں تو بتاؤں کہ یہ دونوں گروہ ہمارے نہایت سچے اور مخلص خدمت گزار ہیں اگر آپ کو کچھ شک ہے تو حسب ذیل نکات پر غور کیجئے۔

۱۔ غیبی خدمت گزار اور زحمت اٹھانے والے

بے ضرر بیکٹیریائی جراثیم جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے ہمیں نہ صرف یہ کہ ضرر نہیں پہنچاتے بلکہ رات دن وہ انسانوں اور تمام جانداروں کے لئے مناسب خدمت انجام دیتے ہیں اور اپنی انتھک کوششوں اور زحمتوں سے بلا معاوضہ دوسروں کی خدمت کرتے ہیں[1]۔ غور کیجئے کہ سچ مچ اگر ان تمام ناکارہ چیزوں اور فضلات اور حیوانات کی لاشوں سے یہ دنیا بھر جائے اور یہ صورت مستقل باقی رہے تو اس صورت میں اس سطح زمین کی حالت کس قدر ابتر اور اس پر زندگی بسر کرنا کس قدر دشوار ہو جائے گا۔ اسکے علاوہ معمولاً تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ یہ تمام حیوانات اور نباتات جو اپنی تمام قوتوں کو اپنی زندگی کے مواد سے جیسے نائٹروجن، ہائیڈروجن، آکسیجن وغیرہ فراہم کرنے میں رات دن اور مہینے اور برس صرف کرتے رہتے ہیں اس مدت میں مواد حیاتی کی کمی اور قحط جانداروں کی دنیا کو اس سرے سے اس سرے تک اپنی لپیٹ میں لے لیتی اور تمام جانداروں کی زندگی فنا اور نیستی کی نذر ہو جاتی۔ اب اس ضمن میں انسان کو معلوم ہوگا کہ اس کی ان حادثات سے بھری ہوئی زندگی کس حد تک اس ناقابل دید مخلوق کی

[1] [مصر کے سائنسدان طنطاوی نے "جواہر القرآن" کے نام سے ایک مفصل تفسیر لکھی ہے جو کئی جلدوں میں چھپی ہے۔ تفسیر قرآن کے بارے میں اس کی روش عجیب ہے جیسا کہ وہ اس کے مقدمہ میں لکھتا ہے:

اس کا مقصد جہان ہستی کے عجائبات کی تشریح کرنا ہے لہٰذا جدید علوم طبیعی کی قابل توجہ باتیں اس

مرہون منت ہے اور ظاہری پردوں کو پیچھے رہ کر یہ پوشیدہ مخلوق زندگی کے عوامل و اسباب کی عظیم چرخیوں کو کس طرح گردش دے رہی ہے؟

ہاں یہی نا قابل دید بیکٹیریائی جراثیم زندگی کی یہ دو اہم مشکلات کو حل کرتے ہیں اور اپنی پوری قوت اور طاقت سے ان تمام فضلات اور سڑی ہوئی لاشوں سے' انسانی زندگی کے لوازمات کی افزائش کے لئے فائدہ حاصل کرتے ہیں یعنی یہ بیکٹیریائی جراثیم فضلے اور گندگیوں اور حیوانی لاشوں کو اپنے طبیعی تجربہ گاہوں میں تجزیہ کر کے ان کو ان کی موجودہ شکل سے بدل کر زندگی کے لئے ضروری عناصر جیسے کاربن نائٹروجن' ہائیڈروجن اور آکسیجن میں تبدیل کر دیتے ہیں اور اسی ذریعہ سے نقصان دہ اور فاسدہ مادہ کو دفع کرتے ہیں اور عناصر حیات میں سے جو چیزیں صرف ہو چکی ہوتی ہیں ان کی تلافی کرتے ہیں۔

واقعی ان بیکٹیریائی جراثیم کو کس قدر طاقت فرسا اور پراسرار خدمتیں انجام دینی پڑتی ہیں؟

اس حساب سے زندگی کا ضروری مواد جانداروں کے وجود کی وجہ سے تباہ ہوتا رہتا ہے لیکن دوسری

میں درج کی گئی ہیں اور خدا کی نشانیوں کے نکتوں کی اس میں تشریح کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان عجیب باتوں کی طرف توجہ کرنے سے جو علوم طبیعی نے اس سو سال کے اندر مشاہدہ کئے ہیں ان کی تحریرات میں سے کچھ ایسے حصے بیان کئے جائیں گے جو پرانے ہو گئے ہیں اور اپنی اہمیت زائل کر چکے ہیں]

۱۔ [''موریس متر لینگ'' اپنی مشہور ''زنبور عسل'' نامی کتاب میں لکھتا ہے: شہد کی مکھیوں کی ایسی آنکھوں کے علاوہ جن میں سے ہر ایک پر چھ سات ہزار آنکھیں ہیں وہ مزید تین آنکھیں بھی اپنی پیشانی پر رکھتی ہیں جو ہر ایک' ایک بڑے دائرے پر مشتمل ہے جن سے وہ چیزوں کو دیکھتی ہیں اور ہم ان چیزوں سے اب تک نا واقف ہیں]

[۲۔ عالم نباتات بھی اس عالم کائنات کے پراسرار گوشوں میں سے ایک دوسرا گوشہ ہے کہ جس کا مطالعہ توحیدی نظر سے نہایت دلچسپ اور مسرت انگیز ہے لیکن افسوس کہ ہماری یہ محدود کتاب اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اس کی عجیب و غریب تحقیق و تشریح میں جائیں بلکہ ہم اسے اجمالاً بھی بیان نہیں کر سکتے اس لئے ہم اس کے صرف چند اہم نکتوں پر اکتفا کرتے ہیں:

عالم نباتات میں بھی عالم حیوانات کی طرح ایک مکمل قوانین کا سلسلہ ہے کہ عام نباتات اس سے

طرف ایک منظم ادارہ اس چیز کو دوبارہ تیار کر کے حوالہ کرتا جاتا ہے۔ حقیقت میں زندگی کے لازمی عناصر ایک مقررہ اندازہ کے مطابق ہمیشہ کرۂ زمین پر انبار کی صورت میں پڑے رہتے ہیں اور ایک مقررہ گردش اور چند مراحل طے کرنے کے بعد پہلی حالت پر واپس آ جاتے ہیں اور اس ذریعہ سے زندگی کی وہ دو مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ زندگی کا چرخہ ہمیشہ چلتا رہتا ہے لیکن یہ بات کسی حال میں بھی نہ بھولنی چاہئے کہ اس حیرتناک اسٹیج کے ہیرو وہی بیکٹیریائی جراثیم ہیں جنھیں ہم کبھی نہیں دیکھ سکتے (یہ بھی ہماری خوش قسمتی ہے اور ہمیں شکر ادا کرنا چاہئے کہ وہ ہمیں نظر نہیں آتے کیونکہ یہ نئی بستیاں بسانے والا انسان جو تمام موجودات پر تصرف حاصل کرنے کا خواہشمند ہے اور اسے اپنے آئندہ نفع و نقصان کی کوئی فکر نہیں ہے ممکن ہے ان کو دیکھنے کی صورت میں ان کے کاموں میں مخل ہوتا اور ان کے کاموں میں رکاوٹ ڈال دیتا۔

نقصان دہ جراثیم

۲۔ بیکٹیریائی جراثیم کا ایک دوسرا گروہ ہے جن کا وجود نقصان دہ ہے اور ان سے گوناگوں امراض پیدا ہوتے ہیں اور یہ وہ بیکٹیریا ہیں کہ جس وقت مائیکروب کا نام لیا جائے تو ہماری محدود نظر بھی بہت کچھ دیکھ سکتی ہے۔

مائیکروب (جراثیم) بھی کئی قسم کے ہیں اور ان کی ہر ایک قسم ایک خاص بیماری پیدا کرتی ہے اور اسے اسی مرض کا جرثومہ سمجھا جاتا ہے مثلاً مائیکروب وبا (وبائی امراض کا مائیکروب) مائیکروب خسرہ (خسرے کا مائیکروب) مائیکروب سل (مرض سل کا مائیکروب) وغیرہ......

مختلف مائیکروب ہوا میں' سڑی ہوئی غذا میں اور گندی جگہوں میں زندگی بسر کرتے ہیں اور مختلف

بہرہ مند ہیں اور ان کی ساخت میں وہ پوری طرح موجود ہے۔ کاربن کا حاصل کرنا' سانس لینا' پانی کا تبادلہ' مواد غذائی کا جذب کرنا اور اس سے غذا حاصل کرنا' غذائی مواد کا ذخیرہ کرنا' زائد مواد کو بذریعہ ترشح خارج کر دینا اور اپنی جنسی پیدائش اور پھل کا دینا یہ باتیں تمام دنیا کے نباتات میں اس اسرار آمیز منظم اور باریک مشنری کے ذریعہ سے انجام پاتی ہیں]

طریقوں سے جسم کے سامات میں سے انسانوں اور تمام حیوانوں کے جسم کے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور کسی حیوان کا بدن ان کے حق میں مفید ہو اور کوئی رکاوٹ نہ ہو تو تیزی کے ساتھ نشو و نما پا کر اور اپنی نسل بڑھا کر اس کو مرض میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اور یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ اب ان جانداروں کے جسم میں ان جراثیم کے ہونے کا پہلے سے پتہ لگایا جا سکتا ہے اور اب ایسے بہترین ذرائع فراہم کر لئے گئے ہیں کہ ان کی وجہ سے مائیکروبوں کی افزائش رک جاتی ہے اور وہ ناکارہ بنا دیئے جاتے ہیں۔

جسم کے اندر خونین جنگ

جس وقت مائیکروبوں کی ایک خاص تعداد کسی خراش کے راستے سے یا پانی یا ہوا کے ذریعہ سے جسم کے اندر داخل ہو جاتی ہے ل تو بدن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نشو و نما پاتے ہیں اور اپنے جیسے جراثیم کو

ل [آج سے صدہا سال پہلے جبکہ پاستور پیدا بھی نہیں ہوا تھا ہمیں اپنے دین کو صحیح معلومات کی بنیاد پر یہ بات معلوم تھی اور ہمارے دینی پیشواؤں نے ہمیں ان چھوٹے حیوانات کے بارے میں بتا دیا تھا جسے آج خوردبین کی مدد سے دیکھا جا رہا ہے۔ مشہور شیعہ سائنسدان "کلینی" نے اپنی مشہور کتاب "کافی" میں یہ روایت نقل کی ہے کہ امام ہشتم امام رضا - اپنے دوستوں میں سے ایک دوست "فتح ابن یزید جرجانی" سے فرمایا تھا: "جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو میں خدائے لطیف کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ خدا کو اپنی چھوٹی مخلوقات کا بھی علم ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ چھوٹی اور بڑی بوٹیوں میں اور چھوٹے حیوانات میں جیسے مچھر اور اس سے چھوٹی اور اس سے بھی چھوٹی مخلوقات میں خدا کی آفرینش کی نشانیاں موجود ہیں۔ وہ ایسے جاندار ہیں کہ آنکھ انہیں ہرگز نہیں دیکھ سکتی اور بہت چھوٹے ہونے کی وجہ سے ان میں نہ تو نر و مادہ کی تمیز ہو سکتی ہے اور نہ ہی بچے اور بڑے کی۔ یہ حیوانات سمندروں کی لہروں کی تہ میں اور درختوں کے پوست کے اندر اور بیابانوں میں زندگی بسر کرتے ہیں ......"

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان حیوانات کے بارے میں جو خوردبین سے نظر آ سکتے ہیں ان کے نر و مادہ کے بارے میں اس خیال سے کہ اس قسم کے حیوانات تقسیم کی رو سے اپنی افزائش نسل کرتے ہیں ایسے حیوانات پر نر و مادہ کا اطلاق جیسا کہ اس خبر میں بتایا گیا ہے مبہم معلوم ہوتا ہے لیکن آج بہت زیادہ تحقیقات اور تجربوں کے بعد معلوم ہوا ہے کہ خوردبین سے نظر آنے والے حیوانات بھی دو ممتاز جنسوں میں منقسم ہیں

پیدا کرنے میں پوری تیزی سے مصروف ہو جاتے ہیں لیکن دیر نہیں لگتی کہ جسم کی مسلح طاقتیں دشمنوں کے راستے میں آ جاتی ہیں اور ان کی پیش قدمی کو روک دیتی ہیں۔

سفید جسیمے جو بہت زیادہ تعداد میں خون میں تیرتے رہتے ہیں اور جو جسم کی مدافعت کرنے والے سپاہی اور مسلح طاقت سمجھے جاتے ہیں جس وقت دشمن کے حملے سے آگاہ ہوتے ہیں تو دشمن کے حملہ کرنے کی جگہ پر ہلہ بول دیتے ہیں اور ان مہلک ہتھیاروں سے جن سے وہ مسلح ہوتے ہیں حملہ آوروں کو تباہ کر دیتے ہیں یہ متحرک مدافعت کرنیوالے اپنی جان باقی رہنے تک اپنے عزیز ملک کا دفاع کرتے ہیں اور اس خونین لڑائی میں اپنی جانبازی اور جاں نثاری کا ثبوت دیتے ہیں۔

مائیکرب کو کھا جانا

جس وقت دفاع کرنیوالوں کا پہلا دستہ (خون میں گردش کرنیوالے سفید جسیمے) حملے کی جگہ پر پہنچتے ہیں تو پہلے مائیکروبوں کو کھانا شروع کر دیتے ہیں اور دشمنوں کو اپنے بدن کے ہاضمہ کی مشنری میں روانہ کر دیتے ہیں اور انہیں ہضم کر جاتے ہیں۔

خون کے سفید جسیمے جن کے جسم لیسدار ہوتے ہیں اور ان میں سے لیس ٹپکتا رہتا ہے یہ جسیمے ایک مائیکروب پر حملہ کر کے اسے اطراف سے گھیر لیتے ہیں اور پھر کھا جاتے ہیں۔

زہر پاشی اور دوا سازی

سفید جسیمے مائیکروب کو کھانے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنا مواد بھی جسم سے خارج کرتے رہتے ہیں جو مائیکروبوں کو تباہ کرنے میں کافی اثر انداز ہوتا ہے (یہ بات جاننا چاہیے کہ مائیکروب بھی زہر کا چھڑکاؤ کرتے رہتے ہیں جس سے سفید جسیمے ضائع ہو جاتے ہیں اور حقیقت میں سفید جسیموں کی زہر پاشی کا مقصد ہی مائیکروبوں کے زہر کا مقابلہ اور پیش بندی کرنا ہوتا ہے) اور اسی وجہ سے سفید جسیموں میں زہر سازی کے خلاف اثر انداز ہونے کی صلاحیت ہے جن سے وہ امراض کا مقابلہ کرنے کے لئے

اور ان میں بعض افزائش نسل نہیں کرتے اور قابل تقسیم نہیں ہیں اور ان میں کچھ ایسے ہیں جو مادہ ہیں اور تقسیم کے ذریعہ سے افزائش نسل کرتے ہیں]

انجکشن اور ڈریپ تیار کرتے ہیں۔

انجکشن بیماری میں مبتلا ہونے سے بچاؤ کے لئے ہوتا ہے کہ ابتداءً مائیکروب کمزور ہو کر آنیوالی بیماری کا' جسم میں ٹیکہ لگا دیتے ہیں اور جسم میں ایک کمزوری پیدا کر دیتے ہیں اور پھر اسی کے سبب سے (خون کے) سفید جسیمے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں اور جس شدید بیماری کے آنے کا خطرہ ہوتا ہے اس کی مدافعت کرتے ہیں اور بدن کو اس بیماری میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھتے ہیں۔

لیکن ڈریپ بہت سی بیماریوں کے علاج کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور اسی لئے ہر ایک بیماری کا ڈریپ تیار کر لیتے ہیں وہ اس طرح کہ جب کوئی مائیکروب کسی جاندار کے جسم میں بیماری کا تھوڑا سا انجکشن لگا دیتے ہیں تو اسی وقت خون کے سفید جسیمے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے آجاتے ہیں اور اس زہر کے ازالہ کے لئے ایک قسم کا لیس چھوڑنے لگتے ہیں' اس لیس کو خاص ذریعوں سے جمع کر کے اس بیماری کے ڈریپ کے طور پر بیماروں کو اس کا ٹیکہ لگا دیتے ہیں۔ اور یہ زہر کے خلاف مواد جو مائیکروب کش بھی ہوتا ہے طبیعی طور پر حاصل ہو جاتا ہے وہ اس بیماری کے لئے بہترین دوا ہے۔

مندرجہ بالا بیانات سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ زہر کے برخلاف سفید جسیموں سے ٹپکا ہوا مواد ہمیشہ ایک جیسا نہیں ہوتا بلکہ ہر بیماری کے مائیکروب کے ازالہ کیلئے اس قسم کے زہر کے برخلاف مواد ٹپکتا ہے اور یہ بات خود قابل توجہ ہے کہ یہ مدافعت کرنے والے سپاہی اس قدر دقیق فنی اطلاعات رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کس قسم کے دشمن کو زیر کرنے کے لئے کونسے آلات استعمال کرنے چاہئیں ان مشکل مطالب کو کس نے انہیں سکھایا اور یہ حیرت انگیز دوا سازی انہوں نے کہاں سے سیکھی؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب مادہ پرست سائنسدانوں کو دینا چاہئے۔

جنگی ٹھکانے اور مورچہ بندی

اس خونین لڑائی میں ممکن ہے کہ شکست خوردہ بدن کی متحرک اور مدافعت کرنے والی قوتیں لاتعداد اور قوی مائیکروبوں کی حملہ آور قوتوں کو آگے بڑھنے سے نہ روک سکیں اور ایسی صورت میں زیادہ نقصان پہنچا کر آخر کار پیچھے ہٹ جائیں۔

لیکن سفید جسیمے اس ابتدائی شکست کی وجہ سے ہتھیار نہیں ڈالتے اور کمینگاہوں اور مخصوص ٹھکانوں (غدود اور تلی) میں مورچہ بندی کر کے دشمن کا راستہ روک دیتے ہیں اور اس کے بعد جنگ کی آگ تیز ہو جاتی ہے اور سفید جسیموں کے بنائے ہوئے مخصوص ٹھکانوں (تلی) سے بھی لحہ بہ لحہ تازہ دم قوتیں میدان جنگ میں بھیجی جاتی ہیں۔

لیکن خوف کی ضرورت نہیں کیونکہ اگر عام طور پر بدن اپنی طبیعی حالت پر ہو تو سفید جسیموں کی کامیابی یقینی ہوتی ہے اور آخر کار وہ میکروبوں کو درمیان سے ہٹا دیتے ہیں۔ اور اگر بدن کی قوت دفاعی ختم ہو چکی ہو تو پھر ممکن ہے کہ مائیکروبوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ اور ان کی پیش قدمی کی وجہ سے بدن کے ٹھکانے اور مورچے (مثلاً: غدود جگر اور تلی) بھی مسخر ہو جائیں اور مائیکروب جراثیم سراپا بدن پر قابض

۱ [یقیناً یہ حساب تقریباً ہے ورنہ ہم اگر بہت زیادہ باریکی سے حساب کریں تو اس حساب سے بیکٹیریائی جراثیم کی حاصل شدہ تعداد ۲۴ گھنٹے میں ۲۵۰ ہزار ارب تک پہنچتی ہے۔ اب حساب تصاعدی کے لحاظ سے پہلے پانچ گھنٹوں میں پیدا شدہ بیکٹیریائی جراثیم کی تعداد ۱۰۰۰ ہوگی اور دوسرے پانچ گھنٹوں میں یہ تعداد ۱۰۰۰،۰۰۰ تک پہنچ جائے گی اور تیسرے پانچ گھنٹوں کے بعد ان کی تعداد ایک ارب ہو جائے گی اور چوتھے پانچ گھنٹے گزرنے کے بعد یہ تعداد ۱۰۰۰ ارب میں تبدیل ہو جائے گی اور باقی ماندہ ۴ گھنٹوں کے بعد (یعنی ۴۸ آدھے گھنٹوں میں جو ۲۴ گھنٹوں کے برابر ہے) پیدا ہونے والے بیکٹیریائی جراثیم کی تعداد ۲۵۰ ہزار ارب کے لگ بھگ ہو جائے گی]

۲ [اسکی توضیح یہ ہے کہ اگر ہم بیکٹیریائی جرثومہ کو ۱/۱۰۰۰ ملی میٹر (ایک مائیکرون) فرض کریں تو ان کے ۱۰۰۰ کی لمبائی اندازاً ایک ملی میٹر ہوگی اس بناء پر ایک مکعب ملی میٹر میں ان کے ایک ارب کی گنجائش ہوگی (یعنی آپ اگر ایک بہت چھوٹی سی ڈبیہ لے لیں جس کا طول وعرض اور گہرائی ایک ایک ملی میٹر ہو تو ہم اسے اس طرح کہیں گے کہ ایک مکعب ملی میٹر میں ایک ارب بیکٹیریائی جراثیم کی گنجائش ہوتی ہے) اور دوسرے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ ایک ارب بیکٹیریائی جراثیم کا حجم ایک مکعب ملی میٹر کے برابر ہوتا ہے اور اس لحاظ سے کہ ہر مکعب سنٹی میٹر ۱۰۰۰ مکعب ملی میٹر کے برابر ہوتا ہے ایک مکعب سینٹی میٹر کے حجم میں ۔ ۱۰۰۰ ہزار ارب بیکٹیریاء جراثیم آسکتے ہیں اور آخر کار ۲۵۰ ہزار ارب بیکٹیریائی جراثیم ۲۵۰ مکعب سینٹی میٹر کے حجم میں آجائیں گے]

ہو جائیں۔

آخر کار اس لڑائی کے اثرات جسم کے اوپر پھوڑے اور پیپ کی شکل میں ظاہر ہو جاتے ہیں اور پھوڑا پھوٹ کر اس کے اطراف پیپ بہنے لگتی ہے اور یہ کیفیت بھی سفید جسیموں کے حملے کی وجہ سے ہوتی ہے ان کے حملہ آور ہونے کی وجہ سے پھوڑا پھوٹ جاتا ہے اور فریقین (مائیکروب اور سفید جسیموں) کے مردہ جسموں کی وجہ سے پیپ پیدا ہو جاتی ہے۔

ران کی (جڑوں) میں جو تکلیف دہ گلٹیاں پیدا ہو جاتی ہیں وہی خون کے سفید جسیموں جسے ناواقف لوگ ایک بے مصرف چیز سمجھتے ہیں کی کمین گاہیں اور مورچے بن جاتے ہیں۔

مائیکروبوں کے سروں کی بدولت جسم کا نشوونما

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کے ان حیرت انگیز افلاک کے پیچھے اگر ایک منبع عقل اور ایک خالق اور ایک خدا کی قوت کام کر رہی تھی تو پھر اس نے مائیکروبوں کو کیوں پیدا کیا کہ وہ انسان اور حیوانوں کے جسموں میں اس قدر موانعات اور اس قدر دفاع کے وسائل پیدا کریں؟ کیا یہ بہتر نہ تھا کہ وہ نہ تو مائیکروبوں کو پیدا کرتا اور نہ ہی دفاعی وسائل اور مشنری کو؟

اس سوال کے جواب کی توضیح کے لئے ہمیں یہ بات بیان کرنی ہوگی جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ مائیکروبوں کی پیچیدہ اور عجیب ساخت اور ان کی حیرت انگیز کارکردگی اور اسی طرح اس قسم کے ایک منظم نازک اور دلچسپ پلاننگ کے تحت ایک اسٹیج کی ساخت کسی حادثہ کا اثر نہیں ہو سکتی اور نہ ہی کسی بے شعور اور بے عقل مادہ کے علل و معلول کے سلسلہ کے تحت یہ چیز وجود میں آ سکتی ہے اس کے علاوہ یہ بات کیسے ممکن ہے کہ ایک ایسا واقعہ جو کسی عقل کے بغیر اور کسی نقشہ اور خاکہ کے بغیر حادثاً و اتفاق کی بناء پر وجود میں آ جائے جس میں مداومت بھی ہو؟

کیا کوئی عقلمند شخص گذشتہ بیانات کی روشنی میں اور حساب احتمالات کی رو سے کسی ایسی خلاف عقل و خلاف وجدان بات کو تسلیم کر سکتا ہے؟

ظاہر ہے کہ گذشتہ باتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کا جواب نفی میں ملے گا۔ اب صرف جو چیز باقی

رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ان مائیکروبوں اور جنگ و گریز کے اس اسٹیج کو پیدا کرنے سے کیا فائدہ ہے؟

یہاں پہلے اس بات کا واضح کر دینا مناسب ہے کہ اگر بالفرض اس مقصد کے پانے میں ہم ناکام رہیں تو بھی کوئی اشکال پیش نہیں آئیگی کیونکہ اس دنیا میں ہمارے سامنے بہت سی نامعلوم چیزیں اور اسرار اور ناقابل حل معمے موجود ہیں ان میں سے اسے بھی ایک سمجھا جائے۔

لیکن خوش قسمتی سے سائنسی تحقیقات اور تجربوں نے ہماری اس مشکل کو حل کر دیا ہے۔ ایک سائنسدان اس بارے میں کہتا ہے کہ اگر مضر مائیکروبوں کا وجود نہ ہوتا تو انسان کا قد ۸۰ سینٹی میٹر سے زیادہ نہ بڑھتا۔

ان ضرر رساں جانداروں کا اجسام کے نشوونما میں بہت زیادہ عمل دخل ہے۔ آپ یقیناً اس جگہ اس دلیل کے بارے میں ہم سے پوچھیں گے۔ یہ بات تو روشن ہے کیونکہ مائیکروبوں کے پے در پے حملوں کی وجہ سے خون کے جسیمے اور جسم کی تمام قوتیں زیادہ فعال بن جاتی ہیں اور ظاہر ہے کہ بدن کی قوتیں لڑائی اور خطرات کے احساس کے بالمقابل جس قدر شدت سے کام کرینگی اسی قدر زیادہ قوی ہونگی اور ان کی نشوونما بہتر ہوگی۔

ہمیشہ مقابلہ اور آمادگی اور لڑائی، ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا بہترین وسیلہ ہے اور اسی طرح ان ہی عوامل کے ذریعہ اقتصادی، سیاسی اور عملی ترقی و پیشرفت کے لئے بھی اس اصول سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

اس بناء پر کیا عجب ہے کہ تخریبی عوامل اور ان کو تشکیل دینے والے اجزاء سے مقابلہ ہمارے بدن کی نشوونما اور ترقی کرنے کا سبب بن جائے۔

وائرلیس جراثیم

بہت ہی چھوٹے جراثیم کا دوسرا گروہ وائرلیس ہیں جو معمولی مائیکروسکوپ سے بھی نظر نہیں آ سکتے بلکہ خاص آلہ کے ذریعہ جسے ''الیکٹرانک مائیکروسکوپ'' کہتے ہیں اور جو کسی چیز کو معمولی مائیکروسکوپوں کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ بڑا کر کے دکھاتا ہے۔ اس کے ذریعہ ان کو دیکھا جا سکتا ہے اور ان کا پتہ

چلایا جا سکتا ہے اور اس آلہ سے دیکھنے کے طریقے میں معمولی مائیکروسکوپوں کے مقابلہ میں کافی فرق ہے۔ وائرلیس جراثیم کا مشاہدہ الیکٹرانک مائیکروسکوپ سے شعاعوں اور نور کو رنگین کر کے کیا جا سکتا ہے۔

وائرلیس کی جسامت

ان کی جسامت کا اندازہ کرنے کے لئے ''مائیکرون'' جو کہ بیکٹیریا کی پیمائش کے وقت ہماری اکائی تھی وہ بھی اس سلسلے میں ہماری ضرورت کو پورا نہیں کر سکتی اس لئے وائرلیس کو ناپنے کے لئے ہم نے ایک خصوصی اکائی ۱۰۰۰/۱ مائیکرون یعنی ۱۰۰۰۰۰۰/۱ ملی میٹر کا انتخاب کیا ہے جسے ''میو'' کہتے ہیں ایک وائرلیس کی جسامت ۲۰ سے ۱۰۰ میو کے برابر ہوتی ہے لیکن یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ یہ غیر معمولی چھوٹا جاندار اس (چھوٹے پن) کے باوجود فعال زندگی رکھتا ہے اور جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ایک زندہ موجود کے لئے جن آثار و خواص کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ اب اس جاندار کی ساخت اور اس کی طرز زندگی پر دوبارہ غور کیجئے [1]

توحیدی اسباق

۱۔ [اس قسم کا پراسرار کام جس کا انحصار خود بیکٹیریا یا ئی جراثیم پر نہیں ہے بلکہ وہ سب اس عظیم کارخانہ حیات کے بھیدوں کے مجملہ ہے کہ موجودات کی ایک تعداد کو ایک خاص کام کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے۔ وہ کوشش کرتے ہیں اور اپنے تمام اعضاء اور پوری قوت کو اس کام میں صرف کر دیتے ہیں حالانکہ وہ خود اپنے انجام کار سے ناواقف ہوتے ہیں اور اس کا فائدہ ہمیشہ دوسروں کو پہنچتا ہے۔

شہد کی مکھیاں تکلیف اٹھاتی ہیں اور خوب محنت کرتی ہیں آخر کار ایک چھتہ بنا لیتی ہیں اور اس میں ۲۰ ہزار خانے بناتی ہیں اور اس کے بعد جبکہ ان تمام مذکورہ خانوں کو شہد سے یعنی اپنی محنت کی کمائی سے بھر دیتی ہیں تب اسے ذخیرہ کے طور پر چھوڑ کر وہ شہد کی مکھیاں جتھا کسی اور جگہ چلا جاتا ہے۔

ایک درخت فصل بہار سے اپنا کام شروع کر دیتا ہے اسی کی شاخیں نکلتی ہیں اس میں پتے اگتے ہیں پھر پھول آ جاتے ہیں اور وہ اس کام کے لئے سخت محنت برداشت کر کے کئی مرحلوں کے بعد اپنی اس

وائرلیس جراثیم کے انتہائی چھوٹے عالم کا مقابل عظیم آسمانوں کے لامنتہا عالم سے جس میں بے انتہا حیرتناک نظم وضبط حکم فرما ہے ایک بار اپنی عقل او روجدان کو قاضی بنا کر کیجئے اور خوب غور کیجئے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے بے عقل و بے شعور اسباب کے پیدا کردہ اتفاقات و حادثات کی بنیاد پر عالم افلاک کے وجود میں آنے کا احتمال صفر کے برابر بلکہ حادثہ محال ہے تو پھر وائرلیس جراثیم کے حیران کن عالم میں کہ جن کی تنظیم اور باریکیاں بہت زیادہ پیچیدہ اور اس میں زندگی کی شرطیں زیادہ مشکل ہیں اس کا کیا حال ہوگا؟

کیا یہ ہواؤں کا چلنا اور بارش کا ہونا، سورج کا نکلنا اور زمین کی گردش وغیرہ نے ان نہایت چھوٹے وائرلیس جراثیم کو ان تمام خوبیوں کے ساتھ وجود بخشا ہے۔ کیا کوئی عقلمند اس کو احتمال کے طور پر قبول کرنے کو تیار ہے؟

محنت کے نتیجے میں پھل پیش کرتا ہے اس کے بعد وہ موسم سرما میں گہری نیند سو جاتا ہے یہاں تک کہ دوبارہ فصل بہار آنے پر وہ اپنے کام کو پھر از سر نو شروع کرتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس جیسے سینکڑوں موضوعات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہر مخلوق کے لئے ایک کام مقرر ہے اور اسے ایک خاص کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے جس کا انجام دینا ہی اس کی زندگی کا محور اور مقصود ہے حتیٰ کہ انسان کی بھی یہی حالت ہے کیونکہ اگر اس کی زندگی کا اور ان قوتوں اور طاقتوں کا جو اس کی سرشت میں موجود ہیں مطالعہ کیا جائے تو یہ بات معلوم ہوگی کہ ذی عقل جانداروں کے لئے خاص کام مقرر کئے گئے ہیں اور وہ اپنی زندگی میں اس کی انجام دہی میں مصروف رہتے ہیں اور اپنی تمام قوتیں اس کے لئے صرف کرتے ہیں لیکن کیا انسان کو جب وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے اور اپنی زندگی کے اس کام اس پھل اس گوہر کی جب تکمیل کر لیتا ہے تو اس کا انجام کیا ہوتا ہے اور اس کے کیا اثرات اور نتائج کیا پیدا ہوتے ہیں؟ ہم نہیں جانتے اور اس کی اطلاع حاصل کرنا بھی ہمارے عقل و دماغ کی قلمرو سے باہر ہے۔ اب یہ موقع ہے کہ دین ہمارے سوال کا جواب دیتا ہے اور فلسفی کی اس مشکل کو حل کر کے اس پر سے پردہ اٹھا دیتا ہے۔ یہ بھی ایک دوسرا راستہ ہے جو اس بارے میں انسان کے مطالعہ کو توحید اور خدا شناسی کی طرف رہنما بنا دیتا ہے (غور کیجئے)]

تیسرا حصہ

عالم مادہ کی سرحد (ایٹم)

سب سے چھوٹی چیز جس کا علم آج تک انسان کو ہوسکا ایٹم ہے۔ اس کے بھی ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔

ایٹم جو عالم کائنات میں سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز ہے اس قدر چھوٹا اور مختصر ہوتا ہے کہ طاقتور ترین مائیکروسکوپوں کے ذریعہ سے بھی جو چیزوں کو کئی دس ہزار گنا بڑا کر کے دکھاتا ہے قابل مشاہدہ نہیں ہے۔

لیکن صرف سائنسی اور ریاضی حسابات کے ذریعہ اور مختلف آثار کی بناء پر جو عکاسی کے شیشوں یا اس جیسی چیزوں کے اوپر ظاہر ہوتے ہیں انسان کو اس حیرت انگیز طاقتور چیز کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔

اسی ایٹم کی اکائیاں ہیں جو جہان مادہ کے بنانے میں مصالحہ کے طور پر استعمال ہوئی ہیں' ان کی گوناگوں آمیزش سے اس دنیا کے رنگا رنگ موجودات واجسام وجود میں آئے ہیں اور بالفاظ دیگر عالم طبیعی کے تمام موجودات اور اجسام' ایٹم کے مجموعہ کا نام ہے اور ایک بہت ہی چھوٹا جسم جو بمشکل آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے وہ بھی دراصل لاکھوں ایٹم کے مجموعہ سے وجود میں آتا ہے۔

ایٹم کی تاریخ

ایٹم بھی دوسری بہت سی حقیقتوں کی طرح ہے جسے انسان نے تدریجاً پہچانا۔ اس کی تاریخ بہت طویل ہے اور ایٹم شناسی کا علم بہت قدیم زمانہ سے مفکروں اور سائنسدانوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ جہاں تک تاریخ سے پتہ چلتا ہے بظاہر "ڈیموکریٹ" (ذیمقراطیس) پہلا شخص ہے جسے موجودات کی ترکیب کے بارے میں رائے کا اظہار کیا کہ وہ ایسے چھوٹے ذرات کے اجزا سے بنتے ہیں جو قابل تجزیہ اور نا قابل تقسیم ہیں لے

"ڈیموکریٹ" جو قدیم یونانی حکماء سے ہے اور پانچویں صدی قبل مسیح میں گزرا ہے اس کا اعتقاد تھا کہ دنیا کے تمام موجودات ان نا قابل تقسیم ذرات سے وجود میں آتے ہیں اور ایٹموں میں فرق اور اختلاف کو موجودات کے تنوع اور امتیاز کا باعث بتایا ہے جیسا کہ سرکہ اور شیرینی یا تیل میں اختلاف نظر آتا ہے وہ اسی لئے ہے کہ سرکہ کو تشکیل دینے والے ایٹم تیز نوک والے قلابوں کی طرح ہوتے ہیں اور کھٹائی جو سرکہ کی خصوصیت ہے ان اجزاء کو زبان سے چکھنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ جبکہ شیرینی یا تیل کے ایٹم گول اور لیسدار ہوتے ہیں۔

یہ ذرات ڈیموکریٹ کی نظر میں کسی طرح بھی قابل تجزیہ نہ تھے اور اسی لئے اس کا نام ایٹم رکھا گیا جس کے معنی نا قابل تقسیم ہے اور جس وقت یونان کے فلسفہ کا عربی میں ترجمہ کیا گیا تو ایٹم کے لفظ کا ترجمہ "جزءلایتجزیٰ" (نا قابل تقسیم جزء) کیا گیا اسی لئے ذیمقراطیس کا نظریہ فلسفیوں اور سائنسدانوں کے نزدیک نظریہ جزءلایتجزیٰ کے عنوان سے زیر بحث آیا ہے لیکن زیادہ تر اس عقیدہ کو مردود شمار کیا گیا اس پر بہت زیادہ تنقیدیں ہوئیں اور زیادہ دقتیں پیش آئیں اور اس حال میں بھی بعض لوگوں نے اس نظریہ کی پیروی کی اور قابل مضحکہ (ہماری نظر میں) مباحث کے ذریعہ اس نظریہ کی حمایت کی لے

ایک زمانہ گزر گیا لیکن مذکورہ بالا نظریہ کے ثبوت میں کوئی دلیل اور برہان نہ ملی یہاں تک کہ آخری چند سالوں میں سائنسی کوششوں کے نتیجے میں نظریہ ایٹم کو ثابت کر کے اسے سائنسی مسلمات میں داخل کر دیا گیا لیکن سنہ ۱۹۱۹ء میں ایٹم کو توڑنے کے لئے پہلا قدم اٹھایا گیا اور ایک سائنسدان نے جس کا نام "روتر فورڈ" تھا پہلی بار (نا قابل تقسیم) ایٹم کو توڑنے میں کامیابی حاصل کی اور اس کے بعد ایٹم کی تحقیقات کا میدان روز بروز وسیع سے وسیع تر ہونے لگا اور ایٹم شناسی کا فن ترقی کر کے موجودہ مراحل

لے [البتہ اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ اگر مائیکروب براہ راست خون میں داخل نہ ہوں تو یہ سفید جسمے اپنی خالص صلاحیتوں کے ساتھ رگوں کے راستے (دوران خون کے ساتھ) باہر نکل کر حملہ آوروں کو گھیر لیتے ہیں اور اس ذریعے سے مائیکروبوں کی کارکردگی اور ان کے آگے بڑھنے کو روک دیتے ہیں]

میں داخل ہوگیا اور اس طویل مدت میں اس کا وہی نام ایٹم (ناقابل تقسیم) اپنے نام کے برعکس باقی رہا۔

ایٹم کی اندرونی ساخت

ایٹم میں باوجود اپنے چھوٹے پن کے کئی اجزاء موجود ہیں جن کی تین اعلیٰ قسمیں حسب ذیل ہیں جن کو ایٹم کے ارکان کہا جا سکتا ہے۔

''پروٹون'' اس میں الیکٹرک کی مثبت رو ہوتی ہے۔

''نیوٹرون'' جو الیکٹرک کے لحاظ سے غیر جانبدار ہے۔

''الیکٹرون'' اس میں الیکٹرک کی منفی رو ہوتی ہے اور کبھی اس کو ''نگیٹون'' بھی کہا جاتا ہے۔

یہ نہایت چھوٹے اجزاء بے انتہا حیران کن طریقے پر ایٹم کو تشکیل دیتے ہیں۔ اس ترتیب کے ساتھ کہ پروٹون اور نیوٹرون اجتماعی طور پر مرکز میں رہ کر مرکز ایٹم کی تشکیل کرتے ہیں اور الیکٹرک کے ذرات بھی مقررہ فاصلہ پر ہستہ کے اطراف نہایت تیزی کے ساتھ چکر لگاتے رہتے ہیں۔

سائنسدانوں نے ایٹم کی ساخت کو نظام شمسی کی ساخت سے اور الیکٹرونوں کی حرکت کو سیاروں کی گردش کی حرکت سے تشبیہ دی ہے اس فرق کے ساتھ کہ اگر تعجب نہ کرو تو ایٹمی سیاروں کے گھومنے کی رفتار نظام شمسی کے سیاروں کی رفتار سے زیادہ تیز ہے چنانچہ ہم دیکھیں گے کہ نیوکلیس کے ذرات کی تعداد میں اور الیکٹرون کی تعداد میں اور ان کے فاصلوں میں یہاں تک کہ ایٹم کے مداروں میں بھی فرق ہے ؎

ایٹموں کی جسامت

پروٹون جو کہ ایٹم کے نیوکلیس کا ایک جزو ہے وہ اس قدر چھوٹا ہے کہ اگر ہزار ارب (۱,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰) سے دس ہزار ارب (۱۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰) کو ایک کے بازو ایک رکھتے جائیں تو اس عجیب صف کی لمبائی ایک سینٹی میٹر ہوگی ؎

اس خیال سے کہ ہم اس اہم حساب کو درست طور پر کیا جائے ہم فرض کرتے ہیں کہ کوئی شخص ایک سینٹی میٹر لمبائی کے پروٹونوں کو گننا چاہتا ہے اور پھر یہ بھی فرض کرتے ہیں کہ وہ شخص اتنا چست و چالاک ہے

کہ ہر سیکنڈ میں ۱۰۰ ایٹم کو گن سکتا ہے اور یہ کام رات دن' گھنٹوں' برسوں کرتا چلا جاتا ہے تو اس کو ۳۰۰۰ سال سے ۳۰۰۰۰ سال (ایٹموں کے فرق کی وجہ سے) کا وقت درکار ہوگا تاکہ وہ ایک سینٹی میٹر لمبائی کے پروٹونوں کا شمار کر سکے۔

ایٹم کے اندر ایک ہولناک اور خالی فضا

ایک ایٹم کا حجم ۱۰۰۰ سے زیادہ پروٹون کے حجم کے برابر ہوتا ہے لیکن یہ تمام حجم ٹھوس نہیں ہوتا بلکہ الیکٹرونوں اور ہستہ کے درمیان کا فاصلہ نیوکلیس کے حجم کے مقابلہ میں بہت زیادہ وسیع اور پورا خالی ہوتا ہے اور اس عجیب فضا کی تصویر کشی کے لئے اتنا جاننا کافی ہے کہ اگر ایک ایٹم کے قطر کو ایک کلومیٹر (۱۰۰۰ میٹر) فرض کریں تو صرف اس کا ایک میٹر نیوکلیس اور پروٹون میں کام آئے گا اور الیکٹرون نیوکلیس کے اطراف ایک کلومیٹر کے فاصلے پر گردش کریں گے اور بقیہ جگہ میں خالی فضا ہوگی۔

ایٹموں کے ٹھوس اور کارآمد حصہ کے مقابلے میں خالی فضا بہت زیادہ ہے جیسے کرۂ آفتاب اور دور ترین سیاروں کے درمیان وسیع فضا۔ اس طرح ظاہر ہے کہ ایٹم کے حجم کا اہم حصہ خلاء ہے اور اصل مادہ بہت ہی چھوٹا ہے۔ مشہور سائنسدان ''ڈولیو'' کے قول کے مطابق اگر ایک انسان کے جسم کے ایٹموں کے درمیان سے خالی فضا کو نکال دیا جائے اور اس کے تمام ایٹمی اجزا کو کسی ذریعہ سے مثلاً غیر معمولی دباؤ سے آپس میں جوڑ دیا جائے تو یہی انسانی بدن اس قدر چھوٹا ہو جائے گا کہ اسے بمشکل دیکھا جا سکے گا۔

اور یہ بات اس سے بھی زیادہ عجیب ہے کہ اس چھوٹے سے جسم کے وزن میں پہلے کے مقابلے میں کوئی کمی نہ آئے گی ؎

تیز سے بھی تیز تر

الیکٹرون جو بہت ہلکے وزن کے ذرات ہیں اور ان کی برقی رو منفی ہوتی ہے وہ ایٹم کے مرکزی نیوکلیس کے اطراف ایک مقررہ فاصلہ پر بہت زیادہ تیزی سے گردش کرتے ہیں۔

ہائیڈروجن کے ایٹم میں جو سب سے زیادہ سادہ ایٹم ہے اور جس میں الیکٹرون ہوتا ہے اس میں الیکٹرون کی حرکت کی رفتار تین ہزار کلومیٹر فی سکنڈ ہوتی ہے اور یورینیم ؎ کے ایٹم میں جس میں کئی

الیکٹرون ہوتے ہیں ان کی حرکت کی رفتار ۲۶۴ اور ۲۰۱ کلومیٹر فی سکنڈ ہوتی ہے ۔ یے

اب غور کیجئے کہ اس قدر بے انتہا چھوٹے میدان میں ایک موجود اس قدر عجیب رفتار سے گردش کرتا ہے تو اس کی حالت کیا ہوگی اور اپنے مرکز کے اطراف ایک سیکنڈ میں کتنی دفعہ چکر لگاتا ہوگا اور کس قدر فاصلے طے کرتا ہوگا؟

توجہ کرنے پر آپ خود اس بات کی تصدیق کرینگے کہ نظام شمسی کے عظیم سیاروں کی جو رفتار ہے وہ بھی ان چھوٹے اور حقیر الیکٹرونوں کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے ۔

ایٹموں میں فرق

پرانے لوگ یہ گمان کرتے تھے کہ تمام جسموں کی ساخت عناصر اربعہ پانی' ہوا اور مٹی سے ہوتی ہے اوران ہی چار عناصر نے دنیا کی تعمیر کی ہے اور یہ اپنی جگہ جوہر ہیں جو نا قابل تجزیہ ہیں ۔

لیکن سائنسی تحقیقات و تجربات کے نتیجہ میں معلوم ہوا کہ عناصر کی تعداد چار پر منحصر نہیں ہے بلکہ یہ چار عناصر بنیادی طور پر قابل تجزیہ ہیں اور خود بھی دوسرے بسیط عناصر سے پیدا ہوئے ہیں ۔

اب تک ۱۰۴ عناصر کی تعداد کا پتہ چلا ہے کہ ذرات کی تعداد کے لحاظ سے ان میں اور الیکٹرونوں میں باہم فرق ہوتا ہے اور اسی فرق نے ایٹموں کے تنوع کو باقی رکھا ہوا ۔

اس معنی میں کہ ان گوناگوں اجسام کے اندر جو طبیعی اور کیمیائی اختلافات ہیں وہ سوائے الیکٹرونوں اور پروٹونوں کی تعداد کی کمی اور زیادتی کے اختلاف اور فرق کے اور کچھ نہیں ہے ۔

سب سے زیادہ سادہ ایٹم ہائیڈروجن کا ایٹم ہے جس میں صرا ایک الیکٹرون اور ایک پروٹون ہے اور سب سے بڑھ کر یورونیم کا ہے جس میں ۹۲ الیکٹرون مرکزی نیوکلیس کے اطراف (جس میں ۱۳۶ سے ۱۴۷ تک نوٹرون اور پروٹون ہیں) متعدد مدارات پر دیوانہ وار چکر لگا رہے ہیں اور عنصر یورینیم کے بعد دوسرے عناصر کا پتہ لگا ہے جو ان سے بھی زیادہ الیکٹرون رکھتے ہیں ۔

ایٹم کے توحیدی اسباق

ایٹموں کے بہت ہی چھوٹی عالم کا مطالعہ ہمیں سے درس دیتا ہے جو ہماری رہبری خدائے بزرگ و

برتر کی طرف کرتا ہے اور ہمیں اس کی عظمت وقدرت اور اس کے بے پایان علم سے ہمیں آگاہ کرتا ہے ۔

یہ مطالعہ نہ صرف یہ کہ نشاط آور اور حیرت انگیز ہے بلکہ وہ خدا کی عظمت اور حیرت کی ایک لہر دل میں پیدا کر دیتا ہے اور انسانوں کو بے اختیار اس عجیب کارخانہ کے پیدا کرنیوالے کے آستانہ پر جھکا دیتا ہے ۔

ہمارے لئے کافی ہے کہ ہم ان چار حصوں کو جو زیادہ دلچسپ ہیں اور جو ایٹم کے پیدا کرنیوالے کے علم وقدرت کا کھلا نمونہ ہیں بغرض مطالعہ پیش کریں ۔

۱۔ ایٹموں کی تنظیم

اب تک جن ۱۰۴ عناصر کا پتہ چلا ہے ان سب میں ایک مخصوص ترکیب اور نظم وضبط ہے کہ ان کے الیکٹرونوں کی تعداد باترتیب ایک سے شروع ہو کر ایک منظم طریقہ پر تدریجا ایک ایک کر کے اوپر بڑھتی جاتی ہے اور انہیں ایک خاص جدول (جدول نام ہے) کے تحت منظم کیا جا سکتا ہے ۔

۲۔ قوت جاذب اور قوت دافعہ میں یکسانیت (برابری)

برق کی دو مخالف رویں ہمیشہ ایک دوسرے کو جذب کرتی ہیں یعنی ایک جسم جس میں سے مثبت رو گزر رہی ہو اس کے قریب ایک ایسی چیز ہو جائے جس میں سے منفی رو گزر رہی ہو تو وہ دونوں جسم ایک دوسرے کی طرف حرکت کرینگے اور ایک دوسرے میں پیوست ہو جائیں گے اور ایک شعلہ جس کو برق عشق کہنا چاہئے ان میں سے نکلنا شروع ہو جاتا ہے ۔

اس لحاظ سے یہ ضروری ہوگا کہ الیکٹرون جن میں منفی رو ہوتی ہے اور پروٹون جن میں مثبت رو ہوتی ہے ایکدوسرے کو فوراً جذب کر لیں اور یہ تیز رفتار گردشیں ایٹموں کے دل میں داخل ہو کر ان پر موت کا سکوت طاری کر دیں ۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہو جائے تو دنیا کا حال دگرگوں ہو جائے گا ۔ لیکن ایسا حادثہ دنیا میں کبھی نہیں ہوا اور نہ ہوگا اور یہ صرف ایک مکمل نازک اور مستقل حساب کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے جس نے اس عجیب تعادل اور حیرت انگیز نظم کو ایٹم کے اندر وجود بخشا ہے ۔

اس بات کا راز اس میں ہے کہ ایک معین حساب اور نظم ایٹم کے دل پر حکومت کرتا ہے جو اس برابری

کو قائم رکھتا ہے یعنی ایک دوسری قوت جو نیوکلیس کے قوت جاذبہ کو تعدیل بخشتی ہے۔ ''مرکز سے گریز کرنے کی قوت'' جو اطراف میں گردش کی حرکت کے اثر سے وجود میں آتی ہے اور اس کی قوت' حرکت کی رفتار کے متناسب ہوتی ہے (یہ) ہمیشہ جسم متحرک کو مذکور نیوکلیس سے دور ہٹاتی ہے اور ایک طرف سے نیوکلیس بھی (قوت جاذبہ کو جو دونوں برقی رووٴں کی نزدیکی سے پیدا ہوتی ہے) الیکٹرونوں کو شدت سے اپنی طرف کھینچتا ہے۔

اب غور کیجئے کہ ایٹم کے وجود کی حفاظت کے لئے الیکٹرونوں کی گردش کی رفتار اتنی ہونی چاہئے کہ اس سے ایسی قوت مدافعہ پیدا ہو جو قوت جاذبہ کے برابر ہو اور اس کا پوری طرح جواب دے سکے۔ اگر اس مقررہ اصول میں ذرا سا بھی فرق پڑ جائے گا تو ایٹم کا کارخانہ کام کرنا بند کر دیگا یعنی مرکز سے گریز کی قوت اگر ذرا سی بھی زیادہ ہو جائے گی تو الیکٹرون جلدی سے دور ہٹ جائیں گے اور ایٹم تقسیم ہو جائے گا اور اگر یہ برابری قوت جاذبہ کے حق میں چلا جائے گا تو ایٹم کے اجزا تیزی سے نزدیک ہو جائیں گے

---

۱ [چنانچہ ترقی یافتہ اور جمہوری ملکوں میں ایک سے زیادہ سیاسی جماعتیں موجود ہوتی ہیں اور ہر ایک جماعت حکومت اور سیاست کی باگ ڈور سنبھالنے اور دوسروں کو پیچھے ڈھکیلنے کے لئے خوب کوشش اور محنت کرتی ہے اور سیاست کے میدان میں ان کی یہ مسابقت' سیاست میں ان کا مقام بڑھانے اور ان کی قوت کے اضافہ کا سبب بنتی ہے۔

اور اسی طرح کسی مملکت کے اقتصادیات کے چرخہ کو تیزی سے گردش میں لانے کے لئے عام طور پر اسی طریقے سے ماہرین اقتصادیات اور کاریگروں میں معاشی مسابقت پیدا کر کے اس کا فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

سائنسی پیشرفت کے سلسلے میں بھی مسابقت گہرا اثر ڈالتی ہے اور جیسا کہ سائنس کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے' بہت سی سائنسی ترقیاں اور کامیابیاں جو انسانوں کو حاصل ہوئی ہیں وہ اسی مسابقت اور رقابت کے اثر سے صورت پذیر ہوئیں۔ (ہماری مراد بہت سے طبعی اور مادی علوم سے ہے)

اس بات کا زندہ ثبوت وہی شدید رقابت ہے جو شرقی اور غربی دو بڑے بلاکوں میں سیاست' اقتصادیات اور سائنس میں چل رہی ہے خصوصاً جو مسابقت فضائی سائنس کے سلسلے میں ان میں ہو رہی ہے ان کے آثار و نتائج مختلف صورتوں میں ہمارے سامنے ہیں]

اور کام کرنا بند کر دیں گے اور اس لحاظ سے ایٹم کی مشنری بند ہو جائے گی۔ غور کیجئے کہ اس پیچیدہ حساب کو اس غیر معمولی چھوٹے سے محیط میں منظم رکھنا کس قدر مشکل کام ہے؟

۳۔ ایٹم کے مداروں کا بے نظیر نظم

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایٹم جن میں متعدد الیکٹرون ہوتے ہیں وہ نہ صرف مدار کے خط پر نیوکلیس کے اطراف گردش کرتے ہیں بلکہ یہاں بھی الیکٹرونوں کے مدار پر ایک تنظیم حکومت کر رہی ہے وہ اس طرح کہ ہر مدار کے الیکٹرون اپنے کمبل سے پاؤں باہر نکال کر کسی اور کی قلمرو میں داخل نہیں ہو سکتے۔

جن ایٹموں میں ایک یا دو الیکٹرون ہوتے ہیں ان کا صرف ایک ہی مدار ہوتا ہے اور اگر ایٹم کے الیکٹرونوں کی تعداد دو سے بڑھ جائے تو تین اور چار سے دس ہونے تک دوسرے مدار میں خاص فاصلہ پر گردش کریں گے اور اسی ترتیب سے ہر مدار پر معینہ تعداد کے الیکٹرونوں کی گنجائش ہوتی ہے اور مزید افزائش کی صورت میں مداروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

اب غور کیجئے کہ ان منظم مداروں کا خاکہ اور ایک دائرہ کے اطراف پے در پے دوسرے دائروں کا ہونا جن کا محیط بھی بہت ہی چھوٹا ہو جن کا مشاہدہ بھی کسی طرح نہیں کیا جا سکتا کیا ان چیزوں کا پیدا ہو جانا سوائے ایک ایسے انجینئر کے جس کا علم اور جس کی قدرت لامحدود ہو ممکن ہے؟

کیا سچ مچ یہ بات بغیر عقل اور بغیر خالق کے صرف طبعی اسباب کی بناء پر ہو سکتی ہے؟

---

۱ [وائرس کی زندگی کی ایک عجیب ترین اور نمایاں بات ان کا تولید مثل کرنا ہے اور ان کی تولید مثل بیکٹیریائی جراثیم سے زیادہ تیز اور زیادہ حیران کن ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں بیکٹیریائی جراثیم ۱/۲ گھنٹہ (۳۰ منٹ) میں بالغ ہو کر تقسیم کے ذریعہ تولید مثل کے مرحلہ میں پہنچ جاتا ہے اور اس ترتیب سے تصاعدی حساب کے ذریعہ بیکٹیریائی جراثیم جو ۲۴ گھنٹے میں پیدا ہوتے ہیں ان کی تعداد سو ہزار ارب (۱۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰) ہوتی ہے۔

اب سوچئے کہ وائرس جراثیم جو ۱۵ منٹ میں بالغ ہو کر تولید مثل کے لئے تیار ہو جاتے ہیں یعنی یہ بیکٹیریائی جراثیم کے مقابلہ میں ۴۰ گنا تیزی سے بذریعہ تقسیم اپنی نسل بڑھانے کے لئے تیار ہو جاتے

۴۔ ایٹم کی غیر معمولی طاقت

ایٹم کا نیوکلیس جس کی تشکیل پروٹون اور نیوٹرون کے ذرات سے ہوئی ہے اس میں ایک عظیم اور غیر معمولی قوت ہے جو ایٹم کے نیوکلیس کے دل میں چھپی ہوئی ہے اور صحیح بات تو یہ ہے کہ یہ ذرات سوائے قوتوں اور طاقتوں کے اجتماع کے اور کچھ نہیں ہیں۔ لہٰذا جب یہ قوت ایٹم کے نیوکلیس سے آزاد ہو جاتی ہے تو ایک بڑی طاقت کو جنم دیتی ہے جس کے غیر معمولی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ عظیم طاقت ایک پراسرار طریقہ پر ایٹم کے نیوکلیس کے نہایت چھوٹے چھوٹے ذرات میں مقید ہو جاتی ہے اور اس کا آزاد ہونا اس قدر آسانی سے ممکن نہیں ہے بلکہ اس کے لئے بڑی بڑی برقی مشینوں کی ضرورت ہوگی [۱]

اب غور کیجئے کہ اگر یہ پاگل دیو جلدی سے اپنی زنجیریں توڑ کر آزاد ہونا چاہے اور اس ایٹم کو توڑ دے تو اس دنیا میں زندگی کا گزارنا کس قدر خطرناک اور مشکل ہو جائے گا۔

ایٹم کی قدرت کا ایک نمونہ

یہ ایٹم کی عظیم قوت جس میں انسانوں کے لئے بہت سے فائدے پوشیدہ ہیں لیکن بدقسمتی سے اس سے غلط کام لیا گیا اور جاہ طلب انسان نے جو ایٹم کے خالق کو نہیں جانتا' اسے (ایٹم کو) خطرناک اور نامناسب کاموں میں استعمال کیا اور کرایا ہے۔

ایسے عجیب آگ برسانے والے اور طاقتور ایٹم بم کی قوت کا نمونہ وہ ہے جب ایٹم کے پھٹنے سے اس کے اندر کی قوت باہر نکلتی ہے۔

ایٹم بم کے دھماکے کے لئے پہلا تجربہ سنہ ۱۹۴۵ء میں نیو میکسیکو کے بے آب و گیاہ ریگستان میں کیا گیا جس سے عجیب شور پیدا ہوا۔ ایٹمی سائنسدانوں نے ایک چھوٹے سے ایٹم بم کو خاص ترتیبوں اور وسیلوں

ہیں اور ۲۴ گھنٹے کی مدت میں یہ دنیا کے اندر کس قدر شور و غوغا اور وحشتناک کیفیت پیدا کر دینگے۔ اس بات کا ذکر کرنا بھی لطف سے خالی نہیں کہ وائرس جراثیم بھی اپنے وقت پر بیمار ہو جاتے ہیں اور ان کی بیماری کے عوامل وہ چھوٹے چھوٹے ذرات ہوتے ہیں جو بیکٹیریا فاژ کہلاتے ہیں اور یہی ان کی ہلاکت کا باعث ہوتے ہیں]

سے ایک فولادی مضبوط برج کے اوپر نصب کر دیا اور بہت دور سے اس کا دھماکہ کیا۔ اس دھماکہ سے ایک بجلی سی چمکی اور ایک شور برپا ہوا جس سے ۱۲ کلو میٹر ابر بلند ہوا جیسے کوئی درخت اگتا ہے۔ اس دھماکے کا زور اس قدر زیادہ تھا کہ جس وقت سائنسدانوں نے دھماکہ کے بعد موقعہ کا معائنہ کیا تو دیکھا کہ فولادی برج پگھل چکا تھا اور غیر معمولی حرارت کی وجہ سے وہاں کے بخارات بالکل ختم ہو چکے تھے۔

اسی سال دو ایٹم بم (البتہ چھوٹی قسم کے) امریکہ کی جانب سے جنگ جاپان میں استعمال کئے گئے ان دو میں سے ایک بم "ہیروشیما" پر گرایا گیا اور دوسرا بم تین روز بعد شہر "ناگاساکی" پر گرایا گیا [۱]

ہیروشیما کا بڑا شہر پہلے بم کے اثر سے ویران اور منہدم ہو گیا۔ کارپوریشن کے اعداد و شمار کے مطابق مرنے والوں کی مجموعی تعداد (جس میں فوجی اور غیر فوجی سب شامل ہیں) (۲۷۰،۰۰۰) افراد تک پہنچتی ہے (نقل از کتاب اتم نیروی نابود کنندہ و سازندہ۔ (ایٹم برباد کرنیوالی اور بنانے والی قوت)

بم کے پھٹنے کے چند سکنڈ بعد شہر کا حلیہ کامل طور پر بگڑ چکا تھا اور اس قدر ویرانی پھیل گئی تھی کہ وحشتناک ملبہ کے نیچے سے دلخراش آوازیں کانوں میں پہنچ رہی تھیں۔ بے گناہ بچوں عورتوں اور مردوں کے بکھرے ہوئے اعضاء ہر طرف نظر آ رہے تھے بعض لوگ جن کی جانیں سلامت رہ گئی تھیں ان کے جسموں پر اور چہروں پر ہولناک زخم لگے تھے اور بعض کی حالت پاگلوں جیسی ہو گئی تھی۔

دوسرے شہر میں بھی جس کی آبادی ۲۲۰،۰۰۰ تھی اور اعداد و شمار کے مطابق مرنے والوں اور زخمیوں کی تعداد ۱۳۸،۰۰۰ تھی (نقل از کتاب مذکورۂ بالا) اور بہت زیادہ لوگ مختلف امراض میں جو ایٹم کے پھٹنے کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے مبتلا ہو گئے ہاں متمدن انسان نے اس عجیب طبیعی قوت سے جو پہلا فائدہ حاصل کیا وہ یہ تھا۔

آخر کار جاپانی بھی پانچ روز کے بعد امریکیوں کے سامنے بلاشرط ہتھیار ڈال دیئے اور یہ ابتدا تھی وج

۱ [لیکن پیر روسو کتاب "از اتم تا ستارہ" میں یونانی فلسفی "لوقیوس" نامی کو ذیمقراطیس سے پہلے اس نظریہ کا حامی شمار کیا ہے اور ذیمقراطیس کو وہ "لوقیوس" کا شاگرد سمجھتا ہے جس نے اپنے استاد لوقیوس کے بعد اس نظریہ کی حمایت کی اور اس کے بعد "اپیقورس" کو بھی ایٹم کے نظریہ کے حامیوں میں شمار کیا ہے]

چھوٹے بموں سے کی گئی۔

لیکن آج خدا ہی جانتا ہے کہ عصر حاضر کی طاقتوروں میں کس قدر تخریبی قوت اور کس قدر ایٹمی آگ برسانے والے ہتھیاروں کا انبار اپنے پاس جمع کر رکھی ہیں لے

تعجب تو یہ ہے کہ ان وحشتناک ہتھیاروں میں دن بدن اضافہ کے باوجود تمام لوگ ایٹم کی قوت کے امن پسند استعمال کی حمایت کرتے رہتے ہیں اور امن کی خدمت کے لئے اس ذلیل ایٹم کی ضرورت کی ہمیشہ تکرار کرتے رہتی ہیں حالانکہ ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان ایٹمی ہتھیاروں کے وحشتناک مقابلہ سے انسانی خواہشات کا تکمیل پانا خواب وخیال سے بڑھ کر نہیں ہے۔

ایٹم کی باریک ساخت اور اس کی جسامت اور اس کا پر اسرار نظم وضبط جس کے متعلق (کتاب کے) ہر حصہ میں وضاحت کردی گئی ہے اور اس ایٹم کے اندر جو غیر معمولی قوت پوشیدہ ہے اگر اس کا توحیدی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو بلا شک ہماری نظر اس ایٹم کے پیدا کرنیوالی ہستی پر پڑتی ہے جو علم وقدرت کا ایک عظیم سرچشمہ ہے۔

کیا سچ مچ ایسا ہونا ممکن ہے کہ ان تمام منظم اسرار ودقائق کو جو ایک نہایت چھوٹے وجود میں موجود ہیں اسے ایسے اسباب کے تابع سمجھا جائے جو خود ان تمام باتوں سے بے خبر ہو یہاں تک کہ اس میں دو سال کے بچے کے برابر بھی شعور وعقل نہ ہو؟

[۱۔ مثلاً اپنے نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے جو دلیلیں وہ پیش کرتے ہیں وہ یہ ہیں:

نقطہ وجود رکھتا ہے ایسی صورت میں اگر نقطہ جوہر ہے تو ہمارا مطلب پورا ہو جاتا ہے اور اگر اس میں چوڑائی ہے تو اس کے لئے جگہ کی ضرورت ہوگی اور وہ جگہ یا تو قابل تقسیم ہوگی یا نا قابل تقسیم ہوگی۔ اگر قابل تقسیم ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ نقطہ قابل تقسیم ہے تو یہ بات مفروضہ کے برعکس ہوگی پس نقطہ کی جگہ وہی جزء لا یتجزیٰ ہے جو نا قابل تقسیم ہے۔

اسی لئے یہ بات کہی جاتی ہے کہ حرکت کا وجود ہے اور وہ قابل تقسیم نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کا ایک جزء دوسرے جزء پر مقدم ہو جاتا اور یہ بات بھی صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ اس مسافت کو بھی جس پر حرکت ہو رہی ہے غیر منقسم ہونا چاہئے۔ (نقل از شوارق جلد دوم)]

ہاں جو لوگ ان زندگی کے سرچشموں اور ان قوتوں سے استفادہ کرنے کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں عجیب نہیں کہ وہ ان توحیدی اسرار کے مطالعہ کی راہ میں جو ان موجودات کی پیشانی پر منقش ہیں اس سے بھی انحراف کا راستہ اختیار کریں اور اس سے بھی بے خبر رہ جائیں۔

ہمارے وجود میں تنظیم

انسان یا خلقت کے بھیدوں کا مجموعہ

تمام چیزوں کے مقابلہ میں خود ہم اپنے سے زیادہ نزدیک ہیں اور جن چیزوں کا ہم تمام موجودات میں مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ تمام چیزیں واضح طور پر خود ہمارے جسم میں پوشیدہ ہیں اس لئے ہمارے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم توحید کے بھیدوں کو اور تخلیق کائنات کے حیرت انگیز نظام کو صرف آسمانوں' کہکشانوں اور ایٹم کے دلوں کی گہرائیوں میں تلاش کریں لیکن خود اپنے وجود کی تخلیق کی باریکیوں اور نکات سے جن پر ہمیں عمر بھر دسترس حاصل رہتی ہے غفلت برتیں۔ خصوصاً اس لئے کہ ایسے مفید مطالعہ کے لئے ریاضی کے پر پیچ وخم حسابات یا اس جیسی کسی اور چیز کی ہمیں ضرورت نہیں ہے جیسا کہ آسمانوں اور ایٹموں کی تحقیقات میں ضروری تھی۔ اور ہم آہنگی اور نقشہ اور مقصد کی یگانگت کے موضوع کو جسے ہم نے اس سے پہلے ایک ضروری اصول اور نظم ونسق کا مظہر شمار کیا تھا اس پر اسرار کارخانے میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

اس کے علاوہ توحیدی وسائنسی فائدوں کے قطع نظر بدن کے اسرار ودقائق کے جاننے کا ایک اور فائدہ بھی ہے اور وہ یہ کہ ہم خودشناسی کے اثرات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ انسان جس وقت ان تمام حیرت انگیز اور اسرار خلقت سے جو اس کے بدن میں کار فرما ہیں واقف ہوتا ہے اور اپنے بدن کے رنگا رنگ کارخانہ کی کارگزاریوں کو جو اس کی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں دیکھتا ہے اور آخر میں ان عجیب نعمتوں سے جو اس کی ضروریات زندگی اور آسائش کے لئے باعث طمانیت ہیں اطلاع حاصل کرتا ہے تو خواہ مخواہ شکر گزاری کا جذبہ اس میں پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے خالق کے لطف اور عظمت کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور حد سے زیادہ محبت جو عجز وبندگی کا لازمہ ہے اپنے دل کی

گہرائیوں میں محسوس کرتا ہے۔

انسان شناسی

جو علوم انسان کے وجود کی پر اسرار ساخت کے بارے میں وضاحت کرتے ہیں ان علوم کو اصطلاح میں "انسان شناسی" کہا جاتا ہے۔ زمانہ قدیم سے ہر شخص اس عجیب مخلوق پر بحث و مباحثہ کرتا چلا آیا ہے لیکن ان علوم میں تین زیادہ دلچسپ اور زیادہ اہم ہیں اور وہ تین علم حسب ذیل ہیں:

۱۔ علم تشریح۔ جس میں بدن کے اجزاء اعضاء اور اس کی مختلف مشنریوں پر بحث کی جاتی ہے۔

۲۔ علم فزیالوجی (علم افعال اعضاء) جس میں اعضاء کے کام کرنے کے طریقوں اور بدن کی مشنریوں اور ان کے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تعلق اور ہر ایک فرائض کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔

۱۔[اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ اب ایٹم کے وزن میں اور الیکٹرونوں اور پروٹونوں کی تعداد میں ایک تناسب اور ایک باریک حساب ہوتا ہے کہ اگر اس کو ریاضی کے فارمولے کی صورت میں لے آئیں تو اس طرح ہوگا:

الیکٹرونوں کی تعداد – نیوٹرونوں کی تعداد

ایٹم کا وزن – پروٹونوں کی تعداد – نیوٹرونوں کی تعداد]

۲۔[ہر ایٹم کا قطر ایک ملی میٹر کا ایک کروڑواں حصہ ۱/۱۰۰۰۰۰۰۰ ملی میٹر ہوتا ہے اور ایٹم کو تشکیل دینے والے اجزاء اور ذرات کا قطر خود ایٹم کے ۱/۱۰۰،۰۰۰ قطر کے برابر ہوتا ہے یعنی ایک ملی میٹر کا ایک بٹے ایک سو ملیارد ۱/۱۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ ملی میٹر ہوتا ہے۔

یعنی ایٹم کے اجزاء کی پیمائش ایٹم کی نسبت سے اس قدر چھوٹی ہے کہ اگر ہم ایٹم کے ایک دانہ کو ایک بڑے گینڈ کے برابر فرض کرتے ہیں تو اس کے الیکٹرونوں کا حجم مٹی میں پڑے ہوئے ایک دانہ کے برابر ہوگا یعنی دو بٹے دس (۲/۱۰) ملی میٹر اس کا حجم ہوگا۔

اور ایٹم کے حیران کن نکات میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ اس کا وزن بھی ہے جو اتنا کم ہے کہ ہم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے الیکٹرونوں کا وزن گرام کے مطابق (۱/۱۰۰۰ کلوگرام) حسب ذیل عدد کے برابر ہے: (۰۰۹،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۶۰) (نقل از کتاب اتم تا ستارہ)]

۳۔ نفسیات (سائیکولوجی)۔ جس میں زندگی کی مختلف کیفیتوں اور ان کے اصولوں پر گفتگو کی جاتی ہے۔

البتہ جو باتیں ہمارے توحیدی مطالعوں میں پیش نظر ہیں ان میں سب سے بہتر اعضاء کے افعال بدن کے اہم کارخانوں اور ان توحیدی نازک باتوں اور بھیدوں کی تحقیق ہے اور اسی ضمن میں ہم بدن کے اعضاء کی تشریح سے بھی ایک حد تک واقفیت حاصل کرلیں گے لیکن ہم از سر نو یہ بات یاد دلاتے ہیں کہ ان مطالعات سے ہمارا اصلی مقصد اس جہان ہستی کے مختلف کارخانوں کے نظم و ضبط کو چلانے والے کی تحقیق کرنا ہے۔

بدن کے حساس مراکز اور کارخانے

انسان کے بدن کی عمارت میں کئی مشنریاں ہیں جو مختلف اعضاء سے مرکب ہیں اور انسان کے اعمال حیاتی کو سرانجام دیتی ہیں۔۱

ان مشنریوں کو ان کے کام اور مقصد کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

سب سے پہلے جسم کی عام مشنریاں ہیں جن کے عمل اور جن کے کام کے نتیجہ عمومی ہیں اور ان مشنریوں کا تعلق پورے جسم سے ہیں ان میں سے سب سے بہتر چار بڑی مشنریاں ہیں: "ہاضمہ کی مشنری"، "گردش خون کی مشنری"، "سانس لینے کی مشنری" اور "رابطہ کی مشنری"۔

بدن کی دوسری چھوٹی مشنریاں جیسے: "آنکھ"، "کان" اور "اعضای تناسل" وغیرہ ہیں۔ ہر ایک کے متعلق اس کے مقام پر علیحدہ بحث ہوگی۔

اس سے پہلے کہ ہم بدن کی مختلف مشنریوں کے توحیدی اسرار اور نظم و نسق کی باریکیوں کے مطالعہ میں مصروف ہوں حسب ذیل دو دلچسپ موضوعات پر توجہ کرنا ضروری ہے:

۱۔[اسی ترتیب سے اگر تمام کرۂ زمین کے ایٹمی ذرات اور اجزاء کو دبا دیا جائے تو اس کا حجم باوجود اس تمام عظمت کے ایک نارنگی کے برابر ہو جائے گا جبکہ اس کا وزن وہی موجودہ زمین کے وزن کے برابر یعنی ۵۹۷۴ ارب ارب (۵۹۷۴ × ۱۰) ٹن ہو جائے گا]

وہ اینٹیں جو بدن انسانی کی تعمیر میں استعمال کی گئی ہیں

جس طرح ایک بڑی عمارت چھوٹی چھوٹی اکائیوں جیسے پتھر اور اینٹ سے مخصوص طریقوں اور ترتیب سے بنائی جاتی ہیں اسی طرح جانداروں کے بدن کی عمارت بھی چھوٹی چھوٹی اکائیوں سے تشکیل پائی ہے اور ایک خاص نقشہ اور خاص ترتیب کے ماتحت ان کے بدن کی یہ تمام خوبصورت اور گوناگوں مشنریاں اور اعضا وجود میں آئے ہیں۔

لیکن فرق یہ ہے کہ جانداروں کے جسم کو تشکیل دینے والے اکائیاں جاندار ہیں اور ان میں کی ہر ایک اکائی حیات کی مستقل اکائی ہے اور جسم کے تمام اعضا کی اکائیاں ایک جیسے نہیں ہیں اور ہر عضو کو ایک خاص اکائی تشکیل دیتی ہے اس میں اور دوسری اکائیوں میں کافی فرق ہے۔ اس کے باوجود یہ اکائیاں ایک دوسرے سے جدا اور علیحدہ نہیں ہوتے بلکہ ان میں کامل اتحاد عمل ہوتا ہے۔

عام طور پر روئے زمین کے تمام زندہ موجودات خواہ وہ ایک خلیہ کے جاندار ہوں خواہ دریائی بڑے

---

۱ [یورینیم کے ایٹم میں اور اس کے مشابہ بعض دوسرے ایٹموں میں جیسے ریڈیم بہت ہی دلچسپ موضوع ہے اور اسے ہم ایٹموں کی زندگی اور موت کا نام دیں گے اس کی تفصیل یہ ہے کہ ریڈیو ایکٹویٹیز کے انکشاف کے سلسلے میں جو تجربے کئے گئے تھے اس سے ظاہر ہوا کہ یورینیم ہمیشہ اپنے میں سے انرجی خارج کرتا رہتا ہے (پیدائش) کہ جس کا منبع خود ریڈیو ایکٹیو کے جسم کے سوا اور کوئی نہ تھا اور اس طرف بھی توجہ کی گئی کہ جسم مذکور سے ریڈان نامی ایک گیس نکل رہی ہے کہ ریڈیم سے پیدا شدہ اس گیس کا اثر چار روز بعد بالکل ختم ہوجاتا ہے۔ (موت) اور اس ذریعہ سے دو مشہور دنیاوی باتیں جیسا کہ ''لاوازیہ'' کہتا ہے ''کوئی چیز عدم سے وجود میں نہیں آتی اور کوئی موجود چیز معدوم نہیں ہوتی'' وہ تمام قدامت اور اعتبار جو بعض علوم طبیعی کے ماہروں کی نظر میں تھا وہ جاتا رہا اور ان سب کو باطل تصور کیا گیا لیکن افسوس اس کا ہے کہ مذکورالصدر فرض کی ہوئی بات اب بھی بعض پرانی کتابوں میں بغیر کسی رد و بدل کے مل جاتی ہے]

۲ [البتہ خاص شرائط کے ماتحت ممکن ہے کہ الیکٹرونوں کی رفتار اور بھی زیادہ ہو جائے اور اس غرض کے لئے برقی رو سے زیادہ استفادہ کیا جا سکتا ہے اور ممکن ہے کہ اس طرح الیکٹرونوں کی رفتار ۲۰۱ ہزار کلومیٹر فی سکنڈ تک پہنچ جائے]

بڑے اور دیو پیکر حیوان ہوں ان تمام کی تعمیر انہیں زندہ اکائیوں سے ہوئی ہے اور انسان جو اس حیرت انگیز اور خوبصورت جسم کا مالک ہے وہ بھی انہیں موجودات میں سے ایک ہے اور یہی اکائیاں جنھیں خلیہ کہا جاتا ہے حیوانی اور نباتی زندگی کی بنیاد اور اساس سمجھی جاتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ انسان کے تمام اعضا اور بدن کی تمام مشنریاں خلیات سے تشکیل پائی ہیں جن کا ہر ایک خلیہ جاندار ہیں اور وہ آپس میں کامل اتحاد عمل رکھتے ہیں اور مجموعی طور پر ایک ہی مقصد کے حصول کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں۔

ایک خلیہ کی جسامت

خلیئے عام طور پر چند مائیکرون کے برابر ہوتے ہیں اور ان میں اکثر ایسے ہوتے ہیں جن کی جسامت مائیکرون کے چند دسویں حصوں سے بڑھ کر نہیں ہوتی۔ ان میں سے بعض ۱/۵ ملی میٹر اور بعض ۱/۲ ملی میٹر کے ہوتے ہیں اور اگر ہم معمولی آنکھ سے بغیر آلات کے ان خلیات کو غور سے دیکھیں تو ہم ان کا مشاہدہ کر سکتے ہیں کیونکہ انسانی نظر ۱/۱۰ ملی میٹر کا مشاہدہ کر سکتی ہیں لیکن ان کے مختلف قسموں کے مشاہدہ کے لئے مخصوص آلات کی ضرورت ہے کیونکہ ان کو دیکھنا ہماری آنکھ کی قوت سے بالاتر ہے۔ ایک خلیہ کے جسم کی اس طرح تشریح کی جاتی ہے جیسے ایک انسان کے بدن کی اور خلیات کے مطالعہ اور اس کی تشریح کے لئے مائیکروسکوپ اور مخصوص اوزار ''مائیکروٹوم'' کا استعمال کیا جاتا ہے اور حیاتی رنگوں Colorant vital سے استفادہ کیا جاتا ہے اور انہی ذرائع کے وسیلہ سے انسان نے خلیات کی پر اسرار ساختوں کی کئی قسموں کا پتہ لگایا ہے اور ان میں زندگی کی کارکردگی کا مطالعہ کیا ہے۔

آیئے بدن کے خلیات کی گنتی کریں

ان تمام چھوٹے اور بڑے جانداروں میں ایسے موجودات بھی ہیں جو سر سے پاؤں تک صرف ایک خلیہ سے بنے ہوئے ہیں ان جانداروں کو ''ایک خلیہ والے'' جاندار کہا جاتا ہے۔ اور وہ انواع و اقسام کے ہیں۔ اور یہ عام طور پر کھڑے ہوئے پانی میں ایک بڑی تعداد میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

لیکن اگر ایک معمولی انسان کے جسم کے خلیات کا شمار کریں تو ان کی تعداد ایک بے انتہا بڑے عدد

کے برابر ہو جائے گی جس کو گننے یا اس کا تصور کرنے کی بھی ہم قدرت نہیں رکھتے۔ آپ جانتے ہیں وہ عدد کیا ہے؟ ایک عام انسان کے جسم کے خلیات کی اندازاً تعداد کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک ایسا عدد ہے جو ایک کے ہندسہ پر ۱۹ صفر بڑھانے سے حاصل ہوگا۔ (۱۰) یعنی دس میلینی ارب کے برابر ہوگا۔ (۱۰/۰۰۰/۰۰۰/۰۰۰/۰۰۰/۰۰۰/۰۰۰) اس عدد کی بزرگی اتنی زیادہ ہے کہ اگر ہم صرف اس کو گننا چاہیں اور اس میں بہت زیادہ پھرتی دکھائیں اور ہر سکنڈ میں ۱۰۰۰ تک شمار کریں اور دن رات اور ماہ و سال مسلسل کام کریں تو اس کام سے عہدہ برآں ہونے کے لئے ۳۰۰ ہزار سال سے بھی زیادہ مدت درکار ہوگی۔

خلیات کی پر اسرار ساخت

خلیات جو ہر بدن انسانی، تمام جانداروں کے اجسام اور زندگی کی بنیاد ہیں وہ معمولی اور سادہ نہیں ہیں اور جیسا کہ ہمیں آئندہ پتہ چلے گا ان کی ساخت مختلف حصوں سے تشکیل پائی ہے جن میں سے ہر ایک خدائے تعالیٰ کی معرفت وشناسائی اور اس کی قدرت اور علم کا ایک دفتر ہے۔

عام طور پر ایک خلیہ تین اہم چیزوں نیوکلیس (کے درمیان) اور باہر کا پوست (غشاء) اور ایک شفاف مادہ جو انڈے کی سفیدی کی مانند (ان دونوں کے درمیان) ہوتا ہے سے تشکیل پاتا ہے۔ اب یہ تین مذکورہ چیزیں بھی سادہ نہیں ہیں۔ یہ بھی خاص اور اہم اجزاء سے تشکیل پائی ہیں[1]

لیکن اس کے باوجود خلیات کی ساخت بہت نازک ہوتی ہے اس قدر کہ بعض خلیات کے غشا یعنی اوپر کی جھلی کی جسامت ایک مائیکرون ہوتی ہے یعنی خلیہ کے ہزار پوستوں کو ایک ساتھ رکھ دیں تو ان کی موٹائی ایک ملی میٹر سے زیادہ نہ ہوگی۔ جیسا کہ سابق میں بیان کیا جا چکا ہے ایک خلیہ کا بھی ایک انسان کے جسم کی طرح تجزیہ کیا جا سکتا ہے اور اس کام کے لئے ابتداء ایک خلیہ کو مائیکروسکوپ کے سامنے رکھ کر اس کے اجزاء کو رنگین کیا جاتا ہے تا کہ اچھی طرح قابل دید ہو جائے پھر بہت ہی باریک سوئیوں سے اس خلیہ کو چیر کر اس کا تجزیہ کرتے ہیں اور ان خلیات کے آپریشن میں جن آلات کا استعمال کیا جاتا ہے اس کا نام "مائیکروٹوم" ہے۔ بعد میں ان کا مشاہدہ کرنے کے لئے ان حاصل شدہ ٹکڑے کو خاص رنگ

سے رنگ دیتے ہیں اور ایسے بھی خاص آلات وافر موجود ہیں جن کی مدد سے رنگین خلیہ کے پوستہ کی کاٹ چھانٹ کئے بغیر اس کے اندرونی حصہ میں انجکشن لگا کر اس کے بے رنگ (غشاء) کے باہر سے رنگے ہوئے حصہ کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

ان آلات کی نزاکت بہت دلچسپ ہے۔

خلیات کے حیاتی کام

تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ہر خلیہ اکیلا ہی انسانوں اور خلیات سے بھر پور تمام جانداروں کی طرح زندگی کے افعال کو پوری طرح سر انجام دیتا ہے۔ خلیہ کی زندگی کی کارکردگی میں تغذیہ، ہضم، جذب، دفع اور تحریک[1] اور تولید نسل شامل ہیں۔

خلیہ ابتداءً اپنے احاطہ کے غذائی مواد کو قابل جذب بناتا ہے اور ایک مادہ جس کا نام "دیاستاز" ہے اپنے میں سے خارج کر کے اسے ہضم میں شامل کرتا ہے۔

اور اس کے بعد ہضم شدہ غذائی مواد کو جذب کے اندر داخل کر کے فضلات کو جو خلیات والے اجسام کا دفع شدہ مادہ ہوتا ہے اپنے سے باہر نکال دیتا ہے۔

جذب شدہ مواد کا ایک حصہ خلیہ کو حرارت اور طاقت بہم پہنچاتا ہے اور دوسرا حصہ مختلف ترکیبوں کی صورتوں میں خلیات کے نشوونما میں کام آتا ہے۔[2]

خلیہ تغذیہ اور نمو کے اثر سے اس مرحلہ میں پہنچ جاتا ہے کہ اب اس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ خلیہ کی تولید نسل تقسیم کے ذریعہ عمل میں آتی ہے۔ ایک خلیہ دو زندہ خلیہ میں تقسیم ہو جاتا ہے اور پھر وہ دونوں علیحدہ علیحدہ اپنی زندگی کی کارکردگی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

دس ملین ارب دلیلیں

اب ملاحظہ کیجئے کہ ایک خلیہ جو اس قدر نازک اور چھوٹا ہے اس کے وجود کے اندر یہ تمام نکات اور حیران کن اسرار اور تنظیم کی پیچیدگیاں پوشیدہ ہیں۔ کیا یہ سب باتیں ان علتوں اور اسباب کا نتیجہ ہو سکتی ہیں جو طبیعی شعور اور عقل سے محروم ہوں؟

سچ تو یہ ہے کہ اگر اس دنیا میں سوائے ایک خلیہ کے اور کچھ بھی نہ ہوتا تو کیا ایک با مقصد اور عقل وقدرت والے وجود کو ثابت کرنے کے لئے یہی کافی نہ تھا؟ ہاں انسان کے جسم کا ہر خلیہ حق کا ایک نشان' خداشناسی کی ایک دلیل اور اس کے نظم ونسق کی دلیل کا ایک واضح نمونہ ہے۔

لیکن خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے کس قدر دلیلوں کی ضرورت ہے؟ کیا دس ملین ارب دلیلیں کافی نہیں ہیں؟ ہاں! دس ملین دلیلیں کہ جن کے صرف شمار کرنے میں ۳۰۰ ہزار سال کا وقت درکار ہے۔

خلیات کا توحیدی دلچسپ اور اہم ترین نکتہ وہی زندگی سے مربوط بھیدوں کا ہے جن کا شمار آج تک اس عظیم کائنات کے کارخانے کے معموں اور پر اسرار لاینحل مسائل میں ہوتا ہے جس طرح کہ تمام دانشور' زندگی کے اس زبردست معمے کے مقابلے میں عاجز آ چکے ہیں اور آج تک وہ ان عوامل کے بارے میں جنہوں نے خلیہ کو زندگی بخشی ہے کوئی اطمینان بخش توضیح پیش کرنے کے قابل نہ ہو سکے۔

انسان کے وجود کا سرچشمہ

یہ بات درست ہے کہ ایک معمولی انسان کے بدن کی ساخت طرح طرح کے دس ملین ارب خلیات سے تشکیل پائی ہے لیکن یہ بات بھی جانی چاہئے کہ اس کا ابتدائی وجود ایسا نہ تھا بلکہ ابتدائی مراحل میں وہ ایک نہایت چھوٹے اور سادہ نطفے کی شکل میں وجود میں آیا اور کئی منزلوں سے گزر کر وہ دس ملین ارب خلیات والے انسان کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور وہ اس ترتیب سے کہ ابتدا میں انسان کا پہلا نطفہ (تخم) دو خلیوں کی آمیزش اور ترکیب سے جن میں ایک نر خلیہ ''اسپرماتوزئید'' نامی اور دوسرا مادہ خلیہ ''اوول'' نامی ماں کے رحم میں داخل ہوتا ہے۔ یہ نطفہ بھی متواتر تقسیم کے ذریعہ جلد ہی نشوونما پا کر

[۱۔ ایٹم بم میں دھماکہ اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ ایٹم کے دو یا چند قابل دھماکہ ٹکڑوں (یو۔۲۳۵) کو اچانک ایکدوسرے کے نزدیک کر دیتے ہیں تاکہ ان کے اجسام ایک مقدار کے ہو جائیں۔ ماہرین طبعیات اسے جرم بحرانی (بحران کی صورت میں بننے والا جسم) کہتے ہیں اور اس وقت اس میں قوت باہر سے پہنچائے بغیر خود بخود اس میں دھماکہ شروع ہو جاتا ہے اور قوت کی غیر معمولی زیادتی کے نتیجہ میں جو شکل حرارت موجود ہوتی ہے وہ ابھر آ جاتی ہے۔ (نقل از کتاب آزمایشہای اتمی ص ۱۵۶)

جنین کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور جنین بھی آخر کار کئی منازل طے کر کے انسان کے مکمل بچے کی شکل میں اختیار کر لیتا ہے [1]

جنسی نر خلیئے جو مرد کی مخصوص جنسی مشری میں بنتے ہیں جن کی شکل تقریباً تکلے جیسی ہوتی ہے اور ان کی لمبائی تقریباً ۲۰۰ مائیکرون ہوتی ہے اور مادہ خلیئے بھی عورت کی مخصوص بچہ دانی میں پیدا ہوتے ہیں جو عام طور پر گول شکل کے ہوتے ہیں جن کا قطر ۲۰۰ سے ۳۰۰ مائیکرون تک ہوتا ہے [2]

(مادہ خلیئے' نر خلیوں کے مقابلہ میں نارنگی کی طرح کے ہیں اور نر خلیئے معمولی بڑھئی کی طرح ہیں) البتہ نر خلیوں کی ترکیب کی کیفیت مادہ خلیوں کے مقابلے میں اور تخم کے نمو کے مراحل کی داستان بہت طویل ہے جو اس کے علیحدہ علم ''اسپریولوژی'' (علم جنین شناسی) نامی میں تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی جائے گی [1]

سچ تو یہ ہے کہ اگر انسان اپنے ابتدائی وجود کے مراحل کو یاد رکھے اور اپنی پیدائش اور وجود میں آنے کا باریکی سے مطالعہ کرے جبکہ اس میں فطری وجدان سے انحراف پیدا نہ ہو گیا ہو تو اس سے نہ صرف اس کی خود پسندی' مظالم بلکہ آخر میں اس کا غرور و تکبر بھی جاتا رہے گا بلکہ وہ اپنا سر تسلیم اس پروردگار کی پر عظمت بارگاہ میں بلا تاخیر خم کر دیگا جس نے اسے اس کمزور حقیر اور ناتوانی کی حالت سے نکال کر موجودہ حالت تک پہنچایا اور ایمان اور محبت بھرے دل سے کہے گا: ''اے عظیم پروردگار! تو نے ان تمام حیرت انگیز اسرار اور حیران کن نکات کو بے مقصد اور فضول نہیں پیدا کیا۔''

لیکن کس قدر افسوس امقام ہے کہ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ ان حقائق سے چشم پوشی کریں اور غفلت

البتہ جاننا چاہئے کہ یہ معلومات بہت ہی مجمل اور مبہم ہیں جنھیں سائنسدانوں کی تحریرات میں دیکھا جا سکتا ہے ورنہ ایٹم کے پھٹنے کی کیفیت کی تفصیلات جنگی اور سائنسی اسرار میں سے ہے کیونکہ جو بڑی سلطنتیں جن کی رسائی ان تک ہو گئی ہے اس کو پوشیدہ رکھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں]

[1] [جو بم شہر ہیروشیما پر گرایا گیا وہ یورینیم کا ایٹم نمبر ۹۲ تھا جس کی اٹمی وزن ۲۳۸ اور جو بم ناگاساکی پر گرایا گیا تھا وہ پلاٹینم کا بم نمبر ۹۴ تھا جس کا اٹمی وزن ۲۳۹ تھا]

ہرتیں۔

اب جبکہ خلیہ اور نطفہ کے مطالعہ سے جو کہ اینٹوں کی طرح ہیں جن سے عالیشان عمارتیں بنتی ہیں، ہم نے فراغت حاصل کرلی ہے۔ بہتر ہے کہ بدن کی چند اہم مشنریوں کا جہاں تک ہمارا یہ مختصر سفر ہمیں اجازت دے کریں، یہ ظاہر ہے کہ اس پر صرف طائرانہ نظر ڈالنے کے لئے بھی کئی ماہ چاہیے۔

بدن کا آبدارخانہ اور باورچی خانہ

(ہاضمہ کی مشین)

ہاضمہ کی مشین جو انسان کے بدن کی سب سے زیادہ اہم مشنری ہے اس کے ذمہ بدن کی غذائی ضروریات کی تکمیل ہے اور اس مشنری کی اہمیت بدن کی زندگی کے سلسلہ میں اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے معطل ہو جانے کی صورت میں عام طور پر انسان کے زندہ رہنے کا امکان باقی نہیں رہتا۔

یہ مشنری جسم کے چند اعضاء اور چند ذیلی مشنریوں سے تشکیل پائی ہے جو ایک نظم اور ہم آہنگی اور بے نظیر اتحاد عمل کے ساتھ غذائی مواد کو باہر سے حاصل کر کے اسے اپنی رات دن کی مسلسل کارکردگی کے ذریعہ ایسی صورت میں تبدیل کر لیتی ہے جو خون میں شامل ہو کر خلیات کی غذا بن سکے۔

بیرونی غذائیں عام طور پر اس قابل نہیں ہوتیں کہ براہ راست جزو بدن انسانی ہو جائیں۔ اس حقیقت کو جاننے کیلئے یہ بات ضروری ہے کہ دودھ سبزی اور میوے کی ایک خاص مقدار کا انسان کے گوشت، خون اور پوست سے تقابل کیجئے اور دیکھئے کہ ان میں کس قدر فرق ہے اس سے قطع نظر کہ وہ تمام کے تمام بدن کے لئے کارآمد نہیں ہیں [1]

لیکن اس قسم کا غذائی مواد بدن کی قوت، حرارت اور خرچ شدہ مواد کی جگہ لے لیتا ہے اور ضروری

[1] [سب سے زیادہ خطرناک بم جو ایٹم بم سے بھی زیادہ دھماکہ آمیز اور زیادہ تباہ کن ہے وہ ہیڈروجن بم ہے اس سے پیدا ہونیوالی تخریبی قوت اور انرجی ایٹم بم سے حاصل شدہ طاقت کے مقابلہ میں دو ہزار گنا سے بھی بڑھ کر ہے۔ ان آگ برسانے والے بموں کے لئے کئی ملین درجہ حرارت درکار ہے جو ایک ایٹمی بم کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہے یعنی ایک ہیڈروجن بم کے چلانے کے لئے پہلے ایک ایٹم بم چلانا پڑتا ہے تا کہ اس سے پیدا شدہ حرارت ہیڈروجن بم کو چلا سکے]

حصے حل ہو کر مناسب شکل اختیار کر لیتے ہیں اور باقی زائد حصے (فضلات) دفع ہو جاتے ہیں۔

یہ تمام کام چند مرحلوں میں ہاضمہ کی مشین کے اندر انجام پذیر ہوتے ہیں۔ اب ہم ان کی اہم قسموں کی تفصیل بیان کریں گے۔

۱۔ غذا کا حلق کے راستے سے گزرنا

غذا جب پہلی مرتبہ منہ کے حدود میں داخل ہو جاتی ہے تو اس کو ہضم کی تیاری کے سلسلے میں نرم ہونا پڑتا ہے اور وہ تقریباً مائع کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ کام ہاضمہ کی مشنری کی چوکھٹ پر انجام پاتا ہے اور اس خدمت کو انجام دینے والے ۳۲ مضبوط دانت، دو مضبوط اور قوی جبڑے اور تین جوڑ لعاب کے غدود ہیں جو زبان کی زیر نگرانی کام انجام دیتے اور اس سے ہدایت حاصل کرتے ہیں اس ترتیب سے:

جس وقت غذا منہ کے احاطہ میں داخل ہوتی ہے تو نچلا جبڑا اپنی اس عجیب قدرت کے تحت دانتوں کو کام میں لگا دیتا ہے۔ دانت بھی جن کی تین ممتاز قسمیں ہیں اپنا کام شروع کر کے غذا کو کاٹ کر اور چیر کر چورا چورا کر دیتے ہیں۔

ایک طرف لعاب کے چشمے اپنا کام شروع کر دیتے ہیں اور خاص لیسدار مائع خارج کر کے دانتوں کے کام کو آسان بناتے ہیں اور غذا کو چبانے اور نرم کرنے کے کام کی تکمیل کرتے ہیں۔ زبان نے اپنے ذمہ ڈھکیلنے کا کام لے رکھا ہے اور اپنی ماہرانہ اچھل کود سے غذا کے ٹکڑوں کو اس طرف اور اس طرف لے جاتی ہے اور چبائی ہوئی غذا کو پیچھے ڈھکیل کر اس غذا کو جو ابھی چبائی نہ گئی ہو دانتوں کے نیچے لے آتی ہے
۔

اس بات کی تو آپ بھی تصدیق کرینگے کہ زبان کا کام خطرناک ہے لیکن وہ اپنے کام میں اس قدر ماہر اور رشاق ہے کہ اس پورے وقت میں اپنی جان کو ہمیشہ دانتوں کے نشتروں سے سلامت نکال لے جاتی ہے اور شاید ہی کبھی ایسا اتفاق ہوتا ہوگا کہ انسان اپنی زبان کو چبا ڈالے اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ انسان کو متنبہ کرتی ہے کہ اگر کام میں نظم نہ ہوتا تو ہر بار غذا کے چباتے وقت زبان بھی غذا کے ساتھ چبائی جاتی۔

آخر کار کئی کاموں کی انجام دہی کے بعد غذا کو گلے کی سرحد سے گزر کر معدہ کی طرف جانے کی اجازت مل جاتی ہے۔

دانتوں کی تنظیم

۳۲ دانتوں کی تعداد تکمیل ۲۰ سال کی عمر تک ہو جاتی ہے۔ یہ جبڑوں کے دونوں طرف خاص نظم و ترتیب سے موجود ہیں۔ یہ شکل اور کارکردگی کے لحاظ سے تین حسب ذیل گروہوں میں تقسیم ہیں۔

آٹھ عدد سامنے کے دانت جنہیں ''اگلے دانت'' کہا جاتا ہے ان کا کام غذا کو کاٹنا ہے اور چار دانت ''ثنایا'' کے دونوں طرف ہیں ان کو کونچلی کہا جاتا ہے۔ تیز ہونے کی وجہ سے یہ غذا کو کاٹنے میں مدد دیتے ہیں۔ آٹھ عدد چھوٹے ڈاڑھ ہیں جو کونچلیوں کے برابر میں آخر میں بارہ بڑے ڈاڑھ ہیں جو چوڑے اور ابھرے ہوئے ہیں۔ یہ غذا کو پیسنے میں بالکل چکی کی طرح کام کرتے ہیں۔

البتہ ان میں سے آدھے اوپر کے جبڑے میں ہوتے ہیں اور آدھے نیچے کے جبڑے میں۔

لعاب کے چشمے

تین جوڑ لعاب کے چشمے جو منہ میں موجود ہیں اس قدر حساس اور بیدار ہیں کہ جونہی انسان غذا کو دیکھتا ہے یا اس کا تصور کرتا ہے تو وہ کام کرنا شروع کر دیتے ہیں اور لعاب کے مخصوص مائع کو خارج کرنے لگتے ہیں۔

لعاب کی مقدار رات دن میں ۳۰۰ گرام سے ۱۰۰۰ گرام تک ہوتی ہے جس کی سالانہ مقدار تقریباً ۳۰۰ کلوگرام تک پہنچ جاتی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مذکورہ غدود جن کی ایک جوڑ منہ کے آخری اور حلق کے ابتدائی حصہ میں ہے اور ایک دوسری جوڑ نچلے جبڑے میں اور تیسری جوڑ بھی زبان کے نیچے ہے تو یہ تینوں ایک قسم کا لعاب پیدا نہیں کرتے بلکہ ہر ایک، ایک مخصوص لعاب خارج کرتا ہے جو دوسرے لعاب سے علیحدہ ہے اور اس لحاظ سے ہر ایک غدود کا ایک علیحدہ کام ہے۔

یہ مائعات غذا کو نرم کرنے، اس کو پھسلانے اور نگلنے میں سہولت پیدا کرنے اور اسی طرح کھانا ہضم

کرنے میں کافی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ منہ میں ایک قسم کی آمادگی اور دائمی تازگی پیدا کرتے ہیں۔

زبان کی شیریں کاری

زبان غذا کے چبانے کے وقت پکڑ دھکڑ اور مار دھاڑ میں عجیب و غریب کارگزاری دکھاتی ہے۔ منجملہ ان کے اس کا کام آئی ہوئی غذاؤں کی نگرانی اور ان کی پڑتال کرنا ہے جس طرح ایک ماہر فن آنے جانے والوں کی نگرانی کرتا ہے اسی طرح یہ چکھنے سے کھٹے، میٹھے اور کڑوے وغیرہ میں امتیاز کرتی ہے اور آخر کار ایک سوپر (جھاڑو دینے والی) کا کردار ادا کرتی ہے اور اپنی مخصوص حرکتوں سے منہ کے اندر گوشوں اور کناروں میں جھاڑو دیکر دانتوں کے درمیانی حصوں کو صاف کرتی ہے اور اس تمام کام کو پوری مہارت اور احتیاط سے انجام دیتی ہے اور ضمناً نگلنے میں کافی مدد دیتی ہے۔

آخر کار یہ تمام خدمات جو آدھے منٹ سے بھی کم مدت میں انجام پاتی ہیں جبڑوں، دانتوں، لعاب والے غدودوں اور زبان کے اتحاد عمل سے نرم غذا، مائع اور پھسلنے والی بن کر (حلق سے) نیچے اترنے کے لئے آمادہ ہو جاتی ہے۔

البتہ جاننا چاہئے کہ اس مرحلہ پر غذا ایک حد تک ہضم ہو جاتی ہے اور لعاب کے خارج ہونے کی وجہ سے عمل اور رد عمل شروع ہو جاتا ہے لہٰذا صحت کے لحاظ سے ضروری ہے کہ غذا کو منہ کے اندر خوب اچھی طرح چبایا جائے جیسا کہ ایک دانشور کہتا ہے:

۱[البتہ جاننا چاہئے کہ جانداروں کی فیزیالوجی (علم افعال اعضاء) میں انسان کے اعمال حیاتی کو عام طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱۔ غذا کے ہضم کا عمل جو خون کی گردش جذب تنفس اور مدافعت کی اجتماعی مشنریوں کی ذریعہ سے تکمیل کو پہنچتا ہے۔

۲۔ ارتباط کا عمل دماغ کی مخصوص اور سلسلۂ اعصاب کے ذریعہ مکمل ہوتا ہے۔

۳۔ اپنی نسل کی افزائش کا عمل تناسل کی مشنری کی ذریعہ پورا ہوتا ہے]

"خدا نے انسان کو ۳۲ دانت دیئے تاکہ ہر ایک لقمہ کو دانتوں کی تعداد کے مطابق ۳۲ مرتبہ چبیے"

۲۔ نگلنا اس قدر آسان بھی نہیں ہے

جس وقت غذا نرم اور مائع اور گولہ کی شکل میں پھسلنے والی بن جائے تو چاہیئے کہ منہ کو بند کر کے ہاضمہ کی دوسری مشنری میں اس کو منتقل کر دیا جائے یہ کام نگلنے کے میکانکی عمل سے انجام پاتا ہے۔

عام طور پر آسان کاموں کو نگلنے سے تشبیہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں شخص کی جائداد یا پیسے کو نگل لیا لیکن گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ نگلنے کا کام اتنا سہل اور آسان نہیں ہے کیونکہ نگلنے کے میکانکی عمل کو مکمل ہونے کے لئے ابتداء ضروری ہے کہ حلق کے تمام راستے پوری طرح کنٹرول میں ہوں اور بند ہوں اور غذا صرف اس راستے سے داخل ہو جو معدہ تک پہنچتا ہے۔

جن راستوں کا غذا کے حلق سے اترتے وقت بند رہنا ضروری ہے وہ یہ ہیں: سانس لینے کا راستہ جو حلق اور گردن کے سامنے کے حصہ میں واقع ہے اور ناک کا راستہ اور کانوں کا راستہ ان راستوں پر متعین نگہبان اس قدر حساس اور فرض شناس ہیں کہ رات دن میں ایک لحہ بھی اپنے عظیم فرض کی انجام دہی میں غفلت نہیں کرتے۔ جونہی غذا حلق کی دہلیز پر پہنچ جاتی ہے یہ تمام (نگہبان) ایسے سپاہیوں کی طرح جو ایک حاکم کے تابع ہوں ہم آہنگی اور کامل نظم و ضبط کے ساتھ کام شروع کر دیتے ہیں اسی ترتیب کے ساتھ کہ:

نرم ہڈی والی کھڑکی (اپی گلوٹ) حلق کے راستے اور پھیپھڑوں کے راستے کو بند کر دیتی ہے۔ چھوٹی زبان بھی ناک کے راستے پر آڑی لٹک جاتی ہے اور آخر کار مخصوص پٹھے اور عضلات ناک کے راستے کو بالکل بند کر دیتے ہیں۔ اس وقت زبان کی نوک منہ کی چھت پر ٹیکا لگا کر نوالہ کو پیچھے دھکیل دیتی ہے اور پھر نرخرہ بھی اوپر ہو جاتا ہے اور حلق کے پٹھوں کے سکڑنے کی وجہ سے جو ایک میکانکی عمل اور رد عمل ہوتا ہے اس سے غذا تیزی سے حلق سے نیچے اتر کر نرخرہ کے صرف ایک کھلے ہوئے راستے کے ذریعہ اندر داخل ہو جاتی ہے اور اس طرح نگلنے کا کام مکمل ہو جاتا ہے۔

البتہ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے ان خدمت گزاروں کا کام نہ صرف روزانہ ہے بلکہ وہ رات دن

بیداری اور خواب وغیرہ میں ہمیشہ تیار رہتے ہیں اور جونہی پانی کا کوئی قطرہ یا غذا کا کوئی لقمہ اس کے (حلق کے) احاطہ میں داخل ہوتا ہے تو ایک لحظہ میں وہ آپس میں متحد ہو کر ہم آہنگی کے ساتھ اپنی خدمت انجام دینا شروع کر دیتے ہیں۔

اب ملاحظہ کیجئے کہ انسان سوتے وقت بالکل بے خبر ہوتا ہے لیکن یہ تمام اعضاء عظیم نظم و ضبط اور نہایت مستعدی کے ساتھ اس "بے خبر" کی آسائشوں اور زندگی کی بقاء کے لئے کام انجام دیتے ہیں اور اپنی جان ہلکان کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر ناک کے راستے' کان کے راستے اور خصوصاً پھیپھڑوں کے راستے میں سے کوئی چھوٹے سے چھوٹا راستہ بھی کھلا رہ جائے تو انسان پر کیا مصیبت آپڑے گی حتیٰ کہ اگر غذا کا ایک ٹکڑا پھیپھڑوں کے راستے میں داخل ہو جائے تو موت کے واقع ہو جانے کا بھی امکان ہے۔

۳۔ طباخی یا عمل ہضم

اب ہاضمہ کی نالی جس میں غذا پہنچ چکی ہے خاص حرکتوں کے زیر اثر جو اس کے اطراف کے پٹھوں سے ظاہر ہوتے ہیں غذا کے نوالہ کو معدہ میں منتقل کر دیتی ہے اور معدہ بھی مستعدی کے ساتھ اپنا میکانکی عمل شروع کر دیتا ہے۔

معدہ کا کام بہت ہی سخت ہے کیونکہ تمام قسم کی بھاری اور دیر ہضم غذائیں اس میں داخ ہو جاتی ہیں۔ اب ان تمام کو ہضم ہو کر اور پک کر پتلے مائع کی طرح قابل جذب ہونا پڑتا ہے۔

معدہ ابتداءً دھوئیں کی حرکت سے مشابہ مخصوص حرکتوں کے ذریعہ جو معدہ کے منہ سے شروع ہو کر معدہ کے دروازہ پر ختم ہوتی ہیں غذا کو اس طرف اور اُس طرف دھکیل کر اور اس ذریعہ سے (غذا) کے اجزاء کو پوری طرح مخلوط کر کے ایک رقیق شکل میں تبدیل کر دیتا ہے اور معدہ کے غدود بھی حرکت میں

۱۔ [ان جانداروں کا گروہ جسے "ایک خلیہ کے جاندار" کہا جاتا ہے ان کی مختلف قسمیں ہیں جو اپنی حرکت کے وسیلوں کے لحاظ سے چند گروہوں میں منقسم ہیں۔ جیسے پلکوں والے اور آمیبا وغیرہ جن کی زندگی کی کارکردگی کے متعلق ہم نے گذشتہ حصہ میں مختصر طور پر ذکر کر دیا ہے]

آ کر اور ضروری مواد خارج کر کے کام کی تکمیل کرتے ہیں ۔(آخر کار غذا مذکورہ مواد سے اور معدہ کے رَس (لعاب) سے مخلوط ہو جاتی ہے اور معدہ میں غذا پر کیمیائی عمل اور ردِ عمل شروع ہو جاتا ہے کہ نتیجتاً غذا اپنی صورت بدل کر ہضم شدہ حالت میں معدہ کے "کیموس" نامی مائع کی طرح پتلی ہو کر ایک لمبے سفر کی تیاری شروع کر دیتی ہے)۱؎

معدہ کے غدودوں کی تعداد جو غذا کو ہضم کرنے میں معدہ کے ساتھ اتحادِ عمل کرتے ہیں ۶ سے ۷ ملین ہوتی ہے اور وہ معدہ کی دیوار کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوتے ہیں اور ان کی تعداد ہر ایک مربع سنٹی میٹر میں ۱۲۰۰ ہوتی ہے ۔ان میں سے ہر ایک کی ساخت علیحدہ قسم کی ہوتی ہے ۔انہیں مائیکروسکوپ کے سامنے رکھ کر ان کا تجزیہ اور مشاہدہ کیا جا سکتا ہے ۔

سچ مچ یہ بات کتنی عجیب ہے کہ معدہ کی دیگ جب وہ خالی ہوتی ہے تو ایک بند مٹھی سے زیادہ نہیں ہوتی وہ تقریباً ۵ لیٹر پانی اور غذا کو لیکر اپنی دائمی مستعدی کے سبب جو خواب اور بیداری میں برابر جاری رہتی ہے اپنے بے شمار وفادار ساتھیوں کے ساتھ مل کر اس غذا کو گلا کر ہضم کرتی ہے ۔کیا یہ ممکن ہے کہ یہ تمام تنظیم اور دائمی حیرت انگیز اتحادِ عمل' بے شعور علتوں کی وجہ ظہور پذیر ہوا اور کیا یہ ممکن ہے کہ اندھی اور بہری فطرت نے جس کا نہ کوئی خاکہ ہو اور نہ جس میں عقل و ادراک ہو محض ایک اتفاقی حادثہ کے طور پر پہلے سے کسی پلاننگ کے بغیر ان پہیوں کو گردش میں رکھا ہوا ہے؟ آپ کو یقین ہو گا کہ اس طرح معدہ کے ایک غدود کا بننا بھی محال ہے تو سات ملین غدود اور دیگر عجیب اعضاء کا بننا کہاں ممکن ہے!۔

اس ترتیب سے غذا جزوِ بدن ہوتی ہے

۱؎ [ہم اب پروٹوپلاسم کی ساخت کے نمونہ کے بارے میں اشارہ کریں گے: پروٹوپلاسم جو زندہ خلیات کا ایک جزء ہے اور شفاف اور لیسدار مائع کی شکل میں ایک عمدہ جاندار کی تشکیل کرتا ہے اپنی جگہ وہ بھی سادہ نہیں ہے اور مختلف اجزاء سے جن میں سے ہر ایک حصہ اور کئی حصوں پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کے ذمہ کئی فرائض ہوتے ہیں تشکیل پاتا ہے ۔

پروٹوپلاسم کی عمدہ اور اہم قسموں سے مراد ہے: "ہیالوپلاسم"، "دوٹوپلاسم" اور "مثاپلاسم" البتہ جیسا کہ ہم

معدہ کی کارگزاری کے پورے عرصہ میں "باب المعدہ" کہ حقیقت میں معدہ اور آنتوں کا نگہبان ہے پوری طرح بند رہتا ہے جب غذا معدہ میں مناسب طور پر ہضم ہو جاتی ہے تو معدہ کا دروازہ وقفہ وقفہ سے مسلسل کھلتا رہتا ہے اور ہر دفعہ معدہ کے "کیموس" کی کچھ مقدار کو آنتوں (بارہ انگلی والی آنت) کے پہلے حصہ میں داخل کر دیتا ہے اور یہ عمل کئی دفعہ ہوتا ہے یہاں تک کہ معدہ کامل طور پر خالی ہو جاتا ہے ۔

جس وقت معدہ کا "کیموس" اثنا عشری آنت میں داخل ہو جاتا ہے تو بدن کے اہم غدود اپنا کام کرنا شروع کر دیتے ہیں اور غذائی مواد کو جذب ہونے کے لئے زیادہ تیار کرتے ہیں ۔

لبلبہ (پانکراس) خاص رس لوز المعدہ ہے جو مخصوص راستے سے اثنا عشری آنت میں داخل ہوتا ہے اور جگر بھی جو کہ بدن کا سب سے بڑا غدود ہے ایک مائع پیدا کرتا ہے جس کا نام صفرا ہے اور صفرا جو ایک مخصوص تھیلی میں جمع ہوتا ہے ایک تنگ راستے سے اثنا عشری آنت میں داخل ہو جاتا ہے اس ترتیب سے کہ صفرا پہلے لبلبہ کے لعاب کے راستے میں داخل ہوتا ہے پھر اس سے مخلوط او رایک جان ہو کر اثنا عشری آنت میں داخل ہوتا ہے ۔

نے بیان کیا ہے ان تین قسموں میں سے ہر ایک کو ایک الیکٹرونی مائیکروسکوپ کے سامنے جو تجربہ کئے جانے والی چیز کو ۱۰۰،۰۰۰ گنا بڑا کر کے دکھاتا ہے' رکھا جاتا ہے تب پتہ چلتا ہے کہ ان میں بھی کئی قسمیں ہیں جو نہایت ہی حیرت انگیز اور عجیب ہیں ۔

سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ زندہ مخلوق کی ساخت میں ۶۰ سے زیادہ عناصر استعمال ہوئے ہیں جن میں سب سے زیادہ اہم یہ ہیں: ہائیڈروجن' کاربن' نائٹروجن' سوڈیم' فاسفورس' گندھک' فلور' پوٹاشیم' کیلشیم' لوہا' ید اور سیلشیم وغیرہ ۔لیکن ان میں سب سے زیادہ یہ چار عناصر ہائیڈروجن' کاربن' نائیڈروجن اور آکسیجن یہ سب مل کر پروٹوپلاسم کی تشکیل کرتے ہیں ۔

یہاں تک کہ انسان کے بدن میں جو عناصر ہیں ان کے وزن کا بھی تناسب معلوم کیا گیا ہے اور اس کا تعین کیا گیا ہے منجملہ ان کے: لوہا' کاسی' تانبا اور منگنیز کا نام لیا جا سکتا ہے ۔بالغ انسان کے بدن میں پہلے عنصر کا وزن ۱۰۰،۰۰۰/۵ حصہ دوسرے کا ۱۰۰،۰۰۰/۲ حصہ تیسرے کا ۱۰۰،۰۰۰/۴ حصہ اور چوتھے کا ۱۰۰،۰۰۰/۵ حصہ ہوتا ہے]

دوسری طرف سے بھی آنتوں کے غدود کام میں منہمک ہو جاتے ہیں اور آنت کے رس کے ٹپکنے سے ان کے ساتھیوں کے کام کی تکمیل ہو جاتی ہے اور اس طرح غذا آنتوں میں پوری طرح ہضم ہو کر قابل جذب مائع کی شکل میں آنتوں کے ''کیموس'' میں داخل ہو جاتی ہے۔

آنتوں کا کیموس جو پتلی آنت کی لمبائی میں متحرک ہوتا ہے اپنا تھوڑا تھوڑا غذائی مواد منتقل کرتا جاتا ہے اور یہ عمل جس کو جذب کہتے ہیں بہت سے فعال خدمت گاروں کے ایک دستہ کے ذریعہ سے انجام پذیر ہوتا ہے۔

اس لحاظ سے آنتوں کی اندرونی دیواریں مخصوص برآمد ہونے والی چیزوں کی زیادہ تعداد موجود ہوتی ہے جسے خمل () کہتے ہیں جو غذائی مواد کو آنتوں کے کیموس سے جذب کر کے بہت ہی نازک رگوں میں جنہیں موئی رگیں کہا جاتا ہے منتقل کر دیتی ہیں اور وہ بھی اپنے وقت پر حاصل شدہ مواد کو خون کی جالی کی طرف آگے بڑھا دیتی ہیں۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ ہر ایک مربع سینٹی میٹر میں آنت کی داخلی دیوار کے ساتھ ۲۵۰۰ خمل نظر آتے ہیں جن میں کا ہر ایک بطور خود اپنی ایک مشنری رکھتا ہے ان کا عمل جذب بھی ایک سادہ اور معمولی کام نہیں ہے وہ معدہ کے تمام موجود مواد کو جذب نہیں کرتے بلکہ خملوں کا عمل بصورت انتخاب عمل میں آتا ہے یعنی مواد کا صرف وہ حصہ جو بدن اور خون کے کام آتا ہے اور جو ہاضمہ کی مشنری کے لئے مفید ہو جذب کرتے ہیں۔ وہ اپنے کام میں ہرگز غلطی نہیں کرتے اور نظم و نسق کے خلاف کام نہیں کرتے اگرچہ کہ انسان ان تمام منظم اور ہم آہنگ کاموں سے غفلت برتتا ہے اور زندگی

---

۱ [خلیات میں تحریک کی قابلیت مختلف ہوتی ہے کیونکہ مختلف قسم کے خلیات میں سے ہر ایک 'ایک خاص قسم کی محرک عوامل کے مقابلے میں اپنا ردعمل ظاہر کرتا ہے اور اسکا خود جواب دیتا ہے مثلاً پٹھوں کے خلیات میں اس کا ردعمل بند ہونے اور کھلنے کی صورت میں اور غدودوں والے خلیات میں اس کا ردعمل رسنے کی صورت میں اور پٹھوں کے خلیات میں اس کا ردعمل آگے بڑھانے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے] ۲ [خلیہ میں 'قوت کی پیدائش کے عمل کو ''کیٹابولیسم'' اور مادہ سازی کو ''انابولیسم'' اور حاصل شدہ غذائی مواد کی بناء پر جو اعمال اور تغیرات رونما ہوتے ہیں انہیں میٹابولیسم کہتے ہیں]

کے اس عمل کی اہمیت کے بارے میں اور زندگی عطا کرنے والے کے بارے میں غور نہیں کرتا۔

اور اس کے ذریعہ تمام کثافتیں صاف ہو جاتی ہیں

البتہ آنتوں کے کیموس کا تمام مواد قابل جذب نہیں ہوتا کیونکہ اس مواد میں سے کچھ حصہ یا تو ہضم نہیں ہوتا یا وہ بالکل قابل ہضم نہیں ہوتا اور یہ حصہ عمل جذب کے بعد ایک مخصوص کھڑکی کے راستے بڑی آنت میں داخل ہوتا ہے اور دوسری مذکورہ کھڑکی اس مواد کو واپس جانے سے روکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مواد کو بدن چھوڑنا پڑے گا لہذا بڑی آنت قابل دفع مواد کو زیادہ سے زیادہ ۱۹ تا ۲۴ گھنٹے اپنے اندر محفوظ رکھ کر پھر خاص حرکتوں کے ذریعہ اپنے اندر سے خارج کر دیتی ہے اور اس ضمن میں ممکن ہے کہ تھوڑا سا قابل جذب مواد بڑی آنت کے اندر باقی رہ جائے اب جتنی دیر وہ مواد اندر رہے گا اتنی دیر اندر رہنے کے سبب مواد مذکور بھی بڑی آنت کی دیوار کی مدد سے جذب ہو جائے گا۔

جو کام بڑی آنت کی مدد سے انجام پاتے ہیں ان میں خاص ترشحات شامل ہیں جس سے دفع کا کام آسان ہو جاتا ہے اور قابل دفع مواد کو باہر نکلنے میں مدد ملتی ہے۔

دو دلچسپ نکتے

ہاضمہ کی مشنری کے مطالعہ کے ضمن میں اور مختلف اعضاء اور ان کی مشنریوں کے مطالعہ کے ضمن میں یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ یہ تمام چیزیں ایک عمدہ منظم اور مرتب گھڑی کی کمانیوں اور اسکروں اور نٹوں کی طرح آپس میں مل کر کام کرتے ہیں ان میں صرف اتنا فرق ہے کہ اس مشنری کی کمانیاں اور اعضاء جاندار ہیں اور بہت ہی نازک اور لطیف مواد سے تشکیل پائے ہیں۔ یہ دو نکتے سب باتوں سے زیادہ دلچسپ ہیں (اگرچہ کہ اس مشنری کے تمام پرزے ہی قابل توجہ ہیں)

اوّل

اس مشنری کا دائمی کام یہ ہے کہ رات دن نیند اور بیداری اور غفلت وغیرہ میں ہر وقت ''تیار رہو'' کی حالت میں خدمت کے لئے حاضر رہتی ہے۔

دوم

ممکن ہے کہ اس حیرت انگیز انتظام اور اتحادِ عمل جو اس کارخانے کی تمام مشنریوں اور اعضاء کے درمیان حکومت کرتے ہیں (ممکن ہے کہ) کا یہ اتحادِ عمل اس حد تک ہو کہ ہر ایک دوسرے کے کام کو آسان بنا کر مکمل کردے اور وہ تمام ایک مختص منزل کی طرف گامزن ہوجائیں۔

یہ وہ اسرار و رموز ہیں جو ہم کو جسم کی عمارت کے حیرت انگیز انتظام سے آشنا کرتی ہے اور ایک بے پایاں علم و عقل والے اور ایک گردش دینے والی اور پیدا کرنیوالی قدرت کی طرف ہماری رہبری کرتی ہے۔

جسم میں غذا تقسیم کرنے کی مشین

(خون کو گردش دینے والی مشنری)

جسم کی دوسری بڑی مشنریوں میں سے ایک 'خون کو گردش دینے والی مشنری ہے کہ ایک مائع' جس کا نام خون ہے ہمیشہ انسان کے پورے جسم میں اس مشنری کے ذریعے سے گردش کرتا رہتا ہے۔

خون کو گردش دینے والی مشنری میں جو نظم و ضبط' ندرت' باریکی اور غیر معمولی پیچیدگی ہے اس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ قابل توجہ اور قابل تحقیق و مطالعہ ہے اس مشنری میں کسی طرف سے بھی باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے اور اسی وجہ سے وہ ایک بند مشنری کہلاتی ہے۔

جیسا کہ آئندہ پتہ چلے گا خون کو گردش دینے والی مشنری ایک منظم اور مرتب آبرسانی کا کامل نمونہ ہے۔ یہ (سلسلہ) ایک نقشہ اور حیرت انگیز پیمائش کے ساتھ انسان کے بدن کے تمام چھوٹے اور بڑے اعضاء کے پیچ و خم میں پھیلا دیا گیا ہے جو خود بخود اپنے طور پر زندگی کے اہم فریضہ کی تکمیل کرتا ہے۔

جو نالیاں بدن کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گزر رہی ہیں وہ بعض جگہ اتنی باریک اور نازک ہیں کہ اگرچہ کہ "موئی رگ" (بال جیسی رگیں) کہتے ہیں لیکن وہ بال سے بھی کئی درجہ باریک اور نازک ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ (رگیں) اپنا فریضہ بخوبی انجام دیتی ہیں اور غذائی مواد میں شامل خون کو آگے بڑھاتی ہیں اور خون کی گردش کو جاری رکھتی ہیں۔

اس مشنری کا بنیادی کام

خون کو گردش دینے والی مشنری کے ذمہ اہم فرائض سپرد ہیں اور وہ جسم کی زندگی سے متعلق اہم امور انجام دیتی ہے۔ یہ مشنری بلا تکان ہمیشہ کام کرتی رہتی ہے۔ اس کے ذمہ یہ کام ہے کہ وہ مختلف قسم کے غذائی مواد پانی اور ہوا کو بطور حیاتی مواد کے جسم کی چھوٹی بڑی تمام مشنریوں میں پہنچائے اور وہ جسم کے لئے رزق تقسیم کرنیوالی آراستہ مشین کا کردار بھی ادا کرتی ہے۔ ضمناً بدن کے تمام خلیات کو دھو دھا کر اور فضلات کو خارج کرکے جسم کی صحت و صفائی کا سامان بھی وہی مہیا کرتی ہے۔

خون کو گردش دینے والی مشنری اپنے ماتحت اور فعال کارکنوں کی مدد سے اعضائے بدن کے تاریک پیچ و خم میں حتیٰ کہ دماغ کے حساس حصوں اور آنکھ کے باریک پردوں وغیرہ میں اپنا فریضہ بخوبی انجام

---

۱ [عام طور پر ہر مادہ خلیہ "اوول" ایک نر خلیہ "اسپرماتوزئید" سے زیادہ کو قبول نہیں کرتا یعنی جب نر خلیہ مادہ خلیہ میں داخل ہوجاتا ہے تو دوسرے تمام "اسپرماتوزئید" جو "تخم" کے اطراف ہوتے ہیں اس میں داخل ہونا چاہتے ہیں ان تمام کو ایک پوشیدہ قوت وہاں سے ہٹا دیتی ہے اور شاذ ہی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ایک سے زیادہ "اسپرماتوزئید" "اوول" کے اندر داخل ہوجاتے ہیں اور اس سبب سے ممکن ہے کہ جڑواں دو یا تین بچے پیدا ہوجائیں]

۲ [اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ انسان کے جنسی خلیات اس قدر چھوٹے پن اور باریکی کے باوجود ۴۸ چھوٹے ذرات پر مشتمل ہوتے ہیں جن کو "کروموزم" کہا جاتا ہے اور وہ خود بھی اپنی نوبت پر متعدد ذرات سے جن کو "ژن" کہا جاتا ہے تشکیل پاتے ہیں اور یہی "ژن" اس اہم نقش کو خلیہ کی ساخت میں زندہ رکھتے ہیں یعنی ان میں سے بعض بہت چھوٹے ذرات 'ماں باپ کے حالات اور صفات کے حامل ہوتے ہیں اور یہی موروثی خصوصیات کے مادی سرچشمے سمجھے جاتے ہیں]

۱ [جاننا چاہئے کہ نطفہ اپنے نمو کی ابتدائی منازل میں شہتوت کے دانہ کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور اس کے سبب خلیے تقریباً باہم مشابہ ہوتے ہیں اور بظاہر ان میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا لیکن کچھ مدت کے بعد رفتہ رفتہ جنین کے بدن میں تبدیلی کے تناسب سے ان میں بھی تبدیلی آتی جاتی ہے اور جنین کے بدن کے خلیوں کا ہر گروہ اسی کام کے لئے تیار ہوجاتا ہے اور اس کے ذریعے سے جنین کے بدن کی مشنریاں اور اعضا بتدریج نمایاں ہونے لگتے ہیں]

دے کر ان کے خلیات کے لئے ضروری غذائی راشن فراہم کردیتی ہے۔

خون کو گردش دینے والی مشنری ضروری غذائی مواد کو آنتوں میں سے اور ضروری ہوا کو پھیپھڑوں میں سے گزار کر ضمناً خون کے گزرنے کے وقت جگر میں سے شوگر کا تھوڑا سا ضروری مواد حاصل کرتی ہے۔ پھر حیرت انگیز باریکی اور نظم و ضبط سے جس کی تفصیل آگے آئیگی، انسانی بدن کے تمام خلیات کو یعنی دس ملین ارب موجود جانداروں کو غذا فراہم کرتی اور ان کو دھو دھا کر صاف کردیتی ہے۔[1]

اس سے بڑھ کر کونسا فریضہ ہوگا کہ دس ملین ارب کم طاقت، زود رنج اور راشن کھانے والوں کو جو ہمیشہ اس کی حیاتی امداد کے منتظر رہتے ہیں انہیں ان کی ضروریات کی چیزیں فراہم کرے؟

خودکار پمپ

خون کے گردش دینے والی مشنری کا مرکز "قلب" نامی ایک عضو ہے جس کا رنگ تقریباً گلابی ہوتا ہے اور اس کا حجم ایک بند مٹھی کے برابر ہوتا ہے۔ اس عضو کی غیر معمولی اہمیت کے مدنظر اسکو بدن کے

[1] [بیرونی غذائیں عام طور پر ایک سادہ مواد سے ترکیب پاتی ہیں جن کو حقیقی سادہ غذا کہتے ہیں اور اس کو چھ گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: پانی، معدنی نمکیات، پروٹین، گلوسیڈ، لپیڈ، وٹامن، کہ ان میں سے ہر ایک کے خواص و آثار اور ترکیبات کو علم غذا شناسی میں جداگانہ طور پر تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔

اس موضوع کی طرف اشارہ کرنے کا مقصد اس کی تشریح کرنا نہیں ہے کیونکہ اس بحث میں ہمیں اس بات کی فرصت نہیں لیکن صرف اس نکتہ کو یاد دلانا ہے کہ جو غذائیں انسان کے کام آتی ہیں وہ توحیدی نکات و اسرار سے بھری ہوتی ہیں وہ اس طرح کہ جس وقت انسان ان کے آثار و خواص کا بدن کی مشنری کی ضروریات کے ساتھ تقابل کرتا ہے تو خواہ مخواہ اس کا ذہن اس اساسی موضوع کی طرف منتقل ہوجاتا ہے کہ ان تمام چیزوں کی پیدائش ایک خاص مقصد کے تحت ہوئی ہے اور پیدائش کے ایک ہی نقشہ نے ان دونوں کو آپس میں مربوط کردیا ہے۔

دوسرا دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ بہت سی غذائیں دوا کی تاثیر رکھتی ہیں جو اس مشنری کے بنانے کے مقصد کو زیادہ واضح کردیتی ہیں۔ البتہ یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ تباہ کرنے والے عوامل کے مقابلے میں مواد غذائی کے وقت اور انکی مقدار میں توازن کا وقوع اور تولید کنندہ عوامل کی وساطت کا موضوع بھی نظام پیدائش کا توحیدی درس دینے والا ایک دوسرا موضوع ہے]

ایک محفوظ حصہ میں یعنی بدن کے بائیں جانب، دو پھیپھڑوں کے بیچ میں، سینہ کے پنجرہ اور پشت کی ہڈیوں کی دو مضبوط دیواروں کے درمیان رکھا گیا ہے اور بڑی سرخ رگ اور سیاہ رگوں کے ساتھ اوپر لٹکا دیا گیا ہے۔ اس عضو کی ساخت پیچیدہ اور نہایت دقیق ہوتی ہے کہ ان تمام حصوں کی تفصیل کا بیان کرنا ہمارے بس سے باہر ہے لیکن ہم یہاں ان کے بعض حصوں کا مختصر ساذکر کریں گے:

عام طور پر دل میں چار گڑھے ہوتے ہیں ان کی ترتیب یہ ہے کہ دو گڑھے اوپر کی جانب اور دو گڑھے نچلی جانب ہوتے ہیں اوپر کے گڑھوں کی "دہلیز" اور نیچے کے گڑھوں کو "بطن" کہتے ہیں۔

یہ گڑھے ایک خاص وضع سے آپس میں مربوط ہوتے ہیں یعنی اوپر کی دہلیز بائیں جانب ایک خاص (دو پٹ والی) کھڑکی کے ذریعہ بائیں بطن سے اور سیدھی جانب کی دہلیز سے بھی ایک (تین پٹ والی) کھڑکی کے ذریعہ سیدھی جانب کے بطن سے مربوط ہوتی ہے البتہ دیواروں میں اور گڑھوں کی گنجائش میں باہم فرق ہوتا ہے بطن بھی موٹے اور زیادہ بڑے ہوتے ہیں خصوصاً بائیں جانب کا بطن جو موٹی دیوار کے ساتھ ہوتا ہے اور زیادہ گنجائش کا ہوتا ہے وہ پہلی چیز کو خون کی گردش کی مشنری میں پہنچا دیتا ہے۔

یہ بات بھی جاننی چاہئے کہ دو بطن اور دو دہلیز ایک دیوار کے توسط سے ایک دوسرے سے جدا ہوجاتے ہیں اور ایک بطن اور ایک دہلیز ایک طرف ہوجاتے ہیں اور دوسرا ایک بطن اور ایک دہلیز دوسری جانب ہوجاتے ہیں اور اس طرح دل دو سیدھے اور بائیں جانب کے حصوں میں تقسیم ہوجاتا ہے اور جس طرح کہ آئندہ معلوم ہوگا اس حصے کے کام بھی ایک دوسرے سے ممتاز اور علیحدہ ہوتے ہیں۔[1]

یہ پمپ کس طرح کام کرتا ہے؟

دل کے کاموں کی ترتیب کا حسب ذیل دو حصوں میں خلاصہ بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ جب خون پاک اور صاف ہوجاتا ہے تو بالائی گڑھوں کی مخصوص حرکتوں کے زیر اثر پھیپھڑوں کی سیاہ رگوں (وریدوں) سے گزر کر بائیں دہلیز میں جو حقیقت میں دل کا "تحویلدار" (خزانچی) ہے آجاتا ہے۔ مذکورہ گڑھا (بائیں دہلیز) سکڑنے اور کھلنے (کھڑکی کے کھل جانے) کی وجہ سے اپنے میں موجود خون کو براہ راست نچلے گڑھے (بائیں بطن) میں خالی کرتا ہے اور بائیں بطن بھی جو

دل کا وکیل خرچ (منتظم رسد) ہے۔ وہ جمع شدہ خون کو بڑی نالی کے ذریعہ سے جس کا نام سرخ رگ آئیورت (شریان) ہے پورے دباؤ سے بدن کی شریانوں اور موئی رگوں (بال سے باریک رگوں) میں بھیجتا ہے اور اس ذریعہ سے خون بدن کی باریک اور پیچ وخم والی نالیوں میں چلا جاتا ہے اور پورے جسم کے حصوں میں مساوی طور پر تقسیم ہو جاتا ہے۔

ان باتوں سے بائیں بطن کے استحکام اور اعلیٰ رتبہ پر روشنی پڑتی ہے۔ چونکہ یہ تکلیف دہ خدمت اور اہم ذمہ داری جو بائیں بطن پر عاید ہوتی ہے اس سے اس پر لازم آتا ہے کہ خون کو جمع کر کے پورے دباؤ کے ساتھ جسم کے تمام حصوں میں دوڑادے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی ساخت بھی استحکام اور مناسب گنجائش کے لحاظ سے اسی وضع کی ہوگی۔ یعنی اس کی دیواریں مضبوط ہونگی تا کہ خون کو اکٹھا کرنے اور پھر اس پر دباؤ ڈالنے کے وقت وہ اس کی متحمل ہو سکیں۔ اور اس کا حجم زیادہ ہونا چاہئے تا کہ ہر مرتبہ خون کی زیادہ مقدار کو رگوں میں دوڑا سکے۔

۲۔ خون جو حیاتی اور غذائی مواد کا حامل ہے جب وہ اس ترتیب سے تیزی اور پھرتی کے ساتھ سیلاب کی مانند تمام بدن میں پھیل جاتا ہے اور بے پناہ سخاوت کے ساتھ خلیات کو تمام ضروری حیاتی مواد بخش دیتا ہے جن کی ان کو ضرورت ہوتی ہے تو اس کے بعد وہ پھر قلب کی جانب روانہ ہو جاتا ہے جو اس کا وطن اصلی ہے اور دو خاص راستوں سے جنہیں سیاہ رگ (ورید) زیریں اور ''زبریں'' کہتے ہیں۔ ''سیدھی دلیز'' میں داخل ہوتا ہے۔

لیکن خون میں اب پلٹتے وقت وہ سابقہ تیزی لے 'وہ پھرتی' وہ صفائی باقی نہیں رہتی اور قطع نظر اس کے اب حیاتی مواد اس کے پاس باقی نہیں رہتا بلکہ وہ خلیات کا زہر آلود مواد جمع کر کے اپنے ساتھ لیجاتا ہے اس لئے اب اس کا رنگ کالا اور نیلا ہو جاتا ہے۔

سیدھی دلیز بھی جو گندے اور خراب خون کو نکال کر اپنے وقت پر سکڑاؤ کی ایک ضرب کے ساتھ سیدھے بطن میں ڈال دیتی ہے اس کے بعد خون مذکو بطن کی دیواروں کے انقباض (سکڑاؤ) کے اثر سے سیدھا پھیپھڑوں کی طرف ڈھکیل دیا جاتا ہے اور جیسا کہ ہمیں بعد میں معلوم ہوگا گندہ خون' پھیپھڑوں کی

سرخ رگ (شریان) سے گزر کر پھیپھڑوں کی بے شمار موئی رگوں میں تقسیم ہو کر صاف ہوتا ہے اور دوبارہ نئی رونق اور نئے رنگ میں دل کی جائیں دلیز کی طرف لوٹ جاتا ہے اور اپنی حیاتی کارکردگی کا از سر نو آغاز کرتا ہے۔

اس بناء پر بدن میں خون کی دو قسم کی گردشیں ہوتی ہیں: ایک گردش بڑی اور طویل ہوتی ہے جس کا تعلق پورے بدن سے ہے اور وہ بائیں بطن سے شروع ہو کر سیدھے بطن میں ختم ہوتی ہے اور دوسری گردش چھوٹی ہے اور اس کا سفر بھی مختصر ہے جو سیدھے بطن سے شروع ہو کر پھیپھڑوں کے فلٹر ہاؤس میں صاف ہو کر بائیں دلیز میں ختم ہو جاتی ہے۔ اور دل عجیب قدرت اور نابت قدمی کے ساتھ اپنے دو قوی خودکار پمپوں کی مشنری سے مسلسل ضربات کے ذریعہ خون کی ان دونوں قسم کی گردشوں کو روبہ عمل لاتا ہے۔

دل ہمیں یہ سبق دیتا ہے

۱۔ دل کے یہ دو دائمی عمل عجیب ہم آہنگی کے ساتھ ایک کے بعد ایک انجام پاتے رہتے ہیں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ ابتدا میں ایک مشترکہ حرکت اور انقباض (سکڑاؤ) سے اوپری دو گڑھے (دلیزیں) جمع ہو کر اپنے مشتملات کو ایک لحہ میں نیچے کے گڑھوں (بطن) میں ڈال دیتے ہیں اور بلاتوقف نیچے کے گڑھے بھی ایک مشترکہ انقباض (سکڑاؤ) سے اپنے میں موجود خون کو شریانوں میں داخل کر دیتے ہیں یعنی سیدھے بطن کا کالا خون پھیپھڑوں کی شریانوں میں داخل ہوتا ہے اور تازہ اور حیاتی اور غذائی مواد کا حامل خون' آئیورت سے شریانوں میں چلا جاتا ہے۔

اس موقع پر دلیز او بطن کے پٹھے جو سکڑے ہوئے ہوتے ہیں کھل جاتے ہیں اور اس سے دل کو وقتی طور پر ایک سکون اور آرام حاصل ہوتا ہے اور اس رد عمل کے نتیجے میں گندہ خون دائیں دلیز میں اور تازہ اور صاف خون بائیں دلیز میں داخل ہو جاتا ہے۔

ان دو مرحلوں کے بعد دلیزیں پھر اپنا کام شروع کر دیتی ہیں اور اس کے بعد بطن بھی سکڑ جاتے ہیں اور پھر دوسری دفعہ دل کو ایک سکون و آرام مل جاتا ہے اور پھر تیسری ضرب شروع ہو جاتی ہے اور اسی

ترتیب سے یہ کام جاری رہتا ہے۔

جس طرح سے کہ سابق میں بیان کیا گیا پٹھوں کے سکڑنے کے اہم فعل کے پیش نظر اور ان کی طرز ساخت کی بناء پر پٹھوں کے جمع ہونے کا عمل زیادہ شدید اور زیادہ طویل عرصہ میں انجام پاتا ہے اور اسی لئے دلیڑوں کو آرام لینے کا کافی وقت مل جاتا ہے۔

کس قدر موقع شناس ہے؟

۲۔ دل کی دھڑکنیں وہی دل کے گڑھوں کے سکڑنے اور پھیلنے کا نام ہے اور ہر منٹ میں یہ عمل کئی دفعہ ہوتا ہے۔ مختلف عمر کے لوگوں کے قلب کی دھڑکنوں میں فرق ہوتا ہے لے

ایک سالہ بچے کی دل کی دھڑکنوں کی اوسط تعداد فی منٹ	۱۳۰	بار
تین سالہ بچے کی دل کی دھڑکنوں کی اوسط تعداد فی منٹ	۱۰۰	بار
دس سالہ بچے کی دل کی دھڑکنوں کی اوسط تعداد فی منٹ	۹۰	بار
دس سال سے پچاس سال کے بچے کی دل کی دھڑکنوں کی اوسط تعداد فی منٹ	۷۰	بار

اس کے بعد عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ، دل کی دھڑکنوں کی تعداد بھی بڑھتی جاتی ہے اور ۸۰ بار فی منٹ تک پہنچ جاتی ہے۔ یقیناً آپ پوچھیں گے کہ مختلف عمروں میں دل کی دھڑکن کے اس اختلاف میں اور عمر کے آغاز سے اختتام تک اس کے قوس صعودی اور نزولی کے طور پر بڑھنے اور گھٹنے میں کیا حکمت ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں بھی ایک دوسرا توحیدی بھید پوشیدہ ہے کیونکہ اس فرق کا تعلق مختلف عمروں میں انسان اور اسکے حیاتی اور غذائی ضروریات کے توازن سے وابستہ ہے یعنی بدن کے خلیات کے لئے حیاتی اور غذائی ضروریات کی جس قدر زیادہ حاجت ہوگی اسی تناسب سے دوران خون زیادہ تیز ہوگا اور دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو جائے گا تا کہ اس ذریعہ سے خون کی گردش اپنے فرائض کو زیادہ تیزی سے انجام دے سکے اور بدن کے مختلف خلیات کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے فرض سے عہدہ برآ ہو سکے۔ لہٰذا بچپن کے زمانے میں کہ بدن کے خلیات زیادہ کمزور اور زیادہ نازک ہوتے ہیں اور اسی نسبت سے ان کی قوت مدافعت' بھوک اور پیاس کے مقابلہ میں بہت کم ہوتی ہے۔ خون کی گردش زیادہ

تیز اور جوانی کے زمانے میں بہت معتدل اور پھر ضعیفی اور بڑھاپے میں زیادہ تیز ہو جاتی ہے اور اسی طرح جب خلیات کی کارکردگی ورزش اور اس جیسی کسی چیز کی وجہ سے بڑھ جاتی ہے اور زیادہ انرجی کی ضرورت لاحق ہوتی ہے تو خون کی گردش میں اضافہ ہو جاتا ہے اور خون کی گردش کی مشنری کے اتحاد عمل سے دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں اور صفائی (فلٹریشن) کا کام بھی تیزی سے انجام پانے لگتا ہے۔ اور یہ بات ورزش کے وقت اور سخت کام کے وقت پوری طرح محسوس ہوتی ہے۔

اسی طرح مختلف حیوانات کے دل کی دھڑکنوں کی تعداد میں بھی فرق ہے۔ مثلاً:

گھوڑے میں ہر منٹ اوسطاً	۳۰	تا	۴۰ بار
خرگوش میں ہر منٹ اوسطاً	۱۵۰		بار
چوہے میں ہر منٹ اوسطاً	۴۰۰		بار

اس فرق کا راز بھی وہی مختلف حیوانات کے بدن کے خلیات کی غذائی ضروریات کی مقدار اور ان کی قوت مدافعت کی مقدار ہے۔ دل کی دھڑکنوں اور خون کی گردش کا ان کے بدن کی ضروریات کے مطابق ہونا ضروری ہے کیونکہ جو جاندار جس قدر چھوٹا ہوگا بھوک اور پیاس کے مقابلے میں اس کے بدن کے خلیات کی قوت مدافعت اتنی ہی کمزور ہوگی اس لئے ضروری ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ان کی زندگی کی ضروریات انہیں بہم پہنچائی جائیں۔

مٹھی بھر گوشت اور اس کی یہ قدرت؟

۳۔ دل جو کہ پٹھوں سے بنا ہوا ہے اور انسان کی بند مٹھی کے برابر ہے اور اس کا وزن ۵۰ گرام سے لیکر ۳۰۰ گرام تک ہوتا ہے اور وہ ایک ایسا پمپ ہے جو عجیب قوت کے ساتھ رات دن ہر منٹ اور ہر سکنڈ کام کرتا رہتا ہے اور ایک لحہ کے لئے بھی نہیں رکتا دل کی موٹر مسلسل اور یکساں دھڑکنوں کی شکل میں مناسب آواز کے ساتھ جسے سینے کے نزدیک سے سنا جا سکتا ہے ہر رات دن میں دس ہزار مرتبہ سے زیادہ کھلتی اور بند ہوتی ہے اور اس ترتیب سے تیس سال کی مدت میں وہ ایک ارب (۱٫۰۰۰٫۰۰۰٫۰۰۰) سے بھی زیادہ بار اس عمل کی تکرار کرتی ہے اور اسی ذریعہ سے ہزاروں ٹن خون

اس چھوٹے سے راستے سے گزرتا ہے[1]

اب سوچنا چاہئے کہ یہ مٹھی بھر گوشت کس قدر باریک اور کس قدر پائیدار بنایا گیا ہوگا کہ وہ اس قدر حیرت انگیز قدرت کا مالک ہے اور اس قدر کام اور تھکا دینے والی خدمت کے باوجود نہ صرف یہ کہ اس کی ساخت یا اس کے کام میں کوئی خلل نہیں پڑتا بلکہ اس پر کسی قسم کی تھکان بھی اثر انداز نہیں ہوتی۔

یہ بات مسلمہ ہے کہ لوہا، فولاد اور پتھر کوئی چیز بھی ایسی سخت خدمت کرنے کی طاقت نہیں رکھتی لیکن یہ مٹھی بھر گوشت بڑے اطمینان سے یہ خدمت انجام دیتا ہے۔

کامل اختیارات

۴۔ جاننا چاہئے کہ دل کی دھڑکنیں اور حرکت قلب بطور خود ایک کام ہے یعنی یہ کہ قلب بغیر مرکزوں سے رابطہ رکھے کچھ مدت تک اپنی دھڑکنوں کو جاری رکھ سکتا ہے۔ لہٰذا اگر جاندار کے قلب کو اس کے سینے سے باہر نکال لیں تو تھوڑی دیر تک وہ دھڑکتا رہے گا اور اگر اسے فوراً ایک خون جیسے مائع میں ڈال دیں تو اس کی دھڑکنوں کا سلسلہ دیر تک جاری رہے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قلب کی ساخت اس طرح کی ہے کہ خود اس میں حرکت کرنے کی مشنری اور عوامل موجود ہیں اور جس وقت اس کا ارتباط بدن سے رہتا ہے تب بھی اس کی حرکت کا تعلق اسی کے عضو سے ہوتا ہے اور بیرونی اعصاب صرف دل کی دھڑکنوں کے انتظام میں اثر انداز ہوتے ہیں[1]

خون کو گردش دینے والی مشنری کے تین اہم حصے ہیں جس سے مراد "دل" جس کی تفصیل گزر چکی اور "رگیں" جو خون کی منصفانہ تقسیم کرنے کی چھوٹی اور بڑی نالیاں ہیں اور ان کی ساخت اور وضع خون کی گردش کے سلسلے میں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ عام طور سے جسم میں تین قسم کی رگیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ سرخ رگیں، سیاہ رگیں، موئی رگیں[2] تیسری قسم وہی "خون" ہے جس کی تشریح ابھی مختصراً آپ کی نظروں سے گزر چکی ہے۔

[1] [یہ بات قابل غور رہے کہ ہضم کا کام سب سے اہم ہے جو عمل اور رد عمل کی صورت میں غذا پر اثر انداز ہوتا ہے تا کہ وہ پوری طرح قابل جذب بنے اور آنتوں میں پہنچ جائے اسی بناء پر معدہ کا یہ فعل، عمل ہضم کا ایک حصہ ہے]

خون

عام طور پر جسم کے وزن کا ۱/۱۲ حصہ خون جسم میں ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر کوئی شخص ۷۸ کلوگرام کا ہوگا تو اس کا خون تقریباً ۶ لیٹر ہوگا اور جس کی وزن ۶۵ کلوگرام ہوگا تو اس میں منفعت بخش مایہ بقدر ۵ لیٹر ہوگا۔

خون میں دو قسم کے جاندار موجود ہوتے ہیں جو خون کے اہم حصہ کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ زندہ دو گروہ جن کو "خون کے سرخ جسیمے" اور "خون کے سفید جسیمے" کہا جاتا ہے، وہ بہت زیادہ تعداد میں ہوتے ہیں اور زرد رنگ کے شفاف مائع میں جس کا نام "پلازما" ہے تیرتے رہتے ہیں لیکن خون کے سرخ جسیموں کی کثرت کی وجہ سے اس کا رنگ ہمیشہ سرخ نظر آتا ہے۔

روئے زمین کی آبادی کے ۸ ہزار گنا خدمت گزار

خون کے ہر ایک مکعب ملی میٹر میں تقریباً ۵ ملین سرخ جسیمے موجود ہوتے ہیں اور اس حساب سے ان کی تعداد انسان کے پورے جسم کے خون میں (جو اوسطاً ۵ لیٹر ہوتا ہے) ۲۵ ملین کے برابر یعنی ۲۵۰۰۰ ارب (۲۵) ہوتے ہیں اور اس بات کے پیش نظر کہ روئے زمین کی آبادی ۳ ارب سے زیادہ نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بدن کے خون کے سرخ جسیمے روئے زمین کی کل آبادی کے آٹھ ہزار گنا ہیں اور بالفاظ دیگر اگر ان تمام کو سطح زمین پر پھیلا دیا جائے تو تعجب نہ کریں کہ یہ ۳۰۰ میٹر مربع زمین کو گھیر لیںگے[1]

بدن کی ۳۰ ارب فوج

لیکن سفید جسیموں کی تعداد سرخ جسیموں کی تعداد سے کم ہوتی ہے یعنی اس کی ۱/۷۰۰ ہوتی ہے اس طرح کہ ہر ایک مکعب ملی میٹر خون میں تقریباً ۶ ہزار سفید جسیمے تیرتے ہیں اس لحاظ سے سفید جسیمے جسم میں ایک مسلح فوج کی طرح ہمہ سر پیکار رہتے ہیں۔ ایک معمولی اور متوسط شخص کے جسم میں ان کی تعداد ۳۰ ارب سے زیادہ ہوتی ہے یعنی بدن کی فوج میں روئے زمین کی آبادی سے دس گنا تعداد میں مسلح سپاہی موجود ہوتے ہیں۔

یہ مسلح سپاہی ہمیشہ "تیار رہو" کی حالت میں رہتے ہیں اور مائیکروبوں کے حملے کی صورت میں اپنی

پوری قوت سے بدن کے احاطہ میں رہ کر دفاع کرتے ہیں اور اکثر بدن کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جان قربان کر دیتے ہیں۔

ہم نے بدن کے ان فدا کار سپاہیوں کی خونین لڑائی کی بہت زیادہ تفصیل سابق میں بیان کر دی ہے لیکن سرخ جسیمے خون کی ایک اہم خدمت یعنی آکسیجن کے حیاتی مادہ کو خلیات میں پہنچانے اور جسم سے زہر کو سمیٹنے کی خدمت انجام دیتے ہیں یعنی غذا کا مقررہ حصہ جسم میں پہنچاتے ہیں لیکن جیسا کہ سابق میں بیان کیا جا چکا ہے سرخ جسیمے یہ پیچیدہ خدمت ایک مخصوص ''ڈسپلن'' کے ساتھ انجام دیتے ہیں اس طرح کہ خلیات کے تمام جائز حقوق کی پوری حفاظت ہوتی ہے اور جسم کے دس ملین ارب خلیات میں سے ہر ایک کو کسی پر ظلم و زیادتی ہوئے بغیر ضروری حیاتی مواد مل جاتا ہے۔ خیال کیجئے کہ اگر انسانوں کی اس قدر جمعیت ہوتو ان کو غذا پہنچانے کے لئے کتنے ملین دفتروں اور محکموں کی ضرورت ہوگی اور اس کے سوا ان کے راستے میں کتنے موانعات اور کتنی رکاوٹیں پیش آئیں گی؟ کیا ان تمام چیزوں کی تشکیل' اندھی اور بہری فطرت نے کی ہے؟......

خون کس چیز سے پیدا ہوا

خون مختلف مادوں سے اور مختلف دھاتوں اور دھاتوں جیسی چیزوں سے تشکیل پایا ہے کہ اس کی ترکیب ہمیشہ مستقل طور پر قائم رہتی ہے۔ جن چیزوں سے خون کی تعمیر میں کام لیا گیا ہے ان میں: نمک' پانی' فاسفیٹ' سوڈیم' پوٹاشیم' کیلشیم' تھوڑی سی شکر' چربی اور مختلف قسم کے گیسوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔

اس غرض سے کہ خون کی ترکیب ہمیشہ متوازن رہے بدن کی چند مشنریاں اتحاد عمل کر کے اس کی دیکھ بھال کرتی رہتی ہیں کیونکہ اگر اس مواد میں کمی یا زیادتی ہو جائے تو دائمی بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ انسانی جسم کی ساخت میں یہ تنظیم خود قدرت کا ایک دوسرا کرشمہ ہے۔

درس توحیدی

اس غرض سے کہ اس مشنری کے عجیب' دقیق' اور پیچیدہ نظم سے بخوبی واقفیت حاصل کر کے یقین کیا

جا سکے کہ اس کائنات کی تخلیق کا بغیر ایک علم و قدرت کے سرچشمہ کے' وجود میں آنا ممکن نہیں ہے اور یہی مشنری جو ہمارے بدن کا ایک حصہ ہے اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس جہان ہستی کو پیدا کرنیوالا دانا اور توانا ہے۔ اب ہمیں چاہئے کہ اس کا کوئی مشابہ جو دنیا میں موجود ہو خواہ ناقص ہی ہو دیکھیں اور ان دونوں کا موازنہ نہ کریں۔

کسی شہر کی آبرسانی کی اسکیم کو پیش نظر رکھئے کہ تمام مکانوں میں' کارخانوں میں اور مختلف محکموں میں اس کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں کیا آپ نے کبھی یہ گمان کیا کہ عقل و شعور سے محروم علل و اسباب نے بغیر کسی پلاننگ کے اس سلسلہ آبرسانی کو پورے شہر میں پھیلا دیا ہے؟ یا اس کے برعکس ہر دیکھنے والا یقین کرتا ہے کہ مذکورہ سلسلہ آبرسانی کا پہلے کسی ماہر انجینئر نے خاکہ تیار کیا ہوگا اور بعد میں فنی کاریگروں اور ماہروں کے ذریعہ موجودہ صورت اختیار کیا ہوگا اور اس میں کام آنے والی چیزیں اور اس کے آلات کا لوہا' ہر چیز اپنے وقت پر مختلف کارخانوں میں جو فکر انسانی کے نتیجہ میں وجود میں آئے ہیں تیار ہوئی ہے۔

اب غور کیجئے کہ ایک شہر کی آبرسانی کا کام کہاں اور خون کو حیرت انگیز طور پر گردش دینے والی مشنری سلسلہ خون رسانی کہاں؟ اس مشنری سے جو نہایت باریک اور نہایت پیچیدہ ہے اور جو ہر منٹ میں دو دفعہ دس ملین ارب خلیات کی آبیاری کرتی ہے' اس کا کیا مقابلہ!!۔

جبکہ ایک معمولی آبرسانی کا کام جس میں نہ کوئی باریک مشنری ہے اور نہ ہی پیچیدہ ساخت کا کوئی ساز و سامان' کوئی عقلمند شخص اس کے اتفاقی طور پر وجود میں آنے اور بغیر عقل و فکر کے استعمال کے اس کے تیار ہو جانے کا حکم نہیں لگاتا تو پھر ہمارے حال' اس پیچیدہ' باریک اور حیران کن مشنری اور خون کو گردش دینے والے نظام کے مقابلہ میں کیا ہوگا؟!

جسم کا صفائی کا کارخانہ (ریفائنری)

(نظام تنفس)

اب مناسب ہے کہ بدن کے ''صفائی کے کارخانہ'' کی طرف نگاہ دوڑائیں جو بدن کی اہم مشنریوں

میں سے ایک ہے اور اپنی جگہ نہایت دلچسپ اور بہت ہی زیادہ حساس ہے اور اس کا جائزہ لیں۔

یہ کارخانہ جو سانس لینے کا کارخانہ ہے بدن کی زندگی کی بقاء میں اس کا اہم کردار ہے چنانچہ اگر یہ پانچ منٹ سے زیادہ کام نہ کرے تو انسان کا دم گھٹ جائے اور عام آدمی کی موت کا سبب بن جائے بند کی اس مشنری کا اہم کام خون کی صفائی کرنا اور بدن اور خون کے زہریلے مواد کو خارج کرنا ہے اور اسی وجہ سے اس کو جسم کی صفائی کا رخانہ کہتے ہیں۔

نظام تنفس کا دل اور خون کی مشنری کے ساتھ کامل' دقیق اور منظم اتحاد عمل ہے اور ان دونوں کا کام نہایت ہم آہنگی کے ساتھ ایک دوسرے کے دوش بدوش انجام پاتا ہے۔ یہ ہے صفائی کے اس حیرت انگیز کارخانے کے فرائض کا مختصر سا خاکہ جو آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

ایک پرخطر اور حساس فریضہ

شریانوں کا خون جس وقت دباؤ کے ساتھ بائیں بطن سے بدن کے دور کے مرکزوں کی طرف حرکت کرتا ہے تو اس میں آکسیجن کا حیاتی مادہ موجود ہوتا ہے اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہے خون مذکور جس وقت جسم کی بے شمار موئی رگوں میں تقسیم ہو جاتا ہے تو آکسیجن کے حیاتی مواد کو خلیات کی زندگی کے لئے ان کے حوالہ کر دیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں وہاں سے کاربونک گیس کو جو ایک زہریلی گیس ہے واپس حاصل کرتا ہے جو افسردہ اور سیاہ رنگ کی ہوتی ہے اور اس سے دل کے حوالہ کر دیتا ہے۔

یہ خون نہ صرف آکسیجن کے حیاتی مادہ کو پوری طرح ہاتھ سے دے چکا ہوتا ہے بلکہ وہ لازمی طور پر زہریلا بھی ہوتا ہے اس لئے اب وہ بدن کے استفادہ کے قابل نہیں رہتا اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ باہر بھی نہیں نکلتا اور نہ اسے نکلنا چاہئے کیونکہ خون بہر حال ہمارے جسم کے لئے ایک گرانمایہ اور قیمتی مواد ہے جس سے سوائے مناسب مواقع کے کبھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ اسی وجہ سے خون مذکور کو جس نے اس قدر جان نثاری کے ساتھ خدمات انجام دی ہیں استفادہ اور خدمت انجام دینے کے قابل ہونا چاہئے اسی مقصد کے لئے دل' اس خون کو خود قبول کر لیتا ہے اور اس کو سیدھے بطن کے راستے سے پھیپھڑوں میں منتقل کر دیتا ہے۔ اس کا گندہ خون اس ترتیب سے جیسا کہ ہمیں پتہ چلے گا پھیپھڑوں کی

صفائی کی مشنری میں صاف ہو کر اپنی کھوئی ہوئی پاکیزگی' لطافت اور حیاتی مواد کو از سر نو حاصل کر لیتا ہے اور وہاں سے پھر اپنے سابقہ فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں قلب کی جانب روانہ ہو جاتا ہے۔

جاننا چاہئے کہ بدن اور اس کے خلیات کو غذائی مواد کے مقابلہ میں اس حیاتی مواد کی زیادہ ضرورت ہے جو نظام تنفس کے ذریعہ انہیں ملتا ہے۔ جسم آکسیجن کی کمی کی صورت میں اتنی دیر برداشت نہیں کر سکتا جتنی زیادہ دیر وہ غذائی مواد کی کمی کی صورت میں برداشت کر سکتا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ ممکن ہے انسان کم از کم ایک روز بھوکا رہ کر گزار دے لیکن وہ پانچ منٹ سے زیادہ جسم کو ہوا کی آکسیجن کے بغیر زندہ نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا دل اور گردش کی مشنری کے بند ہوتے ہی جسم پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ نظام تنفس کو جسم کی حساس ترین مشنری سمجھنا چاہئے اور نظام تنفس کو جسم پر جو غیر معمولی اثر و نفوذ حاصل ہے وہ اس کا نتیجہ ہے۔

خون کی صفائی کہاں ہوتی ہے

خون صاف کرنیوالا اصل عامل وہی مشہور عضو ہے جسے جگر سفید' شش یا پھیپھڑے کہتے ہیں اور اس کا اوسط وزن مردوں میں ۱۲۰۰ گرام اور عورتوں میں ۹۰۰ گرام ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات بتا دینا ضروری ہے کہ مردوں اور عورتوں کی جسمانی ساخت میں صرف اسی حصہ جسم میں فرق نہیں ہے بلکہ ان دونوں جنسوں کی جسمانی ساخت ہیں' مقدار اور کیفیت کے لحاظ سے ان کے بدن کے تمام اعضاء رئیسہ و غیر رئیسہ میں فرق ہوتا ہے خصوصاً دماغ میں جو عقل کی نشو و نما کا مرکز سمجھا جاتا ہے جس کی تفصیل بعد میں آئیگی اور یہی اختلاف جسمانی ساخت اور قوتوں میں ہے جس کے اثر سے دونوں جنسوں کی زندگی کے افعال میں قانونی' سیاسی اور معاشرتی کاموں اور اصولوں میں بھی فرق ہے لے

لے [عجیب بات یہ ہے کہ خون کو گردش دینے والی مشنری اس اہم فریضہ کو ہر سکنڈ میں دوبار انجام دیتی ہے یعنی ہر سکنڈ میں دوبار انسان کے بدن کے دس ملین ارب خلیات میں سے ہر ایک کو ان کی زندگی سے متعلق ضروری غذا بہم پہنچاتی ہے اور ان کے فضلات کو خارج کرتی ہے]

پھیپھڑوں کی شکل اسفنج کے دو لچکدار تودوں کی نظر آتی ہے اور سینہ کے ڈھانچہ میں پچھلی طرف دونوں جانب واقع ہیں اس میں بے حساب بہت چھوٹے چھوٹے سوراخ ہیں جو "ہوائی تھیلا" کہلاتے ہیں۔

ان تھیلوں کی وجہ سے پھیپھڑوں کی گنجائش میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے یہاں تک کہ یہی چھوٹا سا لوتھڑا ۲۰۰ مربع میٹر کے برابر گنجائش رکھتا ہے یعنی اگر گڑھوں کی دیواروں کو کھول دیا جائے اور ایک ہی سطح پر پھیلا دیا جائے تو ۲۰ میٹر لمبی اور ۱۰ میٹر چوڑی زمین کو ڈھانک لینگے اور یہ بات پھیپھڑوں کے عجائبات میں سے ہے۔

پھیپھڑوں کی دوار میں بہت سی موٹی رگیں پھیل جاتی ہیں جو پھیپھڑوں کی دو شریانوں میں سے ہیں اور یہ سیاہ خون کو دل سے پھیپھڑوں میں لے آتی ہیں اور یہ کئی شاخوں میں بٹ جاتی ہیں۔ یہ موٹی رگیں جو پھیپھڑوں کے ہوائی تھیلوں میں پھیل جاتی ہیں ہمیشہ ان کے ساتھ ملی رہتی ہیں اور جس وقت تنفس کے اثر سے ہوا مذکورہ تھیلوں میں داخل ہو جاتی ہے تو خون اور ہوا کا آپس میں تبادلہ ہوتا ہے یعنی ہوا کا حیاتی مواد ہوائی تھیلوں کی دیوار میں سے گھس کر موٹی رگوں کی نازک دیوار سے بھی گزر کر خون میں داخل ہو جاتا ہے اور اسی طرح خون کا زہر گڑھوں میں منتقل ہو جاتا ہے اور پھر سانس چھوڑتے وقت حلق اور ناک کے ذریعہ سے باہر بھیج دیا جاتا ہے اور اسی ترتیب سے سانس لیتے اور سانس چھوڑتے وقت تھوڑا سا خون صاف ہو کر اور موٹی رگوں میں تھوڑا تھوڑا پہنچ کر جمع ہو جاتا ہے اور پھر وہاں سے پھیپھڑوں کی چار سیاہ رگوں (وریدوں) کے ذریعہ سے دل (بائیں دہلیز) میں لوٹ جاتا ہے۔

جس وقت ہم ہوا کو ناک اور منہ سے پھیپھڑوں کی طرف لے جاتے ہیں (یعنی سانس لیتے ہیں) تو ہوائی تھیلے پُر ہو جاتے ہیں اور پھیپھڑوں کا حجم بڑھ جاتا ہے اور پھر صفائی کے عمل کا تبادلہ ہونے کے بعد (پھیپھڑے) اپنی اصلی حالت پر آ جاتے ہیں اور گڑھے خالی ہو جاتے ہیں اور (سانس چھوڑنے پر) زہریلی ہوا باہر آ جاتی ہے۔ [1]

[1] دل کی پیدائش کی پر اسرار اور حیران کن باتوں میں سے ایک بات یہ ہے کہ ابھی جبکہ بچہ پیدا نہیں ہوا اس کے دل کے اوپر کے دو گڑھے (دہلیز) درمیان میں ایک سوراخ کے ذریعہ مربوط ہوتے ہیں اور اس کے جسم میں خون کی گردش ایک مکمل انسان کے خون کی گردش کے برعکس ہوتی ہے لیکن جونہی بچہ پیدا ہو جاتا ہے اور بیرونی فضا میں آ کر پہلی سانس لیتا ہے تو وہ سوراخ فوراً بند ہو جاتا ہے اور اس کی خون کی گردش طبیعی طور پر شروع ہو جاتی ہے۔

اگرچہ سانس لینے اور مذکورہ کھڑکی کے بند ہونے میں علت و معلول کا معاملہ پر اسرار ہے لیکن اس کا مقصد اور اس کا نتیجہ صرف ایک درس توحیدی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں قلب کے بالائی گڑھوں (دہلیز) کا جدا ہونا اور پھر مل جانا اس لئے ہے کہ ایک گندے خون کو پھیپھڑوں کے بطن کے راستے سے یا بدن کے فلٹر پمپ سے گزار کر باہر نکال دیتا ہے اور دوسرا صاف اور تازہ خون کو غذا کے طور پر پورے جسم کے خلیات کی طرف بھیج دیتا ہے البتہ کارکردگی میں یہ فرق اس وقت ہوتا ہے جب بدن کی سانس اور صفائی کی مشنری کام شروع نہ کرے لیکن اس سے پہلے جب بچہ رحم مادر کے صاف شدہ خون سے استفادہ کرتا ہے اور اس کے لئے سانس لینے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا تو اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔]

پھیپھڑوں کی حرکت ان کا کھلنا اور بند ہونا ہے جو دل کی حرکت کی طرح ایک خودکار اور دوائی حرکت ہوتی ہے کہ پوری زندگی بحالت خواب و بیداری انجام پاتی رہتی ہے اس قدر فرق کے ساتھ کہ انسان اس کی حرکت کو اپنے اختیار سے کنٹرول کر سکتا ہے لیکن دل کی حرکت پوری طرح ہمارے کنٹرول سے باہر ہے۔

تنظیم اور توحید

اس مشنری میں بھی بہت سی دقیق باتیں اور توحیدی نکات مضمر ہیں اور وہ سب متفقہ طور پر ایک دانا اور قادر خالق کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کے منجملہ حسب ذیل چند نکات پیش کئے جاتے ہیں:

پھیپھڑے بھی موقع شناس ہوتے ہیں

پھیپھڑوں کی حرکتوں میں دل کی حرکتوں کی طرح مختلف افراد اور مختلف عمروں کے انسانوں اور مختلف قسم کے حیوانات میں کافی فرق ہوتا ہے جن میں سے چند ہم قارئین کرام کے سامنے پیش کرتے ہیں:

انسان میں پیدائش کے فوراً بعد	فی منٹ ۴۴ بار

انسان میں ۵ سال کی عمر میں	فی منٹ ۲۶ بار
انسان میں ۱۵ تا ۲۰ سال کی عمر میں	فی منٹ ۲۰ بار
انسان میں ۲۰ تا ۲۵ سال کی عمر میں	فی منٹ ۱۸ بار
انسان میں ۲۵ تا ۳۰ سال کی عمر میں	فی منٹ ۱۲ بار
انسان میں ۴۰ سال کی عمر میں	فی منٹ ۱۸ بار
گھوڑے میں	فی منٹ ۱۰ تا ۱۲ بار
کتے میں	فی منٹ ۱۵ تا ۲۵ بار
بلی میں	فی منٹ ۲۴ بار
خرگوش میں	فی منٹ ۵۵ تا ۲۰ بار
چوہے میں	فی منٹ ۱۵۰ بار

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے یہ بات واضح ہو چکی کہ مختلف جانداروں میں تنفس کی تعداد میں فرق ہوتا ہے اور اس اختلاف کو اگر باریکی سے دیکھا جائے تو یہ بھی ہمارے لئے اس خلقت کے پیچیدہ نظام کا ایک نمونہ ہونے کی طرف رہبری کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح حیوانات کے بدن کی غذائی ضرورتوں میں ایک دوسرے کے مقابلے میں فرق ہے اسی طرح ان کے بدن بھی آکسیجن کے حیاتی مادہ کے بارے میں فرق رکھتے ہیں لہٰذا جسم کے خلیات کی جس قدر اس حیاتی مادہ کی زیادہ ضرورت ہوگی اسی قدر

۱؎ [خون کی رفتار سیاہ رگوں میں (وہ رگیں جو خون کو دل تک واپس پہنچاتی ہیں انہیں سیاہ رگ کہا جاتا ہے) سب مل ملا کر ان کی رفتار سرخ رگوں (شریانوں) کے مقابلہ میں صرف نصف ہوتی ہے۔ منجملہ ان عوامل کے جو خون کو وریدوں میں دوڑاتے ہیں اور واپسی میں قلب پر اثر انداز ہوتے ہیں ان میں حسب ذیل چند عوامل کا نام لیا جا سکتا ہے:

۱۔ بائیں بطن کا سکڑاؤ ۲۔ سینہ کا مخصوص دباؤ ۳۔ سانس لیتے وقت شکم کے اطراف کا دباؤ ۴۔ دل کے رد عمل کا دباؤ ۵۔ شریانوں کا دھڑکنا۔ ۶۔ جاذبہ زمین لیکن ان میں سب سے بڑا اور اصلی عامل دل کے بائیں بطن کا سکڑاؤ ہے]

ان کا تنفس زیادہ تیز اور ان کے پھیپھڑوں کی حرکتوں میں اسی طرح اضافہ ہو جائے گا۔ چنانچہ بچوں میں اور چھوٹے حیوانات میں اور بوڑھوں میں ان کے جسموں کو آکسیجن کی زیادہ ضرورت ہونے کے سبب اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ ان کی برداشت کی قوت کم ہو جانے کے سبب سے پھیپھڑوں کی حرکتوں کی تعداد اور تنفس کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

۲۔ پھیپھڑوں اور دل میں رفاقت

زیادہ دلچسپ موضوع دل اور پھیپھڑوں کے کاموں میں براہ راست تعلق کا ہونا ہے جو ایک تنظیم اور مخصوص تناسب کے ساتھ ہمیشہ ان دونوں حساس مرکزوں میں ارتباط اور ہم آہنگی برقرار رہتی ہے اس طور پر کہ جسم کے خلیات کو جتنی زیادہ حیاتی مواد پہنچانے کی ضرورت ہوگی دل کی دھڑکنوں میں اسی قدر اضافہ ہوگا اور سانس کی رفتار بھی اتنی ہی تیز اور صفائی کا فعل بھی اسی لحاظ سے انجام پائے گا اور اس طرح ان دونوں مشنریوں کی مشترکہ سعی اور اتحاد عمل سے بدن کے بے شمار خلیات کی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔

یقیناً آپ نے دیکھا ہوگا کہ ورزش کے موقع پر اور کسی سخت کام کے کرنے کے بعد یا کسی ذہنی کیفیت کی وجہ سے جیسے وحشت اور اضطرات وغیرہ کے رونما ہونے پر دل کی دھڑکنوں کی تعداد میں اور تنفس کی رفتار میں اضافہ ہو جائے گا کیونکہ خلیات زیادہ کارکردگی کی وجہ سے اور مواد حیاتی کے جل جانے کی وجہ سے ان میں زہریلا مواد اور "انیڈ رکاربونک" پیدا ہوگا اب اعمال حیاتی کے لئے اور بہتر کارکردگی کے لئے ان کو آکسیجن کی اور مواد غذائی کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ لہٰذا ضروری ہو جاتا ہے کہ زہریلا مواد تیزی سے جمع ہو اور زہریلا خون جلد صاف ہو تا کہ خلیات کو غذائی مواد اور آکسیجن کے پہنچانے کا کام تیز ہو سکے اور یہ مشکل دونوں مشنریوں میں جو ہم آہنگی اور اتحاد عمل ہے اس سے حل ہو جاتی ہے۔

۳۔ عجیب قدرت

پھیپھڑوں کی یہ عجیب قدرت خود جہان آفرینش کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ یہ اسفنج کی طرح کا لطیف عضو اس قدر مقاومت اور مدافعت کی قوت رکھتا ہے کہ ہر رات دن میں ۲۸۸۰۰ مرتبہ (ہر منٹ

میں اوسطاً ۲۰بار) کھلتا اور بند ہوتا ہے اور صفائی کرتا ہے کہ اس ترتیب سے سالانہ ۴ ہزار ٹن خون کی صفائی کر کے اپنے میں سے گزارتا ہے اور اس حساب سے ایک اوسط عمر میں ممکن ہے وہ ۲۵۰ ہزار ٹن خون کی صفائی کرے اور اس قدر کارکردگی اور طاقت کو گھٹانے والا کام اسکو نہیں تھکاتے اور کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوتا کہ ہم سانس لینے میں یا اپنے پھیپھڑوں کی حسب معمول حرکت اور کارکردگی میں تھکان کا احساس کریں۔

۴۔احتیاطی تدابیر

سانس لینے کے لئے ضرورت کے مواقف ہوا ہر جگہ موجود ہوتی ہے لیکن اکثر انسان کے قریب کی ہوا کثیف اور غبار آلود ہوتی ہے اس لحاظ سے اگر ہوا اسی حالت میں ہمارے پھیپھڑوں میں داخل ہو جائے تو ممکن ہے پھیپھڑوں کے کام میں مشکلات اور رکاوٹیں پیدا ہوں لہٰذا ہوا کے آمد و رفت کے قدرتی راستے کے بارے میں اس طرح پیش بینی سے کام لیا چاہئے کہ سانس کے ساتھ کثافتوں اور گرد و غبار کے داخل ہونے سے بچا جا سکے۔

اگر چہ کہ یہ بات معمولی معلوم ہوتی ہے لیکن حکمت سے خالی نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ ناک کے دو سوراخوں میں جو ہوا کی آمد و رفت کے معمولی اور طبیعی راستے ہیں ان میں بال موجود ہوتے ہیں یہ ہوا کی گزرگاہ میں جالی کا کام دیتے ہیں اور ہوا ان میں سے گزرتے وقت اس حد تک صاف ہو جاتی ہے کہ گرد و غبار اور کثافت اس میں باقی نہیں رہتی۔

اور دوسری بات جو اس ناک کے راستے سے متعلق دلچسپ ہے وہ یہ کہ ناک کی نالی ہمیشہ آنسوؤں کے بہنے سے جو آنکھ کے گوشے سے ہمیشہ اس میں ٹپکتے رہتے ہیں اور ناک میں ایک خاص غدود ہے جس سے ترشح کا عمل جاری رہتا ہے جس سے اس (مواد) اور اضافہ ہو جاتا ہے اور جو مناسب حد تک گرم اور مرطوب ہوتا ہے اور سانس کی ہوا کو پھیپھڑوں میں داخل ہونے کے لئے آمادہ اور مائل کرتا ہے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مذکورہ ہوا سرد اور خشک ہوتی ہے اگر وہ اسی حالت میں پھیپھڑوں میں داخل

---

۱ [دل کی دھڑکنوں کا دقیق مطالعہ" کا ڈیوگراف" نامی آلہ کے توسط سے کیا جاتا ہے۔] ؟؟

ہو جائے تو زکام کا یا پھیپھڑوں کے دوسرے امراض لاحق ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس بنا پر لازم ہے کہ ایسی ہوا کو پھیپھڑوں میں جانے سے پہلے گرم اور مرطوب ہو جانا چاہئے اور یہ (ہوا) بھی ناک کے دو سوراخوں سے گزرتے ہوئے صاف ہو جاتی ہے اور یہی سبب ہے کہ طبی لحاظ سے حتی الامکان منہ سے سانس نہ لینا چاہئے بلکہ صرف ناک سے سانس لینا چاہئے۔

بدن کا حاکم اعلیٰ

(سلسلۂ اعصاب)

یہ کارخانہ ایک معنی میں انسان کے بدن کا اہم عضو ہے کیونکہ حرکت اور حس جو زندگی کے دو بنیادی رکن ہیں اس کارخانے سے تحفظ حاصل کرتے ہیں اور انسان کا رابطہ زندگی کے ماحول اور تمام بیرونی دنیا سے اسی کے وسیلے سے قائم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بدن کی مختلف مشنریوں جیسے معدہ یا اس جیسے اعضاء بدن کی تمام غیر ارادی حرکتیں اسی مشنری سے وابستہ ہیں اور داخلی امور کا کنٹرول اور نظم و ضبط اسی کے ذریعہ وجود میں آتا ہے مجموعی طور پر بدن کی ارادی اور غیر ارادی حرکتیں اور احساس اور ان کا انتظام سلسلۂ اعصاب سے مربوط ہے اس طرح کہ اگر وہ کام کرنا چھوڑ دے تو ایک آن میں انسان حس و حرکت سے محروم ہو جائے اور بدن کی تمام مشنریوں کی حرکت رک جائے اور اس میں خلل پڑ جائے۔

اس مشنری کی ساخت بدن کی دوسری تمام مشنریوں سے زیادہ پیچیدہ، زیادہ نازک اور اسی مناسبت سے زیادہ منظم ہے حتی کہ اس کے اسرار میں سے بہت سی باتیں اب بھی انسان سے پوشیدہ اور مخفی ہیں۔

سلسلۂ اعصاب ایک کامل اور ساز و سامان سے آراستہ محکمۂ اطلاعات کی طرح ہے جو نہایت باریک اور منظم تاروں اور لائنوں کے ذریعہ تمام بدن کے مرکزوں تک پھیلا ہوا ہے اور جونہی کوئی داخلی یا خارجی عوامل کا اثر ان پر پڑتا ہے وہ اس کی اطلاع بجلی کی طرح اپنے مرکز کو جو دماغ ہے پہنچاتے ہیں۔ البتہ اس مشنری کے عجائبات اور اسرار بہت زیادہ ہیں اور ان تمام دقائق کا بیان کرنا اس کتاب میں ممکن نہیں ہے اس لئے ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ اس حیرتناک مشنری کے چند نکات سے اگر گراں بہا اور فائدہ بخش نتیجوں سے جو اس جہان ہستی کے انتظام کے بارے میں ہمارے ہاتھ آئے ہیں آپ کو واقف

کرادیں۔

اطلاعات وآگاہی کے آراستہ مراکز

پٹھے اور سلسلۂ اعصاب کا دارالخلافہ اور مرکز "دماغ" ہے جو بدن کے تمام اعضاءِ رئیسہ کی طرح ایک محفوظ محل میں یعنی کھوپڑی کی ہڈیوں کے مضبوط قلعہ کے بیچ میں عجیب طرح بیٹھا ہوا ہے۔ دماغ کے ذمہ انسان کی زندگی کا بہت زبردست اور سنگین فریضہ عائد ہے، یہ چھوٹا اور نہایت نازک عضو ہمارے بدن کے کل قویٰ کا ڈائریکٹر اور حاکم اعلیٰ ہے اور بدن کی تمام مشنریاں اپنے آپس کے روابط سے اور اس (دماغ) کے توسط سے کام انجام دیتی ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ بدن اور خارجی دنیا کا آپس میں رابطہ اور انسان کی ذہنی کارکردگی اور فکر اسی کے ذریعہ قائم ہے۔

ظاہر ہے کہ انسان اپنی زندگی بسر کرنے میں اپنے ماحول اور خارجی دنیا سے تعلقات رکھنے پر مجبور ہے کیونکہ وہ اسی ذریعہ سے اپنے ماحول سے اور اپنے سے باہر کی چیزوں سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ دماغ چونکہ ان تمام چیزوں کو تحفظ فراہم کرتا ہے اور اپنے قبضہ میں وہ ایسے خدمت گار رکھتا ہے جو اس کام میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ حواس پنجگانہ کہ مشنری یا زیادہ تر آنکھ اور کان اور حس لامسہ وغیرہ ہر ایک اپنی عجیب وغریب ساخت اور پورے عزم وارادہ کے ساتھ دماغ سے اتحاد عمل کرتی ہے اور انسان کا اس کی بیرونی زندگی سے رابطہ قائم رکھتی ہے۔ یہ حقیقت میں دماغ کے آگاہی اور اطلاعات کے محکمے ہیں جنھیں ہر قسم کے وسائل مہیا ہوتے ہیں اور ہر ایک اپنے دائرہ اختیار میں مرکز کے لئے خبریں اور اطلاعات جمع کرنے میں ہنرمندی کے ساتھ مصروف رہتا ہے۔

[1] [اس کی توضیح یہ ہے کہ بدن میں خون کی ایک کامل گردش ۳۰ مرتبہ دل کے دھڑکنے کے بعد یعنی تقریباً نصف منٹ میں مکمل ہوتی ہے اس لحاظ سے ہر ایک منٹ میں بدن کا خون دو مرتبہ دل میں سے گزرتا ہے اور جسم میں خون کی مقدار کا اندازہ ۵ لیٹر کیا گیا ہے اور ہر منٹ میں دس لیٹر خون اور رات دن میں ۱۴ ہزار لیٹر سے زیادہ خون دل میں سے گزرتا ہے اور ۳۰ سال کی مدت میں ۱۵۰ ملین لیٹر سے بھی زیادہ ۱۵۰۰۰۰ ٹن سے بھی زیادہ ہوگا۔

اس غرض سے کہ پوری بات سمجھ میں آجائے ایک تیل بردار ٹینکر کو پیش نظر رکھئے۔ رات دن میں دل جس قدر خون اپنے میں سے گزارتا ہے وہ اس قدر رہتا ہے کہ آپ اس سے مذکورہ ٹینکر پُر کرلیں]

مثلاً: آنکھیں بیرونی مناظر کو خوب اچھی طرح دیکھتی ہیں اور اپنی آراستہ مخصوص مشنری کے ذریعہ جو فوٹو گرافی سے مشابہ ہے ان تمام چیزوں کی تصویریں کھینچ کر ان کو دماغ کی طرف بھیج دیتی ہیں اور کان بھی مختلف گوناگوں آوازوں کو اپنی مخصوص مشنری کے ذریعہ حاصل کرکے دماغ کے سامنے ان باتوں کو دہرا دیتے ہیں اور اسی طرح تمام حواس کا حال ہے ان میں سے ہر ایک کی ساخت اور ہر ایک کام کی وضاحت اس کے موقع پر کی جائے گی۔

زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ حواس مذکورہ ایک پراسرار اور گہرا اتحاد عمل رکھتے ہیں کیونکہ کسی حادثہ کے وقت وہ تمام مشترکہ کام کرتے ہیں اور مختلف واقعات کو دماغ کے سامنے پیش کردیتے ہیں اور دماغ بھی ایک لمحہ کے اندر سب کو حاصل کرلیتا ہے اور بلا تاخیر مناسب احکامات صادر کرتا ہے یعنی آنکھوں سے خبریں حاصل کرتے وقت وہ کان کی گذارشات سے غفلت نہیں برتتا اور ایک خاص سسٹم "تناوب مرایج" سے استفادہ کرتے ہوئے جو اطلاعات اس کو دوسرے حواس کے ذریعہ سے یکے بعد دیگرے ملتی جاتی ہیں ان کو بہت غور سے سنتا ہے اور اپنے احکامات سے ان کو مطلع کرتا جاتا ہے[1]

اس مشنری کے عجائبات

انسان کا ارتباطی نظام تین بنیادی چیزوں: "اعصاب"، "دماغ" اور "حرام مغز" سے تشکیل پایا ہے۔ جن کا ذکر ہم یہاں مختصر طور پر کریں گے۔

انسان کے جسم میں دو قسم کے اعصاب ہیں۔ ان دونوں کے مجموعہ کو سلسلۂ اعصاب کہتے ہیں:

[1] [علوم طبیعی کے ماہرین دل کی خودکار حرکتوں کے بارے میں دو نظریے رکھتے ہیں: پہلا نظریہ "میوژن" کے نظریہ کے نام سے مشہور ہے جس کی رو سے خود دل کے اندر ایسے عوامل موجود ہیں جو براہ راست منظم طور پر سکڑاؤ پیدا کرسکتے ہیں۔ دوسرا نظریہ "نوروژن" کے نظریہ کے نام سے مشہور ہے کہ اس کی رو سے قلب کا سکڑاؤ عصبی خلیات سے حاصل شدہ تحریکات کے سبب سے ہوتا ہے جو دل میں موجود ہوتی ہے]

[2] [سرخ رگیں یہ رجعت پسند (ردعمل کرنیوالی) نالیاں ہیں جو خون کو دل سے حاصل کرکے اپنے میں سے گزارتی ہیں اور اسی وجہ سے کہ ان میں لوٹانے کی طاقت ہوتی ہے وہ کھلتی اور بند ہوتی ہیں اور دل کے فعل کو

۱۔ ایک وہ سلسلۂ اعصاب ہے جو بدن کی حرکتوں پر پوری طرح اثر انداز ہے۔ جن کو اعصاب دماغی اور اعصاب نخاعی (حرام مغز) کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اعصاب کے یہی حصے انسان اور خارجی ماحول کے درمیان رابطہ کا کام دیتے ہیں۔[1]

۲۔ جو سلسلۂ اعصاب، بدن کی تمام مشنری اور اعضاء کی غیر ارادی حرکتوں کو غیر ارادی طور پر جاری رکھتا ہے۔ خون کی گردش اور تنفس اور ہاضمہ سے متعلق تمام حرکتیں اس کے ذریعہ سے کنٹرول ہو کر پایہ تکمیل کو پہنچتی ہیں اس قسم کے اعصاب کی دو قسمیں ہیں: (۱) ''سیمپوٹک'' (۲) ''پاراسیمپوٹک''۔

سیمپوٹک اعصاب کا کام بدن کے غیر ارادی اعضا اور بعض مشنریوں کی حرکتوں کو تیز کرنا ہے جو واقعتاً گیس سے چلنے والی موٹر کار کی طرح ہیں اور ان کے کام کی رفتار کو تیز کرنے پر مامور ہیں اور

تکمیل کر کے خون کو دباؤ کے ساتھ آگے بڑھا دیتی ہیں۔ اس قسم کی رگوں کو ''شریان'' کہتے ہیں عام طور پر یہ بدن کی گہرائی میں ہوتی ہیں اور مرنے کے بعد ان کا خون سیاہ رگوں میں منتقل ہو جانے کے سبب وہ خالی رہ جاتی ہیں اور ان کی شکل زرد رنگ کی نالیوں جیسی ہو جاتی ہے۔ اور رگوں کی دوسری قسم کو جنھیں سیاہ رگیں اور وریدیں کہا جاتا ہے، کالے رنگ کا خون ان میں سے گزر کر دل کی طرف جاتا ہے ان نالیوں کا رنگ سرخ اور ان کی لگانے والی قوت کمزور ہوتی ہے اور جسم کی اہم سیاہ رگیں، چار گردن کی سیاہ رگیں اور دو قلب کی اوپر کی اور نیچے رگیں ہوتی ہیں۔

تیسری قسم جن کو ان کی باریکی اور نزاکت کی وجہ سے موئی رگ کہا جاتا ہے غیر معمولی زیادہ تعداد میں بدن کے تمام حصوں میں پھیلی ہوئی ہیں اور ان میں سے بعض تو اتنی نازک اور باریک ہیں کہ آنکھ سے دکھائی نہیں دیتیں۔ موئی رگوں کا قطر عام طور پر ۶ تا ۱۲ مائیکرون ہوتا ہے یعنی یہ اس قدر نازک ہیں کہ بغیر آلات کے خالی آنکھ سے نظر نہیں آتیں۔ اگر ان کو ۱۰۰۰ سے ۱۵۰۰ تک ایک دھاگہ میں لپیٹ دیا جائے تو اس دھاگہ کا قطر ایک ملی میٹر ہوگا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان موئی رگوں کی دیواروں سے حیاتی اور غذائی مواد باہر نکلتا رہتا ہے اور اس کی بجائے ان میں دفاعی اور زہریلا مواد داخل ہو جاتا ہے اور اس ذریعہ سے خلیات کا عمل جذب و دفع انجام پذیر ہوتا ہے]

اس وقت اعصاب کا یہ گروہ ایک پٹھے کی مدد سے دماغ اور حرام مغز کی مرکزی مشنری میں رابطہ پیدا کرتا ہے۔ اس طرح اعصاب کے درمیان کامل ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔

''پاراسیمپوٹک'' اعصاب، سیمپوٹک اعصاب کی برخلاف یہ مذکورہ مشنریوں اور اعضاء کی حرکات کو گھٹانے کے کام پر مامور ہیں اور یہ موٹر کار کے بریک کی طرح کام کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر ان دو خودکار اعصاب کے گروہوں کے توازن اور تقابل کی وجہ سے بدن کی مشنریاں منظم رہتی ہیں اور ان کا کام متوازن رہتا ہے اور بدن کی مشنریوں میں ایک عمدہ نظم قائم ہو جاتا ہے اور یہ کام انسان کی توجہ کے بغیر غیر ارادی طور پر خودبخود انجام پاتا ہے۔

اب غور کیجئے کہ اگر ایسا زبردست برابری ان کے کام میں نہ ہوتا تو انسان کے بدن میں کتنی بدنظمی اور افراتفری پھیل جاتی اور نتیجہ یہ ہوتا کہ اس کے اثر سے اعضاء کی ہم آہنگی اور اتحاد عمل ختم ہو جاتا اور وہ بالکل بیکار ہو جاتے۔ ان دونوں مشنریوں میں برابری قائم رہنا ان اسرار میں سے ہے جس نے ہمیں خود ہمارے بدن کے حیرت انگیز نظام سے آشنا کیا اور اس پیدا کرنے والے کے وجود کی جانب جس نے اپنے علم، قدرت اور پلاننگ کے ساتھ ایسی عجیب چیز پیدا کی، ہماری رہنمائی کی۔ اپنے وجود کی ان مختلف مشنریوں کی سیر اور تماشا ہی ہمیں اس بزرگ مبداء سے نزدیک کرنے اور آشنائی بخشنے کے لئے کافی ہے۔

اگر کسی شخص میں دماغ نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟!

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے انسان کا دماغ سلسلۂ اعصاب کا مرکز ہے اور اس کے ذمہ بہت سے اہم کام ہیں۔ اس کے پاس ایک نہایت پیچیدہ اور منظم مشنری ہے اور ابھی تک ماہرین فن کی نظر سے اس کے

۱۔ [خون کا ہر ایک جسیمہ مسور کے دانہ کے مشابہ ہوتا ہے جس کی جسامت ۷ مائیکرون اور قطرے ۲ مائیکرون ہوتا ہے البتہ جو تعداد سرخ جسیموں کی بیان کی گئی ہے وہ معمول کے مطابق ہے ورنہ ممکن ہے کہ خطرہ کے موقع پر اور عوامل کے اثرات کے ماتحت اس میں کمی اور بیشی ہو جائے۔ چنانچہ بلندی پر ان کی تعداد بڑھ جاتی ہے اس طرح کہ ۱۸۰۰ میٹر کی بلندی پر ہر مکعب ملی میٹر خون میں ان کی اوسط تعداد ۵ ملین سے ۸ ملین تک ہوتی ہے]

بہت سے اسرار پوشیدہ ہیں ۔یہ بات مسلمہ ہے کہ دماغ ''مخ'' اور ''مخچہ'' نامی دو چیزوں سے تشکیل پایا ہے لے

دماغ کا عمدہ حصہ وہی ''مخ'' ہے جس کی مختصر تشریح ہم یہاں قارئین کے سامنے پیش کر رہے ہیں ۔

''مخ'' دماغ کا بہترین بڑا حصہ ہے اور یہ بہت ہی نازک عضو ہے جو چند سنٹی میٹر موٹے ایک خاکی رنگ کے مادہ سے چھپا ہوا ہے اور اس میں ایک بڑا شگاف ہے جس سے نمایاں طور پر اس کے دو حصے ہو گئے ہیں جس کو ''دماغ کے دو نصف کرے'' کہا جاتا ہے اور اس کی ظاہری شکل مغز اخروٹ سے زیادہ مشابہ ہے البتہ خاص رگیں ان دو نصف کروں کو آپس میں ملا دیتی ہیں ۔

''مخ'' کی سطح کے حصہ میں لکیریں' نشیب وفراز اور عجیب وغریب قسم کی لائنیں ہیں جو اس کو بہت ہی پرشکن بنا دیتی ہے اگر چہ اس لطیف عضو کی ساخت بڑی حیرت انگیز ہے لیکن جو کام اور اہم فرائض اس کے تو سط سے انجام پاتے ہیں وہ اس سے کئی درجہ زیادہ حیران کن اور تعجب انگیز ہیں ۔

دماغ' ہوش' ارادہ اور شعور و حافظہ کا مرکز ہے اور بہت سے روحی اعمال جیسے خوف وہراس وغیرہ کا اس سے تعلق ہے ۔چنانچہ مختلف حیوانات پر جو تجربے کئے گئے ہیں اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے مثلاً: کبوتر کے بارے میں تجربہ کرنے پر معلوم ہوا کہ کبوتر بغیر دماغ کے (یعنی اس کا دماغ باہر نکال لینے کے بعد) زندہ رہتا ہے لیکن اس کا شعور بالکل ختم ہو جاتا ہے اور اپنے اطراف کی کسی چیز کا اس کو پتہ نہیں چلتا اس طرح کہ اگر اسے ہوا میں اڑا دیں تو وہ اڑ سکتا ہے لیکن اس کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں اس سے وہ بے خبر رہتا ہے اور بغیر توجہ کئے اپنے آپ کو در و دیوار سے اور درخت وغیرہ سے ٹکرا دیتا ہے اور اگر دانہ بھی اس کے سامنے ڈال دیں تو اسے نہیں پہچان سکتا اس لئے بھوک اور پیاس سے مر جاتا ہے لیکن دانہ اور پانی کے لئے منہ نہیں کھولتا ۔اگر دانہ اس کے منہ میں ڈال دیا جائے تو وہ اسے نگل لیتا ہے اس طرح ممکن ہے کہ حیوان مذکور کچھ دن زندہ رہ جائے جیسا کہ مختصر طور پر بیان کیا جا چکا ہے کہ اعصاب کا تعلق ہاضمہ وغیرہ کی خودکار مشری کے افعال و حرکات سے ہوتا ہے اور وہ ارادہ وحس کے مراکز کے بغیر بدن کی خودکار مشنری کی چرخیوں کو گردش دے سکتے ہیں ۔

ایک تجربہ میں ایک کتے کا دماغ بھی نکال کر مشاہدہ کیا گیا کہ بغیر دماغ کا کتا ۱۸ مہینے تک زندہ رہا لیکن اس میں حافظہ اور ہوش' غصہ اور ڈر وغیرہ باقی نہیں رہا اور وہ دوست اور دشمن کو پہچاننے کے قابل نہ رہا' انسانوں کے دماغوں پر بھی جو تجربات کئے گئے اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ جو نقصانات دماغ میں پیدا ہو جاتے ہیں اس میں ہمیشہ ہوش اور حافظہ کا نقصان شامل ہوتا ہے اور یہ اکثر جنون کا سبب بن جاتا ہے اور اس حساس عضو کے ہاتھ سے نکل جانے کا مطلب ادراک اور شعور کا ہاتھ سے نکل جانا ہے ۔

بہت ہی مختصر جگہ میں ایک بہت بڑا کتب خانہ

دماغ میں مختلف منطقے ہیں کہ ان میں کا ہر ایک ادراک کی کارکردگی کے حصہ کا مرکز ہے لے اور ان میں سے سب سے زیادہ دلچسپ اور سب سے زیادہ حیرت انگیز حافظہ اور یادداشت سے متعلق علاقہ ہے ۔اس علاقہ کا کام نہایت حیرت انگیز ہے ۔وہاں پر پوری عمر کی سرگذشت ریکارڈ کی منظم فائلوں کی طرح موجود رہتی ہیں اور انسان چند سکنڈ کے غور وفکر کے بعد ریکارڈ کی تمام فائلوں کو الٹ پلٹ کر اس میں سے چند سال پرانے سارے واقعات کو کسی شخصی واقعہ یا حادثہ کی یاد کو تازہ کر سکتا ہے ۔

اس سے ہٹ کر دماغ کا یہ چھوٹا سا حصہ ایک بڑے کتب خانہ کا کام انجام دیتا ہے اور انسان کی تمام دانشمندیاں اور علمی کارگزاریاں اور تمام تحقیقات اس حقیر حصہ میں درج کر دی جاتی ہیں ۔آراستہ اور بڑے بڑے کتب خانوں میں مطلوبہ کتاب حاصل کرنے کے لئے کم از کم چند منٹ یا چند گھنٹے لگ جاتے ہیں اس کے برعکس اس چند ملی میٹر کے کتب خانہ میں سے کتاب نکالنے میں ایک عقلمند شخص کو چند سکنڈ سے زیادہ وقت کی ضرورت نہیں ہوتی ۔غالباً صرف ارادہ کرتے ہی اس مطلوبہ شکل یا کتاب کے صفحات اس کے ذہن کے سامنے مجسم ہو کر آجاتے ہیں ۔

ایک دفعہ ایک شخص کے حافظہ کے ایک مرکزی حصہ کا آپریشن کرکے وہ حصہ نکال لیا گیا تو وہ شخص جس پر تجربہ کیا گیا تھا اپنی گزشتہ زندگی کے کئی سال کے واقعات کو بالکل بھلا بیٹھا اور ایک ایسے شخص کی مانند ہو گیا جو برسوں سے دنیا میں نہ رہا ہو اور اپنے اچھے برے کام' دوستی اور حالات سے جو اس مدت میں وقوع پذیر ہوئے تھے اس سے بالکل ناواقف رہا ہو اور وہ جس قدر بھی سوچتا اور غور کرتا تھا ان میں سے

کوئی چیز بھی اسے یاد نہ رہی۔

کیا آپ کے خیال میں ایک ایسے نہایت مختصر عضو میں ان تمام واقعات اور معلومات کا درج ہو جانا اور وہ بھی ایسی صورت میں کہ ہر وقت وہ پوری طرح فکر انسانی کی دسترس کے اندر ہوں کوئی معمولی کام ہے؟ معلوم نہیں وہ لوگ جو عقل حافظہ اور فکر سے معرا فطرت کو موجودات کی خالق سمجھتے ہیں ان کا عقل فکر اور حافظہ کی پیدائش کے بارے میں کیا جواب ہے؟

نیند کیا ہے؟

نیند جو ہماری عام زندگی کے لوازمات میں سے ہے اور بعض کے خیال میں اس کے سبب سے کافی عمر برباد ہو جاتی ہے۔ ایسی کیفیت ہے جو دماغی اور اعصابی مرکزوں کے وقتی طور پر ناکارہ ہو جانے کے باعث انسان میں پیدا ہو جاتی ہے یعنی جس وقت انسان سوتا ہے تو دماغی مرکزوں میں سے صرف ایک مرکز اپنا کام کرنا چھوڑ دیتا ہے لیکن دماغ کے باقی حصے اور جسم کی تمام مشنریاں اسی طرح اپنے کام میں مشغول رہتی ہیں اور ان کے لئے رات دن اور نیند اور بیداری میں کوئی فرق نہیں پڑتا اس لئے سوتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے پانچوں حواس کام نہیں کر رہے ہیں لیکن بدن کے تمام حصے عجیب عزم اور ہم آہنگی کے ساتھ اس طرح اپنا کام انجام دیتے رہتے ہیں اور عام طور پر انسان جو خواب دیکھتا ہے وہ بدن اور دماغ کے تمام حصوں کی کارکردگی میں رابطہ کے بغیر ممکن نہیں ہے

یہ بات ظاہر ہے کہ یہ (خواب) خلیات کے نشاط (خوشحالی) کی تجدید میں بدن کے فرسودہ حصوں کی تعمیر میں ٗ ہاتھ سے گئی ہوئی قوتوں کی جگہ پُر کرنے میں اور بدن کو جدید حیاتی کاموں کے لئے آمادہ کرنے میں ایک حساس ترین کردار ادا کرتا ہے حتیٰ کہ بدن کی تمام رات دن کام کرنے والی مشنریاں جن کے ذمہ دائمی کام ہوتا ہے، نیند میں بھی کم ہی آرام لیتی ہیں۔ چونکہ ان کا کام اور ان کی حرکت بظاہر ہلکی ہو جاتی ہے اس لئے صحیح اور بروقت نیند کو جسم کی سلامتی کا اور عمر کی درازی کا راز سمجھا جاتا ہے۔

کہیں غلطی نہ ہو جائے!!

ان بیانات سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہئے کہ انسان کے دماغ اور دماغ کی مادی قوتوں کے ماوراء کوئی

اور چیز ''روح'' نام کی وجود نہیں رکھتی اور یہ کہ روح ان ہی دماغ کے حصوں کی میکانیکی کارکردگی کا نام ہے لے کیونکہ یہ ایک سخت غلطی ہے۔ انشاء اللہ اپنے مقام پر اس کے بارے میں تفصیلاً اور مستقل بحث کی جائے گی۔

لیکن اس جگہ اس غلطی کے ازالہ کے لئے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ اس حصے میں بحث کرنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ روح اور فکری اعمال صرف دماغ اور دماغ کی مادی قوتوں کا نتیجہ ہیں بلکہ یہ مقصود ہے کہ اس جہان کے روحانی حالات و افکار اور حافظہ وغیرہ دماغ سے اور دماغ کے مختلف حصوں سے مربوط ہیں۔ یہ نہیں کہ روح دماغ کے اعضاء کے میکانیکی کیفیت کی پیداوار ہے البتہ وہ لوگ جو صرف روح کے معتقد ہیں وہ بھی روحانی کارکردگی میں ان اعضاء کے دخیل ہونے سے انکار نہیں کرتے کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ دماغ کے اعضاء میں سے کسی عضو میں خلل پڑنے یا اس کے ضائع ہو جانے کے سبب سے اس کے مخصوص اعمال کا ایک حصہ کام سے رک جاتا ہے۔ بہر حال ہم پھر تاکید کرتے ہیں کہ اعصاب اور دماغ کی فزیالوجی سے متعلق بحثیں ہمیں جو کچھ سکھاتی ہیں وہ یہ ہے کہ اس جہان کے روحی اعمال ان مشنریوں سے مربوط ہیں نہ یہ کہ محض اعمال مذکورہ ہی دماغ کے مادہ کے اور سلسلۂ اعصاب کے کیمیائی اور طبیعی خواص ہیں اور اس کے سوا کوئی دوسرا ربط نہیں رکھتے ہیں۔ ہمارے عقیدہ کے مطابق صرف دماغ کی قوتیں اور اس کے اعضاء ہی روحی کارکردگی کا ایک ذریعہ ہیں اور انسانی روح ان کے توسط سے بدن میں بھی اور خارجی طور پر بھی کارفرما رہتی ہے اور دماغ اور سلسلۂ اعصاب اس کے آلہ کار سمجھے جاتے ہیں اور بہر حال ان کاموں پر ان کے اثر انداز ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

افسوس کہ مادہ پرست لوگ اس جہانِ طبیعی کے علتوں کو سمجھنے اور خدا پر اعتقاد کے بارے میں غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ خدا پر اعتقاد رکھنے کے معنی طبیعی عوامل اور علل سے انکار ہے اور (یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ) علل طبیعی کو ثابت کرنے کے بعد پیدا کرنیوالے کے وجود کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

یہ اعتراض بھی سابقہ اشکال کی طرح ماہرین علم الٰہی کی باتوں کی باریکیوں کا گہرا مطالعہ نہ کرنے کے

سبب سے پیدا ہوا۔ اس اعتراض کا اور مادہ پرستوں کے دوسرے اعتراضات کا تفصیلی جواب تیسرے حصے میں ملاحظہ کیجئے۔

جو کچھ یہ مشنری ہمیں سکھاتی ہے

اعصابی مشنری کا مطالعہ کرنے سے اور سلسلۂ اعصاب اور ان کے مختلف مراکز کی ساخت میں جو پیچیدگیاں اور نزاکتیں موجود ہیں ان کو اور ان کے ایک دوسرے کے ساتھ روابط کو اور اسی طرح دنیا کے خارجی ماحول کو پیش نظر رکھنے سے جو جہانِ آفرینش اور بدن کے حیرت انگیز نظام کی دوسری روشن دلیل ہے ہمیں تمام باتوں کا بخوبی علم ہوجاتا ہے۔

---

۱ [ظاہر ہے کہ ہر فرد کے بارے میں عادلانہ قانون وہی ہے جو جسمانی حالات اور فطرت کے مطابق ہو۔ اگر کوئی شخص موم سے لوہے کے کام کی یا اصلِ عربی گھوڑے سے سنگین وزن کے حمل و نقل کا سخت کام کرنے کی توقع رکھے تو وہ غلطی پر ہے کیونکہ اس نے ان دونوں سے ان کی خلقت کے مقتضاء کے موافق کام نہیں لیا کیونکہ موم کی یا اصلِ عربی گھوڑے کی فطرت پتہ دیتی ہے کہ لوہے کا کام اور طاقت فرسا بار برداری کا کام ان کی ساخت کے مطابق نہیں ہے اور ان کاموں کے لئے دوسروں کو پیدا کیا گیا ہے۔

ایک طرف تو یہ بات مسلم ہے کہ مرد اور عورت کی جسمانی ساخت میں بھی کافی فرق ہوتا ہے اور قوت بدنی اور قوت مدافعت اور نزاکت وغیرہ کے لحاظ سے ان دونوں میں بیّن فرق موجود ہے جس طرح ان دونوں کی عقلی اور فکری قوتوں میں فرق ہے اسی طرح ان کی ذہنی کیفیت میں بھی فرق ہے۔ مثلاً عورت کی جنس میں سب چیزوں سے زیادہ احساسات اور عنایات کا جذبہ کارفرما ہے۔ اس لحاظ سے ایک عادلانہ قانون چاہتا ہے کہ ان دونوں کی سیاسی اجتماعی اور عائلی زندگی وغیرہ کی پالیسی متعین ہو جو ان دونوں کے فطری تقاضوں کی بنیاد پر استوار ہوئی ہو اور جو دونوں کے وجود کے تقاضوں کو پورا کرے ورنہ اگر کوئی قانون چاہے کہ ان تمام جسمانی اختلافات اور فطری تقاضوں کو نظر انداز کرکے عورت کو صرف وہی چیزیں دے جو مرد کی فطرت کے مطابق ہیں تو اس صورت میں دونوں پر ظلم ہوگا کیونکہ عورت کو اپنے کمال کے راستے سے ہٹا کر مرد کو بھی اس کے طبیعی جائز حقوق سے محروم رکھا گیا ہے۔ (مزید وضاحت کے لئے کتاب "زن و انتخابات" کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور طبع ہوچکی ہے)]

اس بات کو مکرر بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ بدن کی یہ حیرت انگیز مشنری ہر ایک حصہ میں ایک نظم اور ایک پیچیدہ پروگرام کے مطابق کام کررہی ہے اور جن لوگوں نے نہایت غور اور تحقیق و تجسس کے ساتھ تعصب سے بالاتر ہوکر گزشتہ مختصر بیانات کا مطالعہ کیا ہے ان لوگوں پر یہ موضوع روز روشن کی طرح عیاں ہے اور یہ اس جہان ہستی کے عظیم مبداء کے علم و قدرت کی کھلی نشانی ہے۔

گذشتہ بحثوں کا خلاصہ اور نتیجہ

جہان آفرینش کی تنظیم کے دلائل کا حصہ یہاں ختم ہوچکا۔۱ اور چونکہ یہ حصہ بہت طویل ہوگیا ہے اور دلیلِ نظم کے دو بنیادی رکنوں کے درمیان کافی فاصلہ ہوگیا ہے اس لئے مناسب ہے کہ یہاں نظم کی دلیل اور اس کے نتیجے کو حسب ذیل چند جملوں میں مختصراً بیان کردیا جائے۔

پہلا ستون (صغریٰ) جب ہم موجودات اور اس کشادہ عالَم کائنات کی مختلف مشنریوں کو زیر مطالعہ لاتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے ترتیب نہیں ہیں اور ایسا نہیں ہے کہ ہر وجود میں آنے والی چیز سے ایک چیز لازماً ختم ہوجاتی ہے یا پیدا ہوتی ہے بلکہ ظاہر ہے کہ دنیا کے ہر گوشے اور ہر کنارے میں چھوٹے چھوٹے موجودات سے لیکر کہکشاؤں اور بے انتہا وسیع آسمانوں میں ایک تنظیم اور ایک دقیق انتظام کارفرما ہے۔ پوری دنیا معیّن قوانین کے تحت چل رہی ہے اور اس کے کارخانوں اور اس کے مظاہر میں حیرت انگیز ہم آہنگی اور اتحادِ عمل موجود ہے۔ ہر موجود اپنی منزلِ مقصود کی طرف جانے کے لئے ایک معیّن راستے پر گامزن ہے اور تمام امور ایک حیرت انگیز انتظام کے ماتحت جو تمام عالم کائنات کو مسخر کیا ہوا ہے انجام پارہے ہیں۔

اس وقت تک جہان آفرینش کے چھوٹے اور بڑے موجودات اور مختلف مشنریوں کے بارے میں جس قدر مطالعہ کیا گیا ہے، اس نے ہمارے موضوع کو نہایت کامل اور واضح طریقہ پر ثابت کردیا ہے۔

---

۱ [عام طور پر پھیپھڑوں میں بطور اوسط ۳ ـ ۵ لیٹر کی گنجائش ہوتی ہے لیکن یہ (گنجائش) مختلف لوگوں میں مختلف ہوتی ہے ہوسکتا ہے بعض میں اس سے کم یا زیادہ ہو اور لوگوں کی جسمانی اور روحانی کیفیت کی بنا پر بھی یہ فرق واقع ہوجاتا ہے۔ پھیپھڑوں کی گنجائش کی پیمائش ایک مخصوص مشنری سے کی جاتی ہے جس کا نام "اسپرومیٹر" ہے]

دوسرا ستون (کبریٰ) ہر کارخانہ اور اس کے مظاہر جیسے بھی ہوں کسی حادثہ کا نتیجہ (یعنی ایسے اسباب کا جس میں شعور نہ ہو اور ایسے عوامل کا جس میں عقل نہ ہو اور جس کا کوئی مقصود نہ ہو) نہیں ہو سکتا۔ اور تنظیم ہمیشہ ایک منبع عقل و شعور اور علم و ہدف اور قدرت کی تابع ہوتی ہے اور یہ موضوع بھی چند دلیلوں اور بیانات سے پوری طرح واضح ہو گیا ہے۔

نتیجہ: اس بناء پر دنیا کے تمام موجودات اور چھوٹے اور بڑے تمام کارخانے ایک صاحب علم و قدرت عظیم مبداء کا نتیجہ ہیں جس نے ایک معین مقصد اور ارادہ کے ساتھ اس کائنات کی عظیم چرخیوں کو متحرک کر رکھا ہے اور اس حیرت انگیز کارخانہ کی پشت پر مسبب الاسباب اور خدائے قادر و توانا کا وجود کارفرما ہے جو کہ اس دنیا کا پیدا کرنے والا اور تمام علت و معلول کا خالق اور تمام قوانین عالم کو منظم کرنے والا ہے۔

جو لوگ کھلی آنکھوں اور روشن فکر کے ساتھ اس وسیع عالم کائنات کے کسی گوشہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان پر یہ روشن حقیق واضح ہو جاتی ہے اور دنیا کے ذرات کے دل سے جو توحید کی دلنشین آواز اور روح پرور صدا بلند ہو رہی ہے اسے روحانی کانوں سے سنتے ہیں۔ ہاں یہ دنیا اور فطرت از سرتا پا خدائے تعالیٰ کے علم و قدرت اور وجود کی نمائش گاہ ہے۔ ہر ایک حقیر ذرہ خدا شناسی اور توحید کی ایک بڑی کتاب ہے۔ وہ تمام چیزیں ہمیں معرفت اور توحید کا سبق دیتی ہیں۔ کون ہے جو ان تمام حقائق کا مشاہدہ کرے اور اس کا دل ایمان و معرفت سے پُر اور عشق و محبت سے مملو نہ ہو جائے۔؟؟

یہاں تک کہ بہت سے دانشور جو بظاہر مادہ پرست ہیں ان کے بارے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ مومن ہیں کیونکہ ان کا طرز عمل اس بات کی گواہی دیتا ہے اور وہ لوگ اپنے سائنسی مطالعات اور تحقیقات

ل [سانس لینے کے سلسلے میں تجربات کرنے سے اس بات کا پتہ چلا ہے کہ جو ہوا سانس لیتے وقت پھیپھڑوں میں داخل ہوتی ہے اس میں ۲۰ فیصد سے زیادہ آکسیجن اور تھوڑی سی ''انیدایڈ کاربونک'' (کاربن ڈائی آکسائیڈ) ہوتی ہے۔ پھر سانس چھوڑتے وقت اسکی آکسیجن ۱۶ فیصد کم ہو جاتی ہے اور ''انیدایڈ کاربونک'' کی مقدار بھی بڑھ جاتی ہے اور یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ پھیپھڑوں کے اندر ان دو گیسوں کا تبادلہ عمل میں آتا ہے]

اور تجربات میں ایک فکری الہام اور ایک آزمودہ عقل کی مدد سے دنیا کی تنظیم، اس کے منظم پروگرام اور اس کے تمام مظاہر پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جس وقت کسی ذرہ میں یا کسی زندہ شخص کے بدن کیکسی عضو وغیرہ میں کوئی حرکت پیدا ہوتی ہے تو اسباب اور اسرار کے پیچھے گھومنے لگتے ہیں اور ان کے عوامل وجودی کو جاننے کے لئے جستجو اور تحقیق میں لگ جاتے ہیں اور یہ بات بہت عجیب ہے کہ وہ اس وقت تک کوشش جاری رکھتے ہیں جب تک کہ اس کی پیدائش کا مقصد معلوم نہ کر لیں کہ وہ چیزیں کیوں اور کس کام کے لئے پیدا کی گئی ہے؟ اور کہتے ہیں:

''یقیناً اس کی فطرت کے پیدا کرنے میں کسی خالق کا ارادہ اور مرضی شامل ہے''۔ل

وہ لوگ عملاً اس بات سے مطمئن نہیں ہوتے کہ فطرت اور اتفاقات نے بغیر کسی مقصد اور فائدہ کے ان کو پیدا کر دیا ہے اور ان کا یہی طرز تفکر ہے جس نے انہیں اس قدر سائنسی تحقیقات اور حیرت انگیز انکشافات کے لئے آمادہ کیا ہے۔

لہٰذا اس بات کا اعتراف کرنا چاہئے کہ عقیدہ کا جو اختلاف ان میں اور لاکھوں خدا پرستوں کے درمیان ہے اس کی کوئی علمی اہمیت نہیں ہے اور اصطلاحاً (تکنیکی طور پر) ان کا جھگڑا ''لفظی'' ہے ورنہ بلحاظ بیان ان کا مقصد مشترک ہے۔ دونوں کا اعتقاد ہے کہ خالق کائنات صاحب فکر و صاحب ارادہ ہے اور اس نے کسی مقصد کے لئے دنیا کو پیدا کیا ہے لیکن فرق اتنا ہے کہ ایک گروہ اس کو ''فطرت'' کہتا ہے اور دوسرا گروہ اس کا نام ''خدا'' رکھتا ہے۔

مادہ پرستوں کی باتوں اور بیانات میں تھوڑا سا غور و تامل کرنے سے یہ بات بخوبی روشن ہو جاتی ہے کہ مادہ پرست عقل، فکر اور مقصد کی صفتوں کو فطرت کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں اور خدا پرست اُن ہی صفات کے حامل کو خدا کہتے ہیں ل

ہاں! تنہا جس چیز سے بہت سے مادہ پرستوں کو وحشت ہوتی ہے وہ لفظ ''خدا'' ہے ان کی نظر میں یہ لفظ خرافات کے ایک سلسلہ کا نام ہے جس کا بہت سے ارباب کلیسا اور ان جیسے لوگوں نے مشاہدہ کیا ہے۔ ہم مادہ پرستوں کے اعتراضات کی بحث میں اس غلطی کا بھی ازالہ کرینگے اور اس بارے میں کافی گفتگو

کریں گے۔

دوسری دلیل

وہ جس کا وجود خود اس سے ہے

الٰہیات کے سابقہ علماءٔ عقائد اور مذاہب سے مربوط بحثوں میں جسے "علم کلام" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ خالقِ کائنات (واجب الوجود) کے وجود کے ثبوت میں جو دلیل پیش کرتے ہیں اس میں سے ہم بے ضرورت چیزوں کو ترک کر کے اور جو کمی رہ گئی ہے اس کو پورا کرتے ہوئے حسب ذیل چند سادہ جملوں میں اختصار سے بیان کریں گے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا میں کوئی موجود ہے خواہ ہم ہر چیز کے وجود سے انکار کر دیں

لیکن کم از کم اپنے وجود سے تو انکار نہیں کر سکتے۔

ان موجودات (زمین و آسمان یا کم از کم ہم خود) کہ جسے ہم نے بے شک قبول کر لیا ہے کی کیفیت دو باتوں سے باہر نہیں ہے یا تو اس کا وجود از خود ہے یا کسی اور کے سبب سے۔ اگر اس کی ہستی از خود ہے تو ایسی صورت میں (پہلی صورت) جو علماء الٰہیات کا مقصود ہے پوری طرح ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ ہم نے ایک ایسے موجود کو پا لیا ہے جس کا وجود از خود ہے اور وہ کسی سبب کی پیداوار نہیں ہے اور اس لحاظ سے علل و معلول کا سلسلہ اس کی ذات پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی اور سبب نہیں ہو سکتا اور یہ بات مادہ پرستوں کے بنیادی اصول کو جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے درہم برہم کر دیتی ہے اور اس کے برخلاف بات ثابت ہو جاتی ہے ایسا وجود جس کا وجود غیر سے نہیں ہے بلکہ دوسرے موجودات کا وجود اس سے ہے اسے "واجب الاوجود" کہتے ہیں۔ لیکن اگر اس نے اپنی ہستی کو دوسرے سے حاصل کیا ہے (دوسری صورت) تو یقیناً وہ دوسرا جس نے اس موجود کو وجود بخشا ہے خود بھی موجود ہے ایسی صورت میں ہم پوچھتے ہیں کہ اس دوسرے کا وجود از خود ہے یا دوسرے کے سبب سے؟ اگر از خود ہے تو علماء الٰہیات کی بات ثابت ہو جاتی ہے اور اگر اس کا وجود بھی کسی اور کا پیدا کردہ ہے تو اب بحث کو اس (تیسرے) موجود پر منتقل کرتے ہوئے ہم اپنے سوال کی تکرار کرتے ہیں اور اسی طرح......۔

جہاں کہیں یہ سلسلہ علل و معلول رک جائے گا اور ایسی جگہ پہنچ جائے گا کہ اس وجود کے اوپر کوئی اور سبب موجود نہ ہو یعنی اس کا وجود از خود ہو تو پھر ہماری بات ثابت ہو جاتی ہے اور اگر علت و معلول کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہے اور کسی جگہ نہ ٹھہرے یعنی اسباب کا سلسلہ لامتناہی چلتا رہے تو ایسی صورت میں یہ لامتناہی سلسلہ عقلی دلیل اور کامل انسانی وجدان کی رو سے باطل ہے (اس بات کی وضاحت آئندہ کی جائے گی) اور بالفاظ دیگر جب ہم نے یہ بات تسلیم کر لی ہے کہ دنیا میں کوئی وجود ہے تو ہم اس بات پر مجبور ہیں کہ دونوں میں سے کوئی ایک بات قبول کریں یا اس وجود کو ایک ازلی اور جاودانی وجود تسلیم کریں کہ جس کی ہستی از خود ہے اور اسے اپنے وجود کے لئے کسی دوسرے وجود کی احتیاج نہیں ہے اور اصطلاحاً وہ "واجب الوجود" ہے۔

ہم نے ہر حال میں خداوند کے وجود کا اعتراف کیا ہے لیکن اگر ان دو احتمالات میں سے کسی ایک کی موافقت نہ کریں بلکہ اس بات کے قائل رہیں کہ یہ موجود دوسرے کے اثر کا نتیجہ ہے اور وہ خود بھی کسی سبب کا تابع ہے تو خلاصہ یہ ہے کہ اگر وہ وجود جس کی ہستی خود اسی پر منتہی نہ ہوتی ہو تو ایسی صورت میں ہمیں علل و معلولات کے ایک لا متناہی سلسلہ کے وجود کا قائل ہونا پڑے گا جسے اصطلاح میں "تسلسل" کہتے ہیں اور وہ بھی عقل و فطرت کے لحاظ سے مردود ہے۔

عقل اور فطرت تسلسل کو مردود قرار دیتے ہیں

فلسفہ کی کتابوں اور سابقہ علماء عقائد کے کلام میں تسلسل کی تکذیب کے لئے کئی دلیلیں پیش کی گئی ہیں جن میں سے بعض اشکال سے خالی نہیں ہیں یا کم از کم اتنی تسلی بخش نہیں ہیں اور وہ تکنیکی طور پر اس کا بدل نہیں ہو سکتیں۔ ان میں سب سے زیادہ مضبوط اور مدلل یہی دو دلیلیں ہیں جو ذیل میں بیان کی جا رہی ہیں:

۱۔ عقلی دلیل

جیسا کہ مندرجہ بالا دلیل میں بیان کیا گیا ہے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ "علت و معلول کے تسلسل" کا مطلب یہ ہے کہ علتوں کا ایک لا متناہی سلسلہ چلتا رہے اور ہر علت اپنی ذات کے لحاظ سے دوسرے کی محتاج ہو اور سوائے سبب بالا کے اس کی اپنی کوئی ہستی نہ ہو اور علت و معلول کے تمام سلسلے اسی طرح ہوں (غور کیجئے) اب ہم پوچھتے ہیں کہ ایسے امور کا سلسلہ جو محتاج تھا اور جس کی اپنی کوئی ہستی نہ تھی یکا یک کس طرح وجود میں آ گیا اور کس طرح خارج میں موجود ہو گیا؟ یہ ہستی کہاں سے آ گئی؟ ایسی صورت میں جبکہ ان علل و معلول میں سے کوئی بھی اپنا ذاتی وجود نہ رکھتا تھا اور ان کا سلسلہ ایک مستقل وجود اور ہستی رکھنے والے پر ختم نہ ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہو گا یعنی تسلسل کا عالم وجود میں آنا ممکن نہیں ہے خلاصہ یہ کہ جس طرح صفروں کی بے انتہا تعداد سے کوئی "عدد" وجود میں نہیں آتا اور موت کے لا متناہی عوامل کے اجتماع سے "حیات" وجود میں نہیں آتی اور بے حساب مردہ خلیات سے ایک زندہ "خلیہ" زندگی کے میدان میں قدم نہیں رکھ سکتا' اسی طرح لا تعداد "عدم" اور

"احتیاج" کے اجتماع سے "وجود" اور "بے نیازی" صورت پذیر نہیں ہو سکتے۔

۲۔ فطری راستہ

تسلسل کا جھوٹا ہونا فطری بات ہے اس کے ثبوت میں یہی بات کافی ہے کہ ہم اسے صاف دل لوگوں اور بچوں کی پاکیزہ اور اچھوتی فطری زبان سے سنتے ہیں اور اگر اس موضوع کے فطری ہونے میں ذرا سا بھی شبہ ہو تو اس کے حل کے لئے ہم اس پیمانے سے مدد لے سکتے ہیں جو فطریات کو جانچنے کے کام آتا ہے (جیسا کہ فطرت کی بحث میں بیان کیا گیا ہے)۔

ہم جس وقت بچوں کے طرز تفکر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان کی فطرت نے جو ابھی فلسفیانہ اور علمی پر پیچ و خم استدلالات اور بیانات اور گفتگو اور بحث کے اثر سے اپنی اصلی شکل تبدیل نہیں کی ہے بلکہ غیر مبدل اور باقی ہے وہ بھی تسلسل کو قبول نہیں کرتی اور اسے محال اور نامعقول تصور کرتی ہے۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ: بچے جن میں تجسس اور کھوج کا فطری جذبہ ہوتا ہے وہ اپنے ماں باپ سے دنیا کی بہت سی چیزوں کی پیدائش کے اسباب کے بارے میں سوال کرتے ہیں مثلاً بچے اپنے باپ سے پوچھتے ہیں کہ آپ میرے باپ ہو اور آپ کے باپ کون ہیں؟ باپ جواب دیتا ہے کہ میرا باپ فلاں ہے اور اپنے باپ کا نام لیتا ہے۔ بچہ پوچھتا ہے: ان کے باپ کون تھے؟ جواب دیتا ہے' فلاں۔ بچہ تجسس کے طور پر اسی طرح سوال کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ باپ جواب دیتا ہے کہ سب کے باپ آدم ہیں۔ بچہ اس بات سے مطمئن نہ ہو کر پھر پوچھتا ہے کہ ان کے باپ کون تھے؟

باپ جواب دیتا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے انہیں بغیر باپ کے پیدا کیا۔ بچہ اپنی فطرت کے تحت اس پر بھی مطمئن نہیں ہوتا اور پوچھتا ہے: خدا کا باپ کون ہے؟ حتیٰ کہ باپ بچہ کی فطرت سلیم کے مطابق قطعی جواب دیتا ہے اور کہتا ہے:

خدائے تعالیٰ تمام موجودات کا پیدا کرنیوالا ہے اور اس کا وجود از خود ہے۔

اب بچہ کی فطرت کو سکون مل جاتا ہے اور وہ اپنے سوالات کا سلسلہ ختم کر دیتا ہے اور اگر باپ سے آخری جواب (خدا کا وجود از خود ہوتا ہے) نہ دیتا تو ممکن نہ تھا کہ بچہ کی طبیعت مطمئن ہوتی اور بچہ صرف

اس جواب سے کہ ہر شخص اپنا ایک باپ رکھتا ہے اور یہ لامتناہی سلسلہ چلتا رہتا ہے اور کہیں ختم نہیں ہوتا' کبھی مطمئن نہ ہوتا۔ یہ ایک مثال تھی۔ آپ خود بھی اپنے وجدان کی مدد سے اور بچوں کی متجسانہ فطرت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسی متعدد اور گوناگوں مثالیں تیار کر سکتے ہیں اور اسکا تجربہ کر سکتے ہیں۔

یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ مثال کی روشنی اور سادگی کو اصل مطلب کی سادگی اور بے اہمیتی پر محمول نہ کرنا چاہئے کیونکہ یہی سادہ مثالیں ہم کو حقیقی فطری ادراک سے روشناس کراتی ہیں اور فطرت کی حقیقت معلوم کرنے کا صحیح راستہ ان مثالوں اور سادہ تجربات کا مطالعہ کرنا ہے جو بچوں کی اچھوتی اور سلیم فطرت سے حاصل ہوتے ہیں۔

دوسری دلیلیں

فلسفیوں کی باتوں میں خواہ وہ اسلام کے ہوں یا غیر اسلام کے اور اسی طرح متکلمین (عقائد و مذاہب کے عالم) کے کلام میں جہان ہستی کے مبداء بزرگ کو پہچاننے کے لئے اور خدائے تعالیٰ کے وجود کا پتہ لگانے کے سلسلے میں جو کثیر دلیلیں دیکھنے میں آئی ہیں ان پر غور و خوض کرنے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ ان میں اکثر دلیلیں نئی نہیں ہیں اور حقیقت میں ان ہی آخری دلیلوں (استدلال و جواب و امکان کی دوسری صورت ہے کہ جس کو گوناگوں اشکال اور عبارتوں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے جن میں سے ''حادث وقدیم'' اور ''حرکت و محرک'' والی دلیلوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اور ہم اسی دلیل کے تحت ان میں سے بہت سی باتوں کی توضیح اور تشریح کرنے سے صرف نظر کر کے دوسری بہت سی کتابوں کی طرف جس میں ان امور پر بحث کی گئی ہے' شائقین کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔ یہاں پر فرانس کے مشہور سائنسدان اور فلسفی ''ڈکارٹ'' کی دلیلوں میں سے ایک دلیل نقل کر کے گذشتہ دلیلوں سے اس پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

---

[۱] [البتہ عصبی مرکزوں کے جو فرامین اور احکامات جن دوسرے اعصاب کے ذریعہ سے بدن کے مختلف اعضاء کی طرف منتقل ہوتے ہیں انہیں اعصاب محرک کہا جاتا ہے لیکن وہ خاص اعصاب جو عوامل کی تصویریں مرکز کی جانب روانہ کرتے ہیں ان کو اعصاب حسی کہا جاتا ہے]

ڈکارٹ کا استدلال

ڈکارٹ (۱۵۹۶-۱۶۵۰) توحید کے بارے میں اپنے استدلالات میں سے ایک میں یوں بیان کرتا ہے [۱]: میں سوچتا ہوں کہ کیا میرا وجود مستقل ہے یا کسی اور ہستی کا طفیلی ہے؟ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اگر میری ہستی مستقل ہوتی یعنی میرا وجود میری وجہ سے ہی قائم ہوتا تو میرے تمام کمالات خود میرے عطا کردہ ہوتے اور مجھ میں شک اور خواہش نہ ہوتی اور میں خود ''خدا'' ہوتا لیکن میں اپنے آپ کو بیماری نہیں دے سکتا تو وجود کس طرح دے سکتا؟ اس کے علاوہ اگر مجھ میں طاقت ہوتی اور میں اپنے کو وجود بخش سکتا تو میں اپنے وجود کو دوام بھی بخش دیتا حالانکہ مجھ میں وہ قوت نہیں ہے اور میرے وجود کا باقی رہنا دوسرے پر منحصر ہے اور وہ دوسرا یقیناً خدا ہے یعنی اس کا وجود کامل اور قائم بالذات ہے اور چونکہ وہ قائم بالذات ہے اس لئے اس میں تمام کمالات بالفعل ہیں نہ کہ بالقوہ کیونکہ کمال بالقوہ ناقص ہوتا ہے [۱]

---

[۱] [البتہ جاننا چاہئے کہ دماغی اور حرام مغز کے اعصاب ایک دوسرے سے جدا ہیں اور دماغی اعصاب کے ۱۲ جوڑ ہیں جو سیدھے دماغ سے نکل کر بدن کے مختلف اعضاء جیسے آنکھ کان اور زبان وغیرہ سے متصل ہو جاتے ہیں اور ان کا رابطہ دماغ سے قائم کرتے ہیں لیکن حرام مغز جو دماغ کے نچلے حصہ میں ہوتے ہیں جن کا نام نخاع شوکی (کانٹے والا حرام مغز) ہے منبع بن کر ان سوراخوں میں سے جو مہروں (پیٹھ کی ہڈی کے منکوں) میں موجود ہیں۔ شاخوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ حرام مغز اعصاب کی تعداد ۳۱ جوڑ ہے]

توحید کی تیسری دلیل

معجزہ یا عالم بالا کا دریچہ

جیسا کہ سابق میں بیان کیا جا چکا ہے خدا شناسی اور بے پایان ماوراء الطبیعیات عالم کی جانب انسان کی رہبری کرنے والے راستے بہت ہیں۔ جو شخص دلیل اور برہان کے ذریعہ اس مقدس مقصد تک پہنچنا چاہتا ہے تو وہ اپنی حالت اور اپنی فکری طاقت کے مطابق ان گوناگوں راستوں سے استفادہ کر سکتا ہے اور خالق جہان ہستی کے وجود کا پتہ لگا سکتا ہے اس راستے میں سب سے زیادہ ضروری چیز توجہ، تفکر اور تجسس ہے اور اس کے بعد مکمل حقیقت کا ادراک لازمی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر روشن حقیقت اور واقعیت کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔

ہم نے گذشتہ مباحث کے ضمن میں راہ حق کے متلاشی لوگوں کے لئے بہت سے راستوں کی نشاندہی کی تھی جن کی آخری منزل خدا شناسی ہے۔ اب ہم حق متلاشیوں کے سامنے ایک دوسرا راستہ کھولتے ہیں جو خدا اور عالم ماوراء الطبیعیات کی جانب ان کی بہ آسانی رہبری کریگا اور وہ راستہ وہی پیغمبران خدا کی دعوت کا ہے۔ اس لئے کہ اس راستے کو طے کرتے وقت کوئی مشکل اور دشواری پیش نہ آئے سب سے پہلے حسب ذیل موضوعات کی طرف توجہ مبذول کرنی چاہئے۔

۱ [جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے انسان کے دماغ کا حجم اوسطاً ۱۵۰۰ مکعب سنٹی میٹر اور اس کا وزن بھی ۱۵۰۰ گرام ہوتا ہے البتہ عورتوں اور بعض لوگوں میں اس کا وزن کم اور بعض لوگوں میں اس کا وزن زیادہ دیکھنے میں آیا ہے]

۱۔ یہ ایک ؟؟؟ کی دلیل نہیں ہے

ممکن ہے ابتداء میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ کوئی ایسی دلیل ہے جس کا اصطلاحاً "دَور" ہونا ضروری ہے کیونکہ عقائد و مذاہب کی بحثوں کے سلسلے میں مسئلہ توحید کے بعد انبیاء کے وجود اور ان کے معجزات کا موضوع زیر بحث آتا ہے اس لئے توحید کو ثابت کرنے کے بعد اسی موضوع پر بحث کی جانی چاہئے۔

اسی بناء پر توحید کے مسئلے کو ثابت کرنے کے لئے پیغمبروں کی دعوت اور ان کے معجزات سے جو ابھی ثابت شدہ نہیں ہیں کس طرح استدلال کیا جا سکتا ہے؟ اس دَور کا یہی مطلب ہے کہ اس کا باطل ہونا فلسفۂ کلام اور تمام عقلی علوم کی رو سے مسلم ہو۔ لیکن اس دلیل کے طرز بیان پر کافی غور کرنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ نہ صرف یہ کہ "استدلال" مذکور دَور نہیں ہے بلکہ اس کا شمار خدا شناسی اور توحید کی نہایت سادہ اور نہایت مستحکم دلیلوں میں ہوتا ہے کیونکہ صرف انبیاء کی تعلیمات کی تحقیقات (خصوصاً پیغمبر اسلام ﷺ کی وسیع دعوت کے حساس نکتوں اور آپ کے دنیا سے متعلق قابل فہم دستورات کی تحقیقات کی زیادہ ضرورت ہے جو آپ کی زندگی کے جزئیات پر مشتمل ہے اور ہمارے قبضہ میں موجود ہے) اور اسی طرح ان مافوق الفطرت کاموں کی تحقیق و مطالعہ بھی ضروری ہے جو معجزہ کے طور پر سرزد ہوئے ہیں وہ ہمیں دوسرے غیر مادی جہان سے واقف کرانے کے لئے کافی ہیں جو اس جہان مادی کے طبیعی اسباب او قوانین پر حکومت کرتے ہیں۔ اس بات کی توضیح و تشریح کا ہمیں بہت جلد پتہ چل جائے گا۔

۲۔ معجزہ کیا ہے؟؟

انبیاء ؑ کے اعجاز اور معجزات کے سلسلے میں بحث آئندہ بحثوں کے سلسلے میں اپنے وقت پر ہوگی لیکن یہاں مختصراً جس بات کا جاننا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اعجاز کا مطلب کلی طور پر وہ کام اور واقعات ہیں جو عالم طبیعی کے معمولی واقعات اور عام اصولوں کے برخلاف کسی ایسے شخص کی طرف سے سرزد ہوئے ہوں جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہو اس طرح کہ مادی اسباب اور معمولی قوانین اور طبیعی معمولات ان کے اسباب بتانے اور اس کی تشریح کرنے سے عاجز ہو جائیں اور وہ (معجزہ) معمولی عوامل میں سے کسی

کے ساتھ مطابقت نہ رکھتا ہو۔[۱]

اس بناء پر "معجزہ" ہمیشہ عام طبیعی علت و معلول کے نظام سے باہر ہوتا ہے ہم جس کے عادی اور جس سے مانوس ہیں۔ اس کا مطلب بخوبی واضح کرنے کے لئے ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

ہم سب نے تجربہ سے یہ بات دریافت کرلی ہے آگ جلاتی ہے اور جب کوئی چیز اس کو بجھانے والی نہ ہو اور دوسری معمولی شرائط بھی موجود ہوں جیسے آگ قریب ایسی چیزیں ہوں جن میں جلنے کی خاصیت ہو تو وہ اس کو جلا دیتی ہے۔ یہ ایک معمولی بات ہے جو علت و معلول کے قانون کے عین مطابق ہے اور یہ بات ہر زمانے اور ہر مقام پر وقوع پذیر ہوتی ہے۔

اس لحاظ سے اگر ہم دیکھیں کہ آگ معمول کے مطابق تمام شرائط کی موجودگی اور کوئی معمولی رکاوٹ نہ ہونے کے باوجود اپنی جلانے کی تاثیر کھو دے اور وہ چیز جو اس سے لمس کر رہی ہے اس کا جسم جلنے کی خاصیت رکھتا ہو ان تمام باتوں کے باوجود آگ نے اسے نہ جلایا اور وہ انسان جسے ان آگ کے شعلوں میں ڈال دیا گیا تھا بغیر کسی گزند کے سلامت نکل آیا تو ہم سمجھنے پر مجبور ہیں کہ یہ واقعہ بالکل غیر معمولی اور خارق عادت ہے اور طبیعی علل و معلول کے قانون اور عام حالات کے برعکس صادر ہوا ہے کیونکہ فطرت کے مقررہ قانون اور اصول کا اقتضاء یہ تھا کہ ایسے وقت انسان پوری طرح جل کر خاکستر ہو جاتا۔ ایسے حادثات کو معجزہ کہتے ہیں۔[۱]

۱۔ [علوم طبیعی نے دماغ کے لئے کئی مراکز اور مختلف علاقے قائم کئے ہیں جن کے منجملہ حسب ذیل اہم علاقے قابل ذکر ہیں:

۱۔ مراکز حسی جن میں سننے، دیکھنے، چکھنے، سونگھنے اور چھونے کے علاقے شامل ہیں۔

۲۔ مراکز جنبشی جن میں سر، گردن، دھڑ، ہاتھ، پاؤں کی حرکتوں کے مراکز نمایاں ہیں۔

۳۔

۴۔ وہ مراکز جو کتابت، تکلم اور مطالب کی یادداشت کے متعلقوں میں شامل ہیں۔

۵۔ وہ رابطہ کا مرکز جو مختلف علاقوں کے متعدد احساسات کو آپس میں مربوط کرتا ہے]

دوسری مثال: عام حالات میں طبیعی قانون کے مطابق انسانی معاشرہ میں ارتقاء کا سلسلہ ہمیشہ تدریجی طور پر چلتا رہتا ہے اور انسانی معاشرے رفتہ رفتہ کمال حاصل کرتے ہیں یعنی ہر معاشرہ ابتداء میں چھوٹا اور ناقص ہوتا ہے اور کمال کے مراحل یکے بعد دیگرے طے کرتا رہتا ہے اور اس طرح وہ انتہائی کمال کی طرف پہنچ جاتا ہے۔[۲]

یہ مرحلے جو زنجیر کے حلقوں کی طرح ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں ہمیشہ ہر معاشرہ کی ترقی کے راستے میں موجود ہوتے ہیں اور ان مرحلوں کو طے کئے بغیر کوئی بھی معاشرہ معمولی طریقوں سے کمال حتیٰ کہ ذاتی کمال کی صورت بھی نہیں دیکھ سکتا خلاصہ یہ کہ انسانی معاشرہ کی تکمیل کی راہ میں ایسے درمیانی حلقے اور حالات ہوتے ہیں کہ معاشرہ کا مخصوص کمال' ارتقاء کے عام قانون اور اصول کے تحت ان سے گزرے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ معاشروں میں کمال حاصل کرنے کی رفتار میں کافی فرق ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اس بات کا امکان ہے کہ کوئی معاشرہ ان درمیانی مراحل کو تھوڑی مدت میں طے کر لے لیکن ہر حال میں طبیعی اسباب کے تحت یہ کمال بتدریج حاصل ہوتا ہے حتیٰ کہ جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ معاشرے کی تبدیلی انقلاب کی صورت میں ایک جست کے ذریعہ وجود میں آجائے وہ لوگ بھی ان گوناگوں مراحل کے طے کرنے کو لازمی سمجھتے ہیں اتنے فرق کے ساتھ کہ وہ ایک مرحلہ سے دوسرے آگے کے مرحلہ میں پہنچنے کے لئے ایک جست یا ناگہانی انقلاب کو ضروری خیال کرتے ہیں۔

اب اگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک پسماندہ معاشرہ' ایسا پست جیسے ایام جاہلیت میں (اسلام سے قبل) عربوں کا معاشرہ تھا کہ ان میں ہر قسم کی انفرادی اور اجتماعی برائی اور اخلاقی و معاشرتی انحطاط وغیرہ موجود تھا اور برائی اور وبائی بیماریوں جیسے جراثیم اس معاشرہ کے جسم میں پھیلے ہوئے اور موجود تھے اور جہل و نادانی کے سیاہ بادل اس معاشرہ کے سر پر منڈلا رہے تھے اور اخلاقی' معاشرتی اور تمدنی انحطاط کا بھاری

۱۔ [نیند اور خواب کا' دماغ اور بدن کے تمام مشتریوں کے افعال کے ساتھ ارتباط کا معاملہ تقریباً مسلمہ اور ناقابل تردید ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس ارتباط کی حد کہاں تک ہے؟ بعض لوگ خواب کے مسئلہ کو محض ایک

ڈراتا خواب ان کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا اب ایک ایسا معاشرہ جسے پہلے کبھی اپنی زندگی کی طویل تاریخ میں تمدن سے کسی قسم کا سابقہ نہ پڑا تھا وہ ایک ہی خارق عادت چھلانگ میں طبیعی پیمانوں کے برعکس اور درمیانی مراحل طے کئے بغیر بہت ہی قلیل مدت میں ایک کامل ترقی یافتہ معاشرہ کی صورت میں تبدیل ہو گیا اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور سب سے زیادہ متمدن قوموں کی صف میں شامل ہو گیا اور بعد ازاں زمانہ کے صالح ترین معاشروں میں ان کا شمار ہونے لگا اسی طور پر کہ مادی علتیں اور عوامل اور نظام اجتماعی کے عام اصول اس قسم کی حیران کن ترقی کی تفسیر و تعبیر کرنے سے عاجز رہ گئے ایسی جگہ ہم کہتے ہیں کہ "معجزہ" وقوع پذیر ہوا اور ایک مافوق الفطرت چیز وجود میں آئی یعنی یہ واقعہ عام اسباب و قوانین کی قلمرو سے باہر ہے۔

تیسری مثال: انسان اگرچہ صاحب ارادہ مخلوق ہے لیکن وہ پوری طرح اور اس کے طرز تفکر اور رنگ ڈھنگ کے پیچھے سے اپنے آپ کو علیحدہ نہیں رکھ سکتا بلکہ خواہ مخواہ زندگی کے ماحول کچھ عادات و آداب

مادی چیز سمجھتے ہیں اور بیداری اور دماغ کے بعض خلیات کے عمل کو اس کا سبب سمجھتے ہیں۔ اور بعض لوگ جیسے فرویڈ اور اس کے حامی اس کو (نیند کو) تمام پوشیدہ دلی خواہشوں، اندیشوں اور تمناؤں کا جانشین (بدل) سمجھتے ہیں اور اس کا سب سے بڑا عامل، (جذبہ جنسی) کو خیال کرتے ہیں۔

زیگمونڈ فرویڈ خود اپنی کتاب "رویا" (خواب) میں کہتا ہے: افکار اور شہوانی میلانات بچے میں پوشیدہ ہوتے ہیں اور بعد میں ختم ہو جاتے ہیں اور پھر بڑے ہونے پر خواب کے زبردست عوامل بن جاتے ہیں۔

اب یہ خیالات کس حد تک واقعۂ وجدان اور تجربہ کے خلاف ہیں، یہ بات ہماری بحث کے موضوع سے خارج ہے لیکن مختصراً یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ مسئلہ روح اور متافزیکی اصول کو پیش نظر رکھے بغیر نیند اور خواب کے مسئلہ کا حل کرنا اشکال سے خالی نہیں ہے۔ اور مجموعی طور پر اس مسئلہ کے مادی تعلق اور جسمانی پہلو کے مقابلے میں اس کا روحی اور معنوی پہلو کئی درجہ زیادہ ہے چنانچہ بہت سے خواب اصولاً آدمی کے لئے بے ربط ہوتے ہیں یا پیشن گوئی کے طور پر ہوتے ہیں کہ کئی دفعہ ایسے حادثات اور واقعات جو بعد میں پیش آتے ہیں ان کی اس (خواب) سے پوری مطابقت ہو جاتی ہے۔ ہم اس موضوع پر تفصیلی بحث اس کے مناسب مقام پر کریں گے]

اور تفکرات سے مغلوب ہو کر اس کا رنگ قبول کر لیتا ہے۔ بالفاظ دیگر زندگی کا ماحول انسان کی شخصیت کو بنانے والے تین عوامل میں سے ایک ہے [1] اور طبیعی معمولی واقعات و حالات کے مطابق انسان خواہ مخواہ ایک حد تک ماحول کا تابع ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ افراد اس فرق کی وجہ سے جو ان کی اثر انداز ہونیوالی قوت ارادی اور عقل و دانش میں ہوتی ہے ایک دوسرے کے ماحول میں فرق ہوتا ہے۔ عقلمند اور صاحب ارادہ لوگ دوسروں کے مقابلے میں اپنے ماحول کا رنگ بہت کم قبول کرتے ہیں لیکن صحبت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ماحول کے حالات کا رنگ اور اثر قبول کرنے میں سب ہی شریک ہوتے ہیں اور اس بات کے ماننے سے معمولی (مادی) پیمانوں کے مطابق انکار بھی نہیں کیا جا سکتا حتیٰ کہ بعض لوگ اس بارے میں اس قدر زیادتی کرتے ہیں کہ انسان کے افکار کو کلی طور پر اس کی مادی زندگی کے ماحول کے حالات کا انعکاس سمجھتے ہیں۔

اب ملاحظہ کیجئے کہ ایک "ان پڑھ" شخص جس میں ماحول سے متاثر ہونے اور اس کی اتباع کی عام

---

[1] [مسئلہ روح کے بارے میں گوناگوں نظریات کا اظہار کیا گیا ہے جن میں سے حسب ذیل تین نظریات اہم ہیں:

الف۔ ان لوگوں کا نظریہ جو یہ کہتے ہیں کہ روح اور عقل سے مراد دماغ کے خلیات کے مادی آثار ہیں جو دماغی خلیات کے طبیعی اور کیمیائی عملوں کے اثر سے پیدا ہوتے ہیں حتیٰ رابرٹ ہوک جسے اٹھارھویں صدی عیسوی کے مادہ پرستوں میں شمار کیا جاتا ہے ایک انسان کی پوری زندگی کے افکار کی تعداد کا اندازہ دو بلین کرتا ہے۔

ب۔ ان لوگوں کا نظریہ جو اس بات کے قائل ہیں کہ انسانی روح اور عقل مادی ہیں لیکن ان کا مادہ بہت ہی لطیف قسم کا ہے جسے ہمارے حواس ظاہری دیکھ نہیں سکتے۔ یہ نظریہ ان سائنسدانوں کے لئے قابل توجہ ہے جو ہپناٹزم (تنویم) اور اسپرٹزم (ارتباط با ارواح) کے تجربات کرتے ہیں۔

ج۔ بہت سے متافیزلیسٹ سائنسدانوں اور خدا پرستوں کا یہ نظریہ ہے کہ وہ روح کو مادہ اور خواص مادہ سے علیحدہ چیز سمجھتے ہیں اور اس کو بدن کا حاکم سمجھتے ہیں]

طور پر دوسروں کے مقابلے میں زیادہ صلاحیت ہوتی ہے ایک ایسے فاسد اور پسماندہ معاشرہ میں جس پر جہل و بت پرستی اور اخلاقی رذائل شب دیجور کی طرح ہر طرف سے چھائے ہوئے تھے وہ اپنی زندگی کے چالیس سال (اسی معاشرہ میں) بسر کرتا ہے اور اس کی پیدائش اور پرورش اسی ماحول اسی قوم اور ان ہی افراد کے درمیان ہوئی ہے اور جس دن اس نے دنیا میں آنکھ کھولی تھی اپنے معاشرہ میں سوائے شرک بت پرستی اور مختلف برائیوں کے اور کوئی چیز نہ دیکھی تھی باوجود ان تمام چیزوں کے طبیعی اصول اور مادی قاعدہ کے برخلاف نہ صرف یہ کہ اس نے ماحول کا معمولی سا اثر بھی قبول نہ کیا بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بنیادی طور پر اس ماحول کا نقشہ ہی بدل دیا اور اس معاشرہ کو اپنی شخصیت کی رنگ میں رنگ کر اپنے نئے عقائد اور افکار کے تابع کر دیا اور اس کے اصلاحی پروگرام اس قدر گہرے بنیادی اور عملی تھے کہ تھوڑی سی مدت میں بہت سے افراد نے جو ایسے ماحول میں پیدا ہوئے تھے اور اسی ماحول میں ایک عرصہ تک پرورش پائی تھی اس کے گرویدہ ہو گئے اس کے اقوال اور اس کے خیالات کو جو ان کی دیرینہ شخصیت کا خاتمہ کرنے والے تھے جان و دل سے قبول کر لیا تھا اور آخر کار اس نے تنہا ہی ایک معاشرہ کے راستے کو تبدیل کر کے اور ایک نئے معاشرہ کو اپنے افکار و پروگرام اور اپنی دعوت کے مطابق وجود میں لا کر ایک مقدس شہر کی بنیاد رکھی تھی۔ اس قسم کے واقعات کے وقوع سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ معمولی طبیعی قوانین و عوامل اور اسباب کا ان واقعات کے رونما ہونے میں بالکل دخل نہ تھا اور دوسرے عوامل کے ایک سلسلہ نے ان واقعات کو جنم دیا تھا یعنی ایک خارق عادت کام اور ایک معجزہ ظہور پذیر ہوا تھا۔

اب جبکہ ہم نے ان دو موضوعات کو جان لیا ہے تو ہمیں چاہئے کہ اصل مطلب یعنی توحید کی تیسری دلیل کو بیان کرنے میں مصروف ہو جائیں۔

معجزہ کس طرح ماورائے مادہ عالم کی طرف ہماری رہبری کرتا ہے؟

جس وقت ہم ایسے حادثات اور واقعات سے دوچار ہوتے ہیں جن کی تفسیر و تعبیر کرنے اور اس کے اسباب معلوم کرنے سے معمولی طبیعی قوانین و اصول اور علت و معلول عاجز ہو جاتے ہیں تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

یہ وہ سوال ہے جس کا جواب ہر شخص کو دینا چاہئے کیونکہ ہم نے کتاب کے آغاز میں پہلی بحث کے ضمن میں جو بات بیان کی تھی اس سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عقل و فطرت کی رو سے دینی حقائق کا مطالعہ کرنا اور اس کے بارے میں بحث کرنا ہر شخص پر فرض ہے اسی بناء پر لازم ہے کہ اس سوال کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کر کے اس کا جواب دیا جائے۔

ہم نے کہہ دیا ہے کہ معمولی واقعات اور طبیعی پیمانوں کے تحت یعنی اسی علت و معلول کے عام قانون کی رو سے اس کا جواب نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ان کا ظہور ان کی قلمرو سے باہر ہے اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ان حوادث کی پیدائش میں کوئی اسباب و عوامل کارفرما تھے کیونکہ مادہ پرست خود بھی اس بات کے مخالف ہیں اور علت و معلول کا ناقابل تردید عام قانون بھی (وسیع معنوں میں نہ کہ صرف مادہ کے چوکھٹے کے اندر) اسکی تکذیب کرتا ہے۔

ہم یہ بات کہنے پر مجبور ہیں کہ اس عالم محسوس کے نظام اصول و قوانین اور مادی علل و معلول کے کارخانے کے ماوراء ایک دوسرے کارخانہ موجود ہے جس کے ارادہ اور قدرت کی قلمرو عوامل طبیعی کے سلسلہ اور محدود علاقہ سے بہت زیادہ وسیع ہے اور اس قسم کے غیر معمولی واقعات اسی غیر معمولی سرچشمہ سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

یہ علم و قدرت کا سرچشمہ جسے خدا کہتے ہیں وہ اس جہان بشریت کے سونے والوں کو بیدار کرنے کے لئے کبھی کبھی معمولی مادی علل و اسباب کے پہیوں کی گردش کے برخلاف غیر معمولی اسباب کے سلسلہ کی غیبی مشنری کو حرکت دے کر اپنے پیغمبروں کے ہاتھوں خارق عادت کاموں کو ظہور پذیر کرتا ہے تا کہ خدا ناشناس اور بے خبر لوگوں کی خواب آلود آنکھیں کھل جائیں اور وہ مادہ پرستی کی گہری

---

۱ [مناسب تھا کہ یہاں بدن کی ذیلی مشنریوں کے ایک حصے جیسے آنکھ کان وغیرہ کا مختصر سا ذکر ہو جاتا اور ان کے توحیدی حیرت انگیز اسرار اور پیچیدہ انتظام اور عجائبات کی بھی تشریح ہو جاتی لیکن افسوس کہ ہماری کتاب کے حالات کا تقاضا یہی تھا کہ ہم اسی پر اکتفا کریں اور اس سے زیادہ لکھنے سے اجتناب کریں اور کیا عجب کہ توفیق الہی کسی اور فرصت میں اس پر تفصیلی بحث کرنے کے سلسلے میں ہماری مدد فرمائے]

نیند سے بیدار ہو جائیں اور خدا شناسی اور ایمان کی سعادت بخشنے والے اور روشن عالَم کو دیکھ سکیں اور آخر کار دنیا کو صحیح طور پر دیکھ کر زندگی کی حقیقت کا پتہ چلا سکیں۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اگر انسان کسی ایک واقعہ کو ہمیشہ ایک ہی طریقہ اور ایک ہی مقررہ حالت میں دیکھتا ہے تو خیال کرتا ہے کہ یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور ہو رہا ہے اور شاید ایسا ہونے کو وہ ایک طرح ضروری سمجھتا ہو۔ اس لئے اس (واقعہ) کے وجود سے اور اس کے ظہور پذیر کرنے والے عوامل سے غفلت برتتا ہے بالکل اس مسافر کی طرح جو کافی دیر تک کسی موٹر کار کی کرسی پر آرام سے بیٹھا ہو اور کار کے حسب معمول چلنے کو بھلا بیٹھا ہو جب ڈرائیور بریک لگاتا ہے اور کار کے پہیئے حرکت کرنے سے رک جاتے ہیں تو یہ غافل مسافر حقیقت حال کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ وہ اب تک ساکن نہ تھا بلکہ حرکت میں تھا اسی طرح غافل انسان جو فطرت سے دور ہو جاتا ہے اسی قسم کے غیر معمولی واقعات سے جو معمولی طبیعی اصولوں کے برخلاف وقوع پذیر ہوتے ہیں اپنی غفلت سے آگاہ ہوتا ہے اور خالق کائنات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

مندرجہ بالا بیانات سے جو اس دلیل کی تائید میں پیش کئے گئے دَور کے اشکال کا جواب بھی بخوبی واضح ہو گیا جیسا کہ ہمیں علم ہے کہ ہمارے استدلال کی بنیاد صرف خلافِ عادت حادثات اور واقعات کے مشاہدہ پر قائم تھی جنہیں معجزات کہا جاتا ہے اور یہ بات بھی تاریخ اور قطعی دستاویزات کی جانب رجوع کرنے سے حاصل ہوتی ہے جو (دستاویزات) انبیاءؑ کے بعض معجزات اور خصوصاً پیغمبر اسلام ﷺ کے معجزات کے بارے میں ہمارے قبضہ میں موجود ہیں حسب موقع ان کی تشریح کریں گے تب آپ کو معلوم ہو گا۔ اور اب اس بات (معجزہ) کو ظاہر کرنے کے لئے انبیاءؑ کی دعوت اور ان کی نبوت کے بارے میں کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ کہا جا سکے کہ اس بحث کا مدار نبوت کی بحث پر ہے حالانکہ وہ بحث توحید کی بحث کا ضمیمہ ہے لہٰذا ہم خدا کی صفات کے مخصوص مباحث میں اسی مختصر راستے کو اختیار کریں گے۔

اب توحید کی مختصر دلیلیں ختم ہو گئیں۔ اس حصہ میں ہم نے صرف تین دلیلوں پر اکتفاء کیا ہے جن میں سے اہم "برھان نظم" تھی جس کا ذکر تفصیلاً کیا گیا ہے۔

اب اس بحث کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ جو اعتراضات مادہ پرستوں کی جانب سے پیش کئے گئے ہیں یا جن کے پیش کئے جانے کا امکان ہے ان کی طرف توجہ کی جائے اور بنظر گہری نظر سے ان کا تجزیہ اور تحلیل کر کے اس کی تحقیق کریں تا کہ گذشتہ بحثوں اور دلیلوں میں کوئی بات مبہم نہ رہ جائے۔ مخفی نہ رہے کہ ہم مادہ پرستوں کے اشکالات کی بنیاد کو پوری صراحت کے ساتھ جو سائنسی اور آزاد بحثوں کا لازمہ ہے بیان کرینگے اور جب تک اصلی اشکال کو پوری طرح واضح اور روشن نہ کر دیں ہم اس کے حل اور اس کی جوابدہی میں مصروف نہ ہونگی امید ہے کہ یہ طریقہ جو ہمارے خیال میں ایسی بحثوں میں سب سے زیادہ صحیح طریقہ ہے ہمارے موافقین کے لئے باعث رنج اور ہمارے مخالفین کے لئے ناجائز مفاد اٹھانے کا ذریعہ بنے گا۔

حصہ سوم

مادہ پرستوں کے اہم ترین اعتراضات کا جواب

مادہ پرستوں کے اہم ترین اعتراضات

چونکہ یکطرفہ بحثیں اتنی اطمینان بخش نہیں ہوتیں اس لئے انسان کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ کسی حقیقت کی جستجو اور تحقیق میں زیر بحث معاملہ کے ہر دو فریق کی بحث سنے اور ان کا موازنہ کرے۔ لہٰذا خدائے تعالیٰ کی معرفت کے بارے میں اپنی بحثوں کے ساتھ ضروری ہے کہ مادہ پرستوں کے اہم ترین

۱] جس وقت مخالفین کی ایک جماعت خدا کے ناموں کے بارے میں کشمکش کر رہی تھی اور ہر ایک خالق کائنات کو ایک خاص نام سے پکار رہا تھا اور اس بات کو اپنے اور دوسروں کے عقائد کے درمیان اختلاف کا باعث سمجھ رہا تھا حالانکہ وہ سب ایک مقدس مقصد پر ایمان رکھتے تھے اور اس کی تعبیر مختلف الفاظ میں کرتے

اعتراضات کو بالکل غیر جانبداری کے ساتھ پیش کیا جائے اور ان کے تشفی بخش جوابات دیئے جائیں تاکہ قارئین کرام کے لئے کسی قسم کے شک کی گنجائش باقی نہ رہے۔

مادہ پرست لوگ خدا پرستوں پر جو بنیادی اعتراضات اور نکتہ چینی کرتے ہیں ان کی دو اہم قسمیں ہیں:

۱۔ وہ اعتراضات جن میں دلیل کا پہلو شامل ہوتا ہے اور وہ اصول وقواعد کے تابع ہوتے ہیں اور جن کا شمار فلسفیانہ اور سائنسی مباحث میں کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ وہ اعتراضات جو کسی سائنسی یا استدلالی بنیاد اور اصول پر نہیں ہوتے بلکہ ان میں اکثر اعتراضات بغرض تنقید یا بغرض حملہ کئے جاتے ہیں اور یہ بات قابل افسوس ہے کہ ان اعتراضات میں اکثر تحقیر وتمسخر کا پہلو شامل ہوتا ہے اور چونکہ ان کی بنیاد کسی دلیل یا منطق پر نہیں ہوتی اس لئے تلخ وتند عبارتوں کی مدد سے رائے عامہ کے سامنے (وہ اعتراضات) پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ بات کمیونسٹوں کے کلمات میں اکثر پائی جاتی ہے اور ان کے اعتراضات اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ یہ بات قابل افسوس اور قابل حیرت ہے کہ ایک دانشور اور مفکر کے دماغ میں ایسے غیر منطقی خیالات کس طرح آتے ہیں۔ خدا پرستوں کے بارے میں اس قسم کے غیر منصفانہ فیصلوں کا آخر منشا کیا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ مادہ پرستوں کے اس قسم کے اعتراضات اور اعتراضات جن کے چہرہ مہرہ سے ہی تعصب اور غیر منطقی لڑائی کے آثار کا پتہ چل جاتا ہے، کسی علمی اور فلسفی بحث کے قابل نہیں ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ ان کا بنیادی سبب کیا ہے اور ان کا سرچشمہ کونسا ہے۔ اس سوال کا جواب آئندہ تحریروں سے واضح ہو جائے گا۔

بعض عالم طبیعیات خدا پر کیوں ایمان نہیں رکھتے؟

تھے۔ قرآن انھیں یاد دلاتا ہے کہ ان کے اس اختلاف میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ خدا کو جس نام سے چاہو پکارو خدا کے نام اور صفات گوناگوں ہیں۔

[﴿اَیًّا مَّا تَدۡعُوۡا فَلَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی﴾]

پہلا اعتراض:

گذشتہ دلیلوں کے مطالعہ کے بعد سب سے پہلا جو اعتراض پیدا ہوتا ہے اور جس سے ممکن ہے بعض لوگوں کو رنج پہنچے (اور رنج پہنچا بھی ہے) وہ یہ ہے کہ:

اگر یہ سچ ہے کہ اس جہان ہستی کو کسی نظم ونسق نے اپنے قبضہ میں رکھا ہوا ہے اور یہ تمام موجودات خواہ وہ بالکل چھوٹے ہیں یا بہت بڑے کسی ایک پروگرام اور بنیادی نظم کے ماتحت زندگی بسر کر رہے ہیں اور وہ تمام جن کا مقام پُراسرار ہے اور وہ علم وقدرت کے واضح نمونے ہیں اور وہ تمام چیزیں واضح اور روشن طور پر ایک قدرت وعلم کا سرچشمہ اور پوری طرح کامل وجود کے تابع ہیں تو پھر علمائے طبیعیات جو خود ان تمام اسرار کے دریافت کرنے والے اور اس کا پتہ چلانے والے ہیں انہیں چاہئے تھا کہ ہر شخص سے پہلے اس کے نتیجے کو ماننے والے بنتے کیوں اس قدرت کے سرچشمہ پر ایمان نہیں لائے؟

آپ کہتے ہیں: جس قدر علم زیادہ ہوتا جاتا ہے اور پوشیدہ چیزوں سے جس قدر پردے اٹھتے جاتے ہیں اور دنیائے طبیعی کے جس قدر معمے اور مشکلات ہمارے لئے حل ہوتے جاتے ہیں اسی قدر ہمارے لئے خداشناسی کا راستہ زیادہ صاف اور زیادہ ہموار ہوتا جاتا ہے اور ہمیں ہزاروں دلیلوں اور براہین کے ذریعہ خدائے تعالیٰ کے وجود سے آشنا کرتا ہے۔ کیا یہ ضروری نہیں کہ جو لوگ خود اس جہان ہستی کا مطالعہ کرنیوالے اور ان مشکلات کو حل کرنیوالے ہیں اور خود ان مجہولات پر سے پردہ اٹھانے والے ہیں، سب سے پہلے خدائے تعالیٰ کی جانب جو زندگی کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے متوجہ ہوں اور خداشناسی کی طرف اپنا پہلا قدم بڑھائیں؟؟۔

یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم ان (علمائے طبیعیات) کی زحمتوں اور ان کے مطالعات کے نتیجے میں خدا کو پہچانیں اور وہ خود خدا کو نہ پہچانیں؟؟

یہ بات تو بالکل ایسی ہی ہے جیسے سمندر کے کنارے رہنے والے پانی کو نہ پہچانیں اور اس سے ناواقف رہیں لیکن وہ لوگ جو سمندر سے میلوں دور ہوں اور صرف ساحل پر رہنے والوں کے کہنے پر دریا کے بھیدوں سے واقف ہوئے ہوں وہ پانی کی حقیقت سے واقف ہو جائیں۔ کیا یہ بات باور کی جا سکتی

ہے؟

یہ اعتراض خصوصاً تعلیم یافتہ اور نوجوانوں میں جو توحیدی مطالعات سے آشنا ہیں زیادہ زیر بحث آتا ہے اور ممکن ہے کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جو اس سوال کا تسلی بخش جواب نہ پا کر مسئلہ توحید کے بارے میں متزلزل ہو جائیں۔

جواب

اس بات کی وضاحت کے لئے چند موضوعات کی طرف توجہ ضروری ہے:

۱۔ بعض نہ کہ تمام

شاید اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ بہت سے ماہرین طبیعیات کا شمار پہلے درجہ کے خدا پرستوں میں ہوتا ہے اور وہ نہایت واضح طور پر خدا اور خالق پر اپنے اعتقاد کا اعلان کرتے ہیں اور اکثر ان کا یقین خدائے تعالیٰ اور خالق کائنات پر دوسرے بہت سے لوگوں سے زیادہ ہوتا ہے اور وہ خدا کی کامل معرفت اور شناسائی رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کی باتیں اس امر کی شاہد ہیں۔ اگر چہ ان میں سے بعض نے لوگوں کے سامنے اس بارے میں اپنے عقیدہ کا واضح طور پر اعلان نہیں کیا پھر بھی ان کی گفتگو سے ان کے توحیدی عقائد کا پتہ چلتا ہے، ہم اس بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ: "ماہرین طبیعیات کی اکثریت خدا پرست ہے اور مادہ پرستی کے طرفداروں کی تعداد ان میں بہت کم ہے"۔

نمونہ کے طور پر ہم ان میں سے چند مشہور لوگوں کے بیانات کو ذیل میں درج کرتے ہیں:

۱۔ "ہرشل" جو ایک مشہور ہیئت دان ہے کہتا ہے:

"علم کا دائرہ جس قدر زیادہ وسیع ہوگا خدائے تعالیٰ کے ازلی و ابدی وجود کے سلسلے میں اتنے ہی قوی اور دندان شکن دلیلیں ہاتھ آتی جائیں گی۔ واقعتاً ماہرین ارضیات، ریاضی دان، ماہرین فلکیات اور ماہرین طبیعیات "کاخ علم" یعنی خدا کی عظمت کے محل کو مضبوط بنانے میں ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح شریک ہیں"

۲۔ "رابرٹ موریس پیج" جو ممالک متحدہ امریکہ کے جہاز رانی کے تجربہ خانہ کے شعبہ الکٹرانک کا

اسسٹنٹ ہے کہتا ہے:

"جب کوئی شخص خدا اور بندے کے درمیان جس قدر تعلق ہونا چاہئے اس کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کی تحقیق کرتا ہے تو یہ روابط مستحکم ہو جاتے ہیں اور وہ بالکل جان و دل سے اس کام کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور خدا کے ساتھ اس کا یہ ارتباط اس کی زندگی میں ایسی عظیم تاثیر پیدا کر دیتا ہے کہ اس کے ذہن میں کسی قسم کا کوئی شک باقی نہیں رہتا اسی وقت خدائے تعالیٰ ایک حقیقت بن کر اس کے سامنے آجاتا ہے اور یہ حقیقت آدمی کی روح سے اس قدر زیادہ قریب ہو جاتی ہے کہ وہ خدا پر ایمان کو مثبت علم و معرفت کی شکل میں لے آتی ہے"

۳۔ "مونٹ فل" اپنی مشہور کتاب دائرۃ المعارف میں بیان کرتا ہے:

"علوم طبیعی کی اہمیت فقط اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ ہماری عقل کو مطمئن کرتی ہے (اور مادہ ضروریات کی تکمیل کرتی ہے) بلکہ اس کی زیادہ اہمیت اس وجہ سے ہے کہ عقل ہم کو اس قدر بلندی پر لیجاتی ہے کہ ہم خدا کی عظمت کو دریافت کر لیتے ہیں اور ہمیں اس کی ذات کی بزرگی اور عجائبات کے احساسات سے زینت بخشتی ہے"

۴۔ "ڈونالڈ ہنری پورٹر" ماہر طبیعیات و ریاضی کہتا ہے:

"دنیا کی تخلیق جس طرح بھی عمل میں آئی ہو بہر حال وہ خالق کے ہاتھوں سے وجود میں آئی ہے اور خدائے تعالیٰ کا وجود ہی ہر مفروضہ کا بنیادی ستون ہے اور جن سوالات کا آج تک کوئی جواب نہیں دیا گیا وہ صرف ایک لفظ ہے اور وہ لفظ "خدا" ہے"

۵۔ "نیوٹن" جو قانون جاذبہ عمومی کا موجد ہے اس ضمن میں تفصیل سے بیان کرتا ہے:

"ہم کان کے مطالعہ سے یہ بات سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا بنانیوالا آواز سے متعلق تمام اصولوں کو مکمل طور پر جانتا تھا اور آنکھ کا بنانے والا نور اور بینائی سے متعلق پیچیدہ مسائل کو جانتا تھا اور نظم افلاک کے مطالعہ سے اس عظیم حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ اسے ایک مخصوص

نظم کے ماتحت چلایا جارہا ہے۔" ؎

۶۔ طبیعیات کا مشہور عالم "ارسطو" کہتا ہے:

"عالم ایک ابدی عقل کل کے وسیلہ سے منظم اور مرتب ہوتا اور چلتا ہے اور یہ عقل کل اس (عالم) کے نتائج اور آثار کو فطرت کے ناقابل تغیر قوانین کے ماتحت جلوہ گر کرتی ہے۔" ؎

۷۔ "لینہ" جو ایک مشہور ماہر طبیعیات ہے اور نباتات، کشفیات اور تحقیقات کے موضوعات کا مستند عالم ہے کہتا ہے:

"خدائے جاودانی [1] خدائے ازلی و بزرگ، خدائے تعالیٰ جو ظاہر و باطن سے باخبر ہے، قادر مطلق ہے، میری آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا لیکن میں اسے اپنے سامنے نہ دیکھ سکا لیکن اس کی عظمت وقدرت کا عکس میری روح کے صفحہ پر چمکا اور منعکس ہوگیا اور اس انعکاس کے نتیجے میں میں نے روح کو تعجب، حیرت اور استعجاب میں ڈال کر اس کے اثر کو ان تمام موجودات اور مخلوقات میں حتیٰ کہ ان میں سے سب سے چھوٹی مخلوق اور ان موجودات میں جو ہرگز آنکھ سے دکھائی نہیں دیتے مشاہدہ کیا اس میں کس قدر قدرت اور قوت سے کام لیا گیا ہے ان میں کیسی عقل اور کیسا ناقابل تعریف کمال دکھائی دیتا ہے"۔

۸۔ مشہور فلسفی "پاسکال" کہتا ہے:

"ہمارا خالق ایک غیر محدود سیارہ (کی طرح) ہے جس کا مرکز ہر جگہ ہے اور اس کے محیط کا کوئی مقام معین نہیں ہے (اس دانشور نے جو تعبیر کی ہے وہ ایک ادبی تعبیر ہے جو فرانسیسی زبان میں عام ہے) پھر یہی فلسفی کہتا ہے: خدا پر عقیدہ کے سوا کوئی اور چیز ہماری اندرونی سوزش اور روح کی تشنگی کو سکون نہیں بخش سکتی۔" ؎

۹۔ ماہر حیوانات وحشرات الارض اور سان فرانسسکو یونیورسٹی کے محکمہ حیاتیات کے ڈائریکٹر ایڈورڈ لوتھر کیل کا بیان ہے:

"آخری برسوں میں سائنسی مطالعات کے نتیجے میں خالق کے اثبات کے لئے چند نئی دلیلیں ہاتھ آئی ہیں اس سے سابقہ فلسفیوں کے دلائل کی تائید ہوتی ہے اور اسے تقویت پہنچتی ہے۔ البتہ سابقہ دلیلیں خدا پر ایمان لانے کے لئے کافی ہیں اور اس شخص کے لئے جو تعصب کو ایک کنارے پر چھوڑ دیا ہو اس کے لئے تو کافی سے بھی زیادہ ہیں لیکن میں ایک مومن شخص ہونے کی حیثیت سے قدیم دلیلوں پر ان جدید دلیلوں کے اضافہ سے دو لحاظ سے زیادہ خوش ہوں پہلے تو یہ کہ دلائل مذکور خدا کی صفات کے بارے میں روشن ترین مطالب بیان کرتی ہیں دوسرے یہ کہ بعض صاحب وجدان دانشوروں کی آنکھیں کھول دیتی ہیں جو بد باطن بھی ہیں اور انھیں مجبور کرتی ہے کہ خدا پر ایمان لائیں۔ آخر کار ہمارے ملک میں مذہب کے بارے میں غور کرنے کا طریقہ شروع ہوا اور مذہب نے اپنے لئے ایک زیادہ وسیع راستہ کھول دیا۔ اور یہ راستہ نہ صرف یہ کہ سائنس کے خلاف نہیں ہے بلکہ بالکل اس راستے کے متوازی ہے جس پر سائنس آگے بڑھتی ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ جدید سائنسی دلیلیں جو ایک خالق کے وجود کو ثابت کرتی ہیں وہ اس بارے میں کافی مؤثر ہوتی ہیں" [1]

۱۰۔ ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے:

"ہم ان تمام بھیدوں کی جس قدر زیادہ تحقیق کرتے ہیں ان کے رموز وابہام میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ ہم ایک واضح اور قطعی حقیقت کو جان لیتے ہیں اور وہ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اوپر ایک ازلی اور ابدی قوت موجود ہے جس سے تمام اشیاء وجود میں آتی ہیں" ؎

۱۱۔ "لامنہ" کہتا ہے:

[1] [ڈکارٹ جو فلسفہ میں کافی مہارت رکھتا ہے وہ توحید کے مسئلہ میں تین دلیلیں پیش کرتا ہے کہ مندرجہ بالا دلیل اس کی دوسری دلیل ہے اور ہم نے کتاب کے حجم کا خیال کرکے باقی دو کو نقل کرنے سے اجتناب کیا ہے]

"جو کلمہ خالق کے انکار کے بارے میں کہا جاتا ہے وہ کہنے والے کے لب کو جلا دیتا ہے"۔[1]

۱۲۔ "لوکاویر" کہتا ہے:

"خدا وہی یکتا سورج ہے جس کی دائمی شعاعیں موجودات کی مدد کرتی ہیں اور انہیں حیات بخشتی ہیں"۔[2]

۱۳۔ "قیلو" کہتا ہے:

"خدا ہر چیز کو جانتا ہے، ہر چیز پر قادر ہے اور پروردگار مطلق ہونے کے لحاظ سے ہر چیز کے لئے تدبیر کرتا اور اسے چلاتا ہے"۔

۱۴۔ انیسویں صدی کے دائرۃ المعارف نے جس طرح معاشیات کے دانشور "پروڈون" سے نقل کیا ہے وہ کہتا ہے:

"خدا" وہ حقیقت ہے جس کا احاطہ ادراک اور وصف کے ذریعہ سے نہیں کیا جاسکتا اس کے باوجود اس کا وجود ضروری اور ناقابل تردید ہے"۔

پھر یہی فلسفی کہتا ہے:

"جس قدر ہماری عقلیں خدا کے وجود کا پتہ چلاتی ہیں ہمارا دل اس کے وجود کی گواہی دیتا ہے"۔[3]

۱۵۔ فزیالوی (علم اعضاء) اور بایوکیمک کے ماہر "والٹر اوسکار لنڈ برگ" کہتا ہے:

"خدا پر ایمان لانا ہر فرد بشر کے دل کی روشنی اور مسرت کا باعث ہے لیکن جن دانشوروں کے پاس دلائل روحانی کے علاوہ طبیعی مظاہر کے مطالعہ کے نتیجے میں آفریدگار کا مطلب سمجھنے کے لئے سائنسی دلیلیں بھی موجود ہوتی ہیں انہیں زیادہ خوشی اور زیادہ مسرت حاصل ہوتی ہے"۔[1]

۱۔ [سیر حکمت در اروپا (یورپ کے فلسفہ پر ایک طائرانہ نظر) صفحہ ۱۱۱ جلد اول اشاعت سوم]

۱۶۔ "ڈارون" (جو جانداروں کے ارتقاء اور تبدیلی نوع کا نظریہ رکھتا ہے) کتاب اصل الانواع کے صفحہ ۱۶ پر بعض دانشوروں کے نام اپنے خطوط میں لکھتا ہے:

"عقل سلیم کے لئے یہ بات ناممکن ہے کہ اس عجیب نظام اور اس کی ہم آہنگی کو دیکھنے کے بعد کہے کہ دنیا کا کوئی خالق نہیں"۔

۱۷۔ ماہر فزیالوجی "مارلین بوکس کریڈر" کہتا ہے:

"البرٹ اینشٹین جس نے ایک پیدا کرنیوالی قدرت کے وجود کو تسلیم کیا تھا اس کی اس طرح تعریف کرتا ہے: عالم مجہول میں ایک عاقل اور قادر قوت وجود رکھتی ہے کہ دنیا اس کے وجود کی گواہ ہے جیسا کہ میں نے اپنے مقالہ میں بیان کیا ہے: اس قوت کا نام میں نے خدا رکھا ہے۔

میں اس دنیا میں مادہ کو اور ازلی قوت کو نہیں دیکھتا اور دنیا کی پیدائش کو حادثہ کا نتیجہ نہیں سمجھتا۔ میری نظر میں دنیا کی تخلیق میں کسی مجہول عامل حتیٰ کہ پوشیدہ (عامل) کا بھی وجود نہیں ہے۔

میں دنیا کی تخلیق میں قادر مطلق پروردگار کی مشیت کو دیکھ رہا ہوں اور بس۔ اور غالباً میرا عقیدہ غیر منطقی نہ ہوگا۔ کیا کوئی انسان جس کی عقل اور جس کی صلاحیت محدود ہو، کہہ سکتا ہے کہ فلاں موضوع، عقل اور حق کے مواقف ہے اور فلاں دوسرا موضوع مواقف نہیں ہے۔ ہر صورت میں، میں اپنے عقیدہ کو ظاہر کرتا رہا ہوں گا اور ہمیشہ اس عقیدہ پر قائم رہوں گا"۔[2]

۱۸۔ "جورڈن" کہتا ہے:

"خدا وہی ناموس ازلی ہے کہ جملہ کائنات اپنا وجود اور اپنی ترقی اسی سے حاصل کرتی ہے"۔

یہ ان دانشوران طبیعیات کے چند کلمات تھے جن کے پُر اثر آواز سے اور جن کی زندہ اور پر مغز

تعبیرات نے خدائے یکتا کے بارے میں ان کے واضح اور گہرے اعتقادات اور ان کی ثابت قدمی کو اس عقیدہ تک پہنچا دیا۔

دوم: ۔جاننا چاہئے کہ چند علوم طبیعی کے ماہرین کا مادہ پرستی کی جانب مائل ہونا کوئی عام اور طبیعی موضوع نہیں ہے اس کے کئی اسباب ہیں جن میں سے چند بیان کئے جاتے ہیں:

۱۔غلط اور ناقص تعارف

ان خدائے تعالٰی کا تعارف مبداء ہستی اور خالق کائنات کے نام سے کرایا گیا وہ ایسا خدا تھا جس سے نہ صرف علوم طبیعی کے ماہرین بلکہ ہر ایک عقلمند گھبراتا تھا اور وہ اسے اس موجودات کا خالق ماننے کے لئے ہی تیار نہ تھے تو یہ بات کیسے ہو سکتی تھی کہ وہ اس تمام کائنات کے سرتا پا گہرے نظم و نسق کو اس کے وجود کا عکس سمجھتے۔ایسا خدا جو کھاتا ہے' پیتا ہے' سوتا ہے' کشتی لڑتا ہے اور گھومتا پھرتا ہے۔خلاصہ یہ کہ ایک جسم سے متعلق تمام امور اس میں موجود ہوتے ہیں اور سر سے پاؤں تک تمام ضروریات اور مذموم صفات مثلاً جہل' غضب' حسد اور بخل وغیرہ اس میں پائے جاتے ہیں تو ایسا موجود قابل پرستش نہیں ہے اور ایک ماہر طبیعیات ہرگز یہ بات باور نہیں کر سکتا کہ ایسا ضعیف و ناتوان موجود ان تمام عظیم اور پرشکوہ آثار کا مبداء ہوگا۔

آپ پوچھیں گے کہ یہ غلط اور ناقص تعارف کس موقع پر کرایا گیا اور یہ بات کہاں سے نکلی؟؟

ہم جواباً کہیں گے: اسی ماحول سے جس ماحول میں دانشور اور اختراع کرنیوالے زندگی بسر کر رہے ہیں اور جو آخری دور کے علمی کارگزاریوں کا مرکز رہا ہے۔اس ماحول میں جس میں مذہبی اعتقادات کا تعارف صرف توراۃ و انجیل کی ان فرسودہ کتابوں سے کرایا جاتا ہے جن میں اس جیسے تمام خرافات بلکہ اس سے بھی بدتر باتیں موجود ہیں اور جو راستہ حقیقت کی طرف جاتا ہے اور جو باتیں خدا پرستوں کے

۱؎ [یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ معجزہ یہ نہیں ہے کہ اس کا ظہور علت و معلول کے بالکل ہی برعکس ہو اور عقلی قانون و حکم کے بالکل برخلاف واقع ہو۔یہ تو گمان نہیں ہوتا کہ کوئی شخص مندرجہ بالا بیانات سے ایسا نتیجہ نکالتا ہے کیونکہ فطرت الٰہی کے غیر متغیر اصولوں کے تحت اس بات کا وقوع ممکن نہیں ہے۔بلکہ مندرجہ بالا

پاکیزہ اور صحیح عقائد کی خبر دیتی ہیں، غالباً ان کے قبضہ میں نہیں ہیں۔ظاہر ہے کہ ایک دانشور کے لئے جو علمی قدرت اور فکری ذہانت رکھتا ہو اس کے لئے ایسے خدا پر اعتقاد رکھنا قابل برداشت نہیں ہے اور خواہ

بیان سے اور آئندہ صفحات میں جو کچھ بیان کیا جائے گا اس کا یہ مقصد ہے کہ یہ بات عام طبیعی حالات کے برخلاف وقوع پذیر ہوئی ہے اور غیر معمولی عوامل (جو مادہ سے ماوراء دنیا کا ایک سلسلہ ہیں اور ان کا سرچشمہ وہی (عالم ماوراء) ہے) سے نمودار ہوتی ہیں۔اس بناء پر معجزہ بھی عام قانون علت و معلول کے تابع ہوتا ہے لیکن پھر بھی وہ جہان مادی کے عام طبیعی قوانین کی عام عادت کے نفوذ کی قلمرو سے باہر ہوتا ہے۔لہٰذا علوم طبیعی (حسی و آزمائشی) کے نفاذ کا دائرہ بظاہر علل و معلول تک محدود ہوتا ہے جسے محسوس کیا جا سکتا اور آزمایا جا سکتا ہے اس لئے معجزات کے سلسلے میں منفی اور مثبت رویہ اختیار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ معجزات' علوم طبیعی کی بحثوں کے نفوذ کے دائرہ سے خارج ہیں۔

دوسری طرف خارق عادت غیر معمولی واقعات کا موضوع ہے (عام اس سے کہ وہ پیغمبروں کے معجزات ہوں یا دوسرے لوگوں کے خارق عادت کام) اس کا مطلب یہ ہے کہ آج اس کی تردید یا اس میں شبہ نہیں کیا جا سکتا اور ایسے خارق عادت اور حیرت انگیز کاموں کی جو ہند کے ریاضت کنندگان کی جانب سے وقوع میں آئے ہیں بہت سے لوگوں نے دیکھا ہے یا سنا ہے یہاں تک کہ مادہ پرست دانشور بھی جب ایسے دقیق حالات سے دوچار ہوتے ہیں اور ان امور کو اپنے پیمانوں کے مطابق جو ان کے قبضہ اختیار میں ہیں، نہیں پاتے تو مجبور ہو کر طبیعی قوانین و علوم کی بے بسی کو تسلیم کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں: ریاضت کرنیوالوں میں ریاضت اور نفسانی اعمال شاقہ کے اثر سے پوشیدہ لہریں پیدا ہو جاتی ہیں جن سے ایسے اسرار آمیز اور حیرت انگیز واقعات رونما ہوتے ہیں۔البتہ یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ معجزہ کا معاملہ ریاضت کرنے والوں کے غیر معمولی عملیات کے معاملے سے علیحدہ چیز ہے اور ان دونوں میں کافی فرق ہے۔اس بیان کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ خارق عادت موضوع کی ہرگز تردید یا اس میں شک نہیں کیا جا سکتا۔البتہ انبیاء٪ کے معجزات کا ذکر ہم نبوت کی بحث میں اس کے مقام پر کریں گے۔وہ لوگ جو اس بحث سے بہت زیادہ لگاؤ رکھتے ہیں معجزہ سے متعلق مباحث اور ان کے اعتراضات کے جواب کو ترجمہ تفسیر المیزان جلد اول میں اور اس رسالہ میں جو خاص اسی موضوع پر اس (کتاب ترجمہ تفسیر المیزان کے آخر میں شامل کیا گیا ہے' ملاحظہ کر سکتے ہیں]

تخواہ وہ اس سے اپنا دامن چھڑا ئیگا۔

اگر ہم خدا کے بارے میں ارباب کلیسا اور یہودیوں کے اعتقادات کے چند جملے بطور نمونہ یہاں پر نقل کردیں تو بیجا نہ ہوگا۔ تا کہ معلوم ہوجائے کہ ایک ماہر طبیعیات ایسے خدا پر اگر ایمان نہیں رکھتا تو قابل تعجب نہیں ہے:

۱۔ تورات کے سفر "پیدائش" کے تیسرے باب کی آٹھویں آیت میں اسی طرح درج ہے:

"باد نسیم کے چلتے وقت انہوں نے خدا کی آواز سنی جو باغ میں ٹہل رہا تھا تو آدم اور اس کی بیوی نے باغ کے درختوں کے درمیان اپنے کو چھپالیا اور خدا کے سامنے نہ آئے تو خدا نے آدم کو آواز دی اور کہا کہ تم کہاں ہو" ان آیتوں میں خداوند کا انسان کی طرح ایک ضعیف وجود کے طور پر تعارف کرایا گیا ہے جو صبح کے وقت باغ میں ٹہلتا ہے اور ان واقعات سے جو اس سے چند قدم کے فاصلہ پر وقوع پذیر ہوتے ہیں بے خبر رہتا ہے"۔

۲۔ تورات کے سفر پیدائش کے بتیسویں باب کی آیت نمبر ۲۴ میں کہتا ہے:

"اور یعقوب اکیلا رہ گیا اور ایک شخص صبح تک اس سے کشتی لڑتا رہا اور جب اس نے دیکھا کہ اس پر غلبہ حاصل نہیں کرسکتا تو یعقوب کی ران کو ہاتھ لگایا اور یعقوب کی ران کشتی میں اس سے دب گئی تھی۔ پس اس نے کہا مجھے چھوڑ دو کیونکہ پو پھٹ رہی ہے۔ اس نے کہا (یعقوب نے) جب تک تو مجھے برکت نہ دیگا میں تجھے نہ چھوڑوں گا۔ اس نے کہا: تمہارا نام کیا ہے؟ جواب دیا: "یعقوب" اس نے کہا کہ آج کے بعد سے تمہیں یعقوب کے نام

ل [ضمناً یہ بات قابل توجہ ہے کہ ماہرین علم کلام کی اصطلاح میں "معجزہ" ہر خارق عادت کام کے لئے نہیں کہا جاتا بلکہ یہ صرف ان لوگوں کے خارق عادت کام کے لئے کہاجاتا ہے جو خدا کی طرف سے ایک منصب کا ادعا کرتے ہیں اور مخالفین کو چیلنج بھی کرتے ہیں اور انہیں دعوت بھی دیتے ہیں]

ل [ماہرین علم عمرانیات کا خیال ہے کہ جس طرح ابتداء میں انسانی معاشرہ بالکل حقیر اور پست تھا اور رفتہ رفتہ اس نے وحشی اور خاندانی اور قبائلی زندگی سے نکل کر شہروں کی اجتماعی زندگی اختیار کی اور ترقی کرتے ہوئے

سے نہیں پکارا جائے گا بلکہ اسرائیل کے نام سے پکارا جائے گا کیونکہ تم نے خدا سے اور انسان سے مقابلہ کیا اور فتح پائی۔ یعقوب نے اس سے سوال کیا کہ تم مجھے اپنا نام بتاؤ اس نے کہا میرا نام کیوں پوچھتے ہو اور اس کو وہیں برکت عطا کردی اور یعقوب نے اس جگہ کا نام فنیئل رکھا اور کہا میں نے خدا کو اپنے سامنے دیکھا اور میری جان بچی۔

ان آیات کے مطابق خدا ایک زبردست مقابلے میں اول شب سے صبح تک یعقوب سے لڑتا ہے اور صبح کے وقت عاجزی اور التماس کے ساتھ اس کے پنجے سے نجات پاتا ہے اور یعقوب اس کشتی کا فاتح قرار پاتا ہے۔

۳۔ سفر خروج کے چوبیسویں باب کی نویں آیت میں کہتا ہے:

"اور موسیٰ۔ ہارون، "ناداب" اور بنی اسرائیل کے ستر مشائخ کے ساتھ پہاڑ پر گئے اور

موجودہ ترقی یافتہ حالت تک پہنچا ہے۔ اب بھی انسانی معاشرہ کا عظیم قافلہ اسی طرح آگے بڑھ رہا ہے اور آخر کار ایک حد ایسی آئیگی کہ انسان معاشرہ انتہائی بلند چوٹی تک پہنچ کر رک جائیگا۔ یہ بات درست ہے کہ اب انسانی معاشرہ نے حیرت انگیز طور پر ترقی و برتری حاصل کرلی ہے لیکن اب بھی بہت سی کمی ہے جس کو رفتہ رفتہ دور کرنا ضروری ہے اور اس ترتیب سے وہ انسانیت کے پر عظمت شہر تک پہنچ جائے گا۔

دراصل آج انسانی معاشرہ جوانی کے دور سے گزر رہا ہے اور اس کا بچپن اور نادانی کا زمانہ گزر چکا ہے لیکن اب بھی جوانی کی طاقتیں یعنی شہوت اور غضب اس پر شدت سے حکومت کررہے ہیں اور اس دور کے گزرنے کے بعد انسانی معاشرے کے انتہائی کمال کا دور شروع ہوگا جبکہ اس پر صرف حقیقی عقل و دانش حکومت کریگی یعنی دنیا کی موجودہ حالت اس رات کے مشابہ ہے جو چاند کی روشنی سے منور ہے اور اس روشنی کے بعد وہ وقت آئے گا کہ اس کے پیچھے آفتاب عالمتاب کی روشنی دنیا کو نور، حرارت، صفائی اور زندگی سے بھردیگی۔

اب سائنس کی تحقیقات و مطالعات اس مقام پر پہنچ جائیں گے جس کے بارے میں دین (اسلام) نے ہزار سال سے بھی پہلے پیشن گوئی کی تھی۔ یہ وہی عقیدہ ہے جس کے شیعہ اور دوسرے بہت سے مسلمان بلکہ آسمانی ادیان کے بہت سے پیروکار بھی قائل ہیں کہ دنیا میں ایک مصلح کا ظہور ہوگا اور وہ دنیا میں ایک عادلانہ حکومت قائم کریگا]

سب نے اسرائیل کے خدا کو دیکھا اور اس کے پاؤں کے نیچے کوئی شفاف چیز نیلے یا قوت سے بنی ہوئی تھی جو آسمان کی طرح صاف تھی اور اس نے بنی اسرائیل کے بزرگوں پر اپنا ہاتھ نہ رکھا، پس انہوں نے خدا کو دیکھا اور پیا!!"۔

ان آیات کے مطابق، بنی اسرائیل خدا کو پہاڑ کی چوٹی پر دیکھتے ہیں اور اس کو کھاتے اور پیتے ہیں۔

۴۔ سفر پیدائش کے چھٹے باب کی دوسری آیت میں کہتا ہے:

"خدا کے بیٹوں نے آدمیوں کی بیٹیوں کو دیکھا کہ خوبصورت ہیں ان میں سے جس کسی نے چاہا اپنے لئے عورت کا انتخاب کر لیا۔ اس آیت کے مطابق خدا کے بیٹے آدمیوں کی بیٹیوں پر دل سے عاشق ہو گئے اور ان سے شادی کا بندوبست کیا"۔

۵۔ اس سفر کے گیارہویں باب کی پانچویں آیت میں کہتا ہے:

"اور خدائے تعالیٰ نے نزول فرمایا تا کہ شہر کو اور اس برج کو دیکھے جسے بنی آدم بنا رہے تھے اور یہاں بھی خدائے تعالیٰ اپنے بندوں کا اور ان کی ہنرمندی کا تماشہ دیکھنے میں مصروف ہو جاتا ہے اور آسمان اور زمین کے اس قدر طویل فاصلے کو اسی غرض سے طے کرتا ہے"۔

یہ تھا ان کے کلمات کا اختصار جو در حقیقت ارباب کلیسا اور یہود کے فکری خرافات کا نمونہ ہیں۔ جن میں انہوں نے نادانی' ناتوانی اور مختلف قسم کی بشری صفات کو خدا سے نسبت دے رکھی ہے۔

بالکل واضح ہے کہ ایک ماہر طبیعیات کی فکری سطح' ایک معمولی پڑھے لکھے شخص کی فکری سطح سے بلند ہوتی ہے اور وہ اس قسم کے لغویات کا پابند نہیں ہو سکتا اور خدا کو اس وسیع جہان کا خالق اور اس کے حیرت انگیز اسرار کا پیدا کرنیوالا نہیں سمجھ سکتا اس لئے خدا پرستوں کے غیر صحیح خیالات اسے ناواقفیت کی بناء پر اس کا خاتمہ الحاد اور خدا کے انکار پر ہوتا ہے۔

دوم:۔ علوم مادی کے پیمانے سے ہر چیز کا تول

لے [انسان کی شخصیت کو بنانے والے تین عوامل سے مراد "وراثت"، "ماحول" اور "تربیت" ہیں]

دوسری بات جسے ہم ماہرین طبیعیات کے انحراف کے اسباب میں شمار کر سکتے ہیں وہ ان کی طرز فکر ہے کیونکہ معلوم ہے کہ انسان کی دماغی قوتیں' جس حصہ میں زیادہ مصروف بکار رہتی ہیں وہ اس حصہ کو زیادہ قوی اور زیادہ طاقتور بنا دیتی ہیں اسی دلیل کی بناء پر اس کے تمام فکری موضوعات اپنی شخصیت کھو دیتے ہیں اور مذکورہ مخصوص موضوع سے متعلق تمام ذیلی امور ایک لڑی کی شکل میں نمودار ہو جاتے ہیں اس لئے وہ (ماہر طبیعیات) چاہتا ہے کہ ہر چیز کو اسی عینک سے اور اسی دریچے سے دیکھے اور اسی کی رو سے فیصلہ کرے۔

شاید اسی وجہ سے تمام سابقہ منجمین دنیا کے تمام واقعات وحوادث کے وقوع کے ستاروں کی حرکتوں کے سبب سے خیال کرتے تھے۔ جس طرح آج کے سیاست دان ہر چیز کو سیاسی وجوہات کی بناء پر مستند قرار دیتے ہیں اور کمیونزم کے حامی تمام سائنسی۔ فنی اور فلسفیانہ اجتماعی حادثات وغیرہ کو معاشی بنیاد کی وجہ سمجھتے ہیں اور آخر کار ہر ایک اپنے مکتب فکر کے مطابق' جہان ہستی کے واقعات کی تفسیر کرنا چاہتا ہے اور اپنے افکار پر اسے منطبق کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ماہرین طبیعیات' جب اپنی تمام فکری طاقتوں اور ذہنی قوتوں کو علوم حسی کے کام میں لگا دیتے ہیں اور تمام چیزوں کو علوم طبیعی اور علوم حسی کے پیمانوں سے تول لیتے ہیں تو ان کی فکر غیر محسوس کاموں میں بالکل گم اور معدوم ہو کر رہ جاتی ہے یہاں تک کہ امور غیر محسوس اور غیر مادی کا تصور بھی (حالانکہ محال کا تصور کرنا محال نہیں ہے) ان کے لئے مشکل اور محال نظر آتا ہے۔ چنانچہ اپنی تحریرات میں وہ صاف طور پر کہتے ہیں:

"ایسی کسی چیز کا تصور کرنا جو زمان ومکان کی حدود سے خارج ہو ممکن نہیں"۔

یہ بھی مسلم ہے کہ خدائے تعالیٰ جو جہان مادی کا اور زمان ومکان کا خالق ہے وہ زمان ومکان اور مادہ سے بالاتر ہے اور علوم حسی کے پیمانے کے ذریعہ یا طبیعی آلات کے ذریعہ سے اس کا ادراک نہیں کیا جا سکتا اور اصولاً اس بات کا خیال بھی نہ کرنا چاہئے کہ ماوراء حس حقیقتوں کو محسوسات کے ترازو سے تولا جا سکتا ہے اور کسی ایسی چیز کو جو مادی اور طبیعی نہ ہو مادی علوم کی عینک سے نہیں دیکھا جا سکتا اور کلی طور

پر کسی سائنسی علم کا پیمانہ کسی دوسرے علم کے لئے کارآمد نہیں ہوسکتا۔ علم معاشیات، علم طبیعیات، علم طب اور علم صنعت وغیرہ ہر ایک کا ایک علیحدہ پیمانہ ہوتا ہے کہ دوسرے سے انہیں تولا جا سکتا۔

اسی بناء پر ایسے افکار سے جن کی فعالیت کا محور صرف طبیعیات اور محسوسات ہو ان چیزوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جو طبیعیات اور محسوسات سے ماوراء ہوں۔ اور وہ خواہ مخواہ ایسے خدا سے جس نے فطرت و مادہ کو پیدا کیا ہے ناواقف رہ جاتے ہیں اور ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ خدا کا مشاہدہ بھی وہ تجربہ خانوں میں کریں یا حسی آلات سے اس کی پیمائش کریں۔

بعض ماہرین طبیعیات ایسے ہیں کہ ان کے افکار پر حسی فلسفہ اس طرح سایہ فگن ہے اور جن کو پوری طرح اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے کہ انہوں نے تجربہ اور آزمائش کو جو صرف علوم مادی کو ناپنے کا پیمانہ ہے علوم مادی اور تجرباتی سے بڑھا کر اسے ہر انسانی علم کے تولنے کا پیمانہ سمجھ رکھا ہے البتہ حس و تجربہ سے ماوراء عالم کی تصدیق اس طرز فکر سے نہیں کی جا سکتی اور بات یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ ماہر طبیعیات ایک خاص غرور اور تکبر سے کہتا ہے:

"جب تک میں تجزیہ کے وقت اپنے جراحی کے نشتر کے سامنے خدا کو نہ دیکھ لوں اس کے وجود پر ایمان نہ لاؤں گا"۔

"جارج پولسٹر" اپنے فلسفہ کے بنیادی اصول والی کتاب میں لکھتا ہے:

"اس چیز کا تو رکرنا جو زمان و مکان کو نہ گھیرتی ہو اور ہر قسم کے تغیر سے محفوظ ہو ناممکن ہے"۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس قسم کی باتیں ان کے طرز فکر کی عکاسی کرتی ہیں اور اس بات کی پوری طرح نشاندہی کرتی ہیں کہ ان کی فکری قوتیں صرف محسوسات کے تجربہ اور آزمائش تک محدود رہی ہیں اور (ان کی فکری قوتیں) تمام امور میں اور ان چیزوں کے بارے میں جو تجربہ اور آزمائش سے بالاتر ہیں ناکارہ ہو جاتی ہیں اور جو چیزیں ان کے دائرہ فکر سے باہر ہیں جیسے خدا، روح، وہ ان کے لئے قابل قبول نہیں ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ ایک خدا شناس شخص کے لئے یہ بات کس قدر قابل تعجب ہے کہ وہ ایک مادہ پرست دانشور کو یہ کہتے ہوئے سنے کہ: "جب تک میں اپنے تجزیہ کے نشتر کے سامنے خدا کو نہ دیکھ لوں اس پر ایمان نہیں لاؤں گا" یا یہ کہ "مذہب سائنسی اصولوں سے ہم آہنگ نہیں ہے"۔ یہ بات اس قدر عجیب ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ: "جب تک میں سرطان کی بیماری کو اور ملیریا کے جراثیم کو الجبرا و مقابلہ کی مساوات کے ذریعہ دریافت نہ کرلوں ان کے وجود پر ایمان نہیں لاؤنگا"۔

سوم:۔ انتقامی بحثیں

دوسری چیز جس نے ماہرین طبیعیات کی ایک جماعت کو خدا پر ایمان لانے سے باز رکھا ہے اور جس شدت سے وہ مذہب کی تمام مقدس باتوں کو ٹھکراتے ہیں اس کا سبب وہی پادریوں اور پاپاؤں کا وحشیانہ اور بے رحمانہ رویہ ہے جو انہوں نے یورپ کی موجودہ سائنسی تحریک کے ابتدائی زمانہ میں علوم طبیعی کے ماہرین کے ساتھ روا رکھا تھا چنانچہ اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سائنسی افکار چونکہ مذہبی اصولوں سے ہم آہنگ نہیں ہیں اس لئے سائنسی نظریات کو مذہبی نظریات کے تحت بالکل کچل دینا چاہئے۔ درحقیقت یہ بات کس قدر جاہلانہ ہے کہ ایک سائنسی ماہر کو اس جرم میں کہ اس نے زمین کے بارے میں اپنے عقیدہ کا اعلان کیا جو کلیسا کے عقائد کے اصولوں سے (یعنی پاپاؤں اور پادریوں کے خود ساختہ مذہب سے نہ کی مسیحی مذہب سے) ہم آہنگ نہیں ہے جیل میں ڈال دیا جاتا ہے اور اسے مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ توبہ کرے یا اسے اپنے سائنسی نظریات کے پھیلانے کے جرم میں زندہ جلا دیا جائے گا۔

اسی رویہ کی وجہ سے ماہرین طبیعیات کے دل میں کینہ اور ناقابل صلح دشمنی پیدا ہوئی اور وہ خدا سے، مذہب سے اور اس کے حامیوں سے بیزار ہو گئے اور اپنے سائنسی مقاصد کی پیشرفت کے لئے مذہبی افکار سے برسرپیکار ہو گئے اور مذہب کی بندشوں سے جو ان کے کام میں حائل تھیں اپنے آپ کو علیحدہ کر لیا کیونکہ جب تک وہ مذہبی معتقدات کے پابند رہتے اسی قسم کے موانعات اور مشکلات سے دوچار رہتے۔

اس گروہ کے لوگ ہمیشہ اس بات کی تاک میں رہتے کہ مناسب موقع پر مذہبی تقدس اور مذہبی

عقیدوں پر کاری ضرب لگائیں شاید گلیلیو اور اس جیسے لوگوں کا انتقام ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتا تھا جنہیں سائنسی تحقیقات کے جرم میں قید کیا گیا اور تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ اور گویا اب وہ خدا سے اور مقدسات مذہبی سے انتقام لے رہے تھے۔

ظاہر ہے کہ بوقت انتقام سائنسی اور عقلی باتیں برطرف ہو جاتی ہیں اور بہت سی خصوصی اور جذباتی چیزوں کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ اس بناء پر کہہ سکتے ہیں کہ مادہ پرستوں کی بحثوں کا ایک اہم حصہ انتقامی پہلو لئے ہوئے تھا اور وہ سائنسی علوم کی پیشرفت اور ارباب کلیسا سے انتقام لینے کا ایک حربہ تھا۔

چہارم:۔ بیجا تکبر

دوسرا عامل جو مادہ پرستوں کے طرز تفکر میں خدائے تعالیٰ اور عالم بالا (جہانِ ماوراء طبیعت) کے بارے میں اہم حصہ رکھتا تھا وہ یہ تھا کہ مادہ پرستوں کی ایک جماعت جن کا زیادہ تر تعلق اٹھارویں اور انیسویں صدی سے ہے خیال کرتے تھے کہ ان کو ہر چیز کا علم ہے اور دنیا کی کوئی چیز ان سے پوشیدہ نہیں رہی۔ وہ دنیا کی تمام الجھنوں پر قابو پا چکے ہیں اور طبیعی اسباب اور ان کے مظاہر کا انکشاف کر کے انہیں دریافت کر چکے ہیں۔ چونکہ ہر ایک حادثہ کا ایک مادی سبب ہوتا ہے اس لئے اس جہانِ ہستی کو حل کرنے کے لئے خدا پر ایمان رکھنا ضروری نہیں ہے۔

البتہ اس طرز تفکر اور اس علمی غرور کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام چیزوں سے بے پروا ہو گئے اور جو کچھ قدما کی یادگاریں باقی تھیں ان پر ٹھوکر ماردی۔ غرور کا احساس جو غالباً ہر کامیابی اور فتح کے بعد پیدا ہوتا ہے، ان کے ایک گروہ میں اس قدر زیادہ پیدا ہو گیا تھا کہ انہوں نے خیال کر لیا تھا کہ ان حقیر علمی کامیابیوں سے (جن کا شمار جہانِ آفرینش کے رموز و اسرار کے مقابلہ میں ایسا ہی تھا جیسا سمندر کے سامنے ایک قطرہ) انہوں نے ہستی کے تمام بھیدوں کو پا لیا ہے اور ان کے بیان کے مطابق "آفرینش اور خلقت کا معمہ ان کے لئے پوری طرح حل ہو چکا ہے لیکن کچھ دن نہ گزرے کہ غالباً انہیں اس غلطی کا احساس ہو گیا اور ان باتوں سے جو آئندہ بیان کی جائیں گی صاف طور پر اعتراف کر لیا کہ خلقت کے بہت سی بھید اب بھی جہل کے پردہ میں چھپے ہوئے ہیں اور اس وسیع دنیا کے کثیر حیرت انگیز اسرار میں

سے ابھی چند سے زیادہ ہم پر منکشف نہیں ہوئے ہیں۔

پنجم:۔ شرمیلے دانشور

دوسرا موضوع جو اس جگہ قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ بہت سے مادہ پرست بالواسطہ خالق کائنات پر ایمان رکھتے ہیں اور صرف تعبیر اور نام کے لحاظ سے خدا پرستوں کے ہم خیال نہیں ہیں۔ چونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے مطالعات کے سلسلے میں جب ایک نیا موجود یا فطری آثار میں سے کوئی نیا اثر دیکھتے ہیں تو پوری مستقل مزاجی کے ساتھ اس سے فائدہ اور نتیجہ حاصل کرنے کے لئے تلاش و تجسس میں مصروف ہو جاتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ برسوں اس میں مصروف رہتے ہیں تاکہ اپنی گمشدہ چیز حاصل کریں اور وہ عملاً ہر فائدہ بخش اور نتیجہ بخش چیز کی جستجو کرتے ہیں اور جب تک اپنی مراد نہیں پالیتے آرام نہیں لیتے۔

ان کی اس تجسس اور دوڑ دھوپ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ موجودات کے لئے ایک مقصد اور منزل کے قائل ہیں۔ اگرچہ کہ وہ اسکا زبانی اعتراف نہیں کرتے لیکن عملاً وہ ثابت کرتے ہیں کہ موجودات اور دنیا کی تخلیق کسی پلان کے تحت ہوئی ہے اور ہر موجود کے لئے ایک ہدف مقرر ہے کہ سائنس کی ترقی کے بعد ان پر سے پردہ اٹھیگا۔

کبھی کہتے ہیں کہ "فطرت نے فلاں موجود کو فلاں مقصد کے لئے بنایا ہے۔ فطرت نے اس بیماری سے بچاؤ کے لئے فلاں کام کیا ہے۔ فطرت نے یہ عضو فلاں مقصد کے لئے اس جانور کو دیا ہے"۔ خلاصہ یہ کہ وہ فطرت کے لئے مقصد، ہدف، نقشہ اور عقل کامل وغیرہ کے قائل ہیں۔ ایسے اور اس قسم کے جملے ان کی باتوں میں کثرت سے ملتے ہیں۔ خدا پرستوں کی باتوں سے ان کا اختلاف، صرف خدا اور فطرت کے ناموں کی حد تک ہے کیونکہ اندھے بہرے طبیعی اسباب جن میں ارادہ اور عقل نہیں ہے ان میں ہرگز یہ اوصاف نہیں ہو سکتے۔

یہ وہی موضوع ہے جو ہر شخص کی فطرت اور سرشت میں موجود ہوتا ہے کہ جہانِ ہستی کے وسیع کارخانہ میں ہر موجود کسی خاص پلان کے تحت پیدا کیا گیا ہے اور اپنے مقررہ راستے پر ہی وہ گامزن رہتا

ہے اور یہ دقیق، وسیع اور عام نقشہ، ایک عظیم فوق العادت علم و قدرت والے خالق کا پتہ دیتا ہے ۔ ۱

ششم: ۔ قاضی کے پاس تنہا جانے والے

اس مخالفت کی دوسری وجہ مادہ پرستوں کی مذاہب کے طریقوں اور صحیح مذہبی عقائد سے خصوصاً مذہب اسلام سے کامل ناواقفیت ہے ۔

چونکہ اکثر مادہ پرست مغرب سے اٹھے ہیں یا مذاہب کے بارے میں ان کی اطلاعات اہل مغرب سے حاصل کی ہوئی ہیں جو عام طور پر مذاہب کی روش سے اور خصوصاً مذہب اسلام سے ناواقف ہیں اور صرف ان کے چند مستشرقین کو جنہوں نے اپنے کو مشرقی مذاہب کی تحقیق پر آمادہ کیا تھا، مذاہب کے اصول سے تھوڑی سی واقفیت حاصل ہوئی ۔ لیکن نہایت قابل افسوس ہے کہ بعض مستشرقین نے بھی خاص وجوہات اور مقاصد کی بناء پر بعض واقعات و معاملات کے کچھ حصوں کو اس کے اصلی روپ سے ہٹا کر دوسرے رنگ میں پیش کیا ۔ اور سب سے زیادہ قابل افسوس جو بات ہے وہ یہ ہے کہ مشرق کے تعلیم یافتہ اور روشن فکر لوگوں نے مذاہب کے خلاف یا مغرب کے مادہ پرستوں کے عقائد کی حمایت میں جو فیصلے دیئے ہیں اس میں مستشرقین کے اقوال کو بطور سند پیش کیا ہے اور یہی باتیں بعض کمزور اور بے محل اعتراضات کی بنیاد تھیں اور یہ بات مذاہب و ادیان کی حقیقت سے آگاہ اور روا قف لوگوں کے لئے باعث تعجب و حیرت ہے ۔ مثلاً "منتسکیو" جو فرانس کے بانی ادیبوں میں سے ایک مشہور ادیب کے خیال کے مطابق اٹھارویں صدی میں گزرا ہے، اس نے کتابوں کے مجموعہ "روح القوانین" کی سولھویں کتاب کی دوسری فصل میں "پریڈو" کا قول نقل کیا ہے کہ "محمد ﷺ نے پانچ سال کی عمر میں خدیجہ = سے نکاح کیا اور آٹھ سال کی عمر میں ان سے ہم بستری کی" ۔

منتسکیو اپنی اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ گرم ممالک میں غریزۂ جنسی شدید ہوتا ہے اور اسی لئے بچے جلد بالغ ہو جاتے ہیں ۔ پریڈو کے اس قول کو بطور سند پیش کیا ہے ۔

ہمیں نہیں معلوم کہ پانچ اور آٹھ سال ان کی مراد پیغمبر اسلام ﷺ کی عمر ہے یا خدیجہ = کی ۔ جس کسی کی بھی ہو یہ ایسی بات ہے کہ اس پر مشرق کے بچے بھی ہنستے ہیں ۔

کتاب "روح القوانین" کے مترجم نے "پریڈو" کے اس بیان کو اس کی کامل بے خبری کا نتیجہ قرار دیا ہے وہ کہتا ہے "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چاہتا تھا کہ ایک غیر معمولی اور سنسنی خیز واقعہ نقل کرے ۔ اس نے آب و ہوا کی تاثیر کے بارے میں بھی مبالغہ سے کام لیا ہے ورنہ ہر شخص جو پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی کی تاریخ سے تھوڑی سی بھی واقفیت رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ بات ہرگز اس طرح نہیں ہے ۔

اسی سے ہمیں ان صاحبان کی مذاہب اور خصوصاً مذہب اسلام سے بے خبری کا پتہ چلتا ہے ۔ جب ان لوگوں کی معلومات پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی کے واضح ترین واقعات کے متعلق اس حد تک غلط اور ناقص ہوں تو وہ ان کے دینی معارف اور اصول عقائد مذہبی کے بارے میں کس طرح کوئی فیصلہ دے سکتے ہیں؟!

ہالینڈ کے "وان لون" جیسے مشہور ادیب نے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی تالیفات و تصنیفات کا ۲۹ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے ۔ کتاب "داستانِ بشر" (جس کے بارے میں بعض واقف کاروں نے تصدیق کی ہے کہ وہ اس سال (سال اشاعت) کی سب سے زیادہ فروخت ہونیوالی کتاب تھی) کے اس باب میں جو پیغمبر اسلام ﷺ اور آغاز اسلام سے متعلق ہے، تحریر کرتا ہے کہ ابوبکر ÷ کے بعد عمر بن خطاب ÷ ان کے جانشین ہوئے اور پھر ان کی فتوحات کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے:

"شہر دمشق کو سلطنت اسلامی کا پہلا پائے تخت (دارالخلافہ) قرار دیا" ۔

اسکے بعد مزید کہتا ہے:

"عمرؓ کے بعد خلافت علی بن ابیطالب ۔ کو ملی" ۔

جیسا کہ ہم تمام جانتے ہیں کہ بلکہ مسلمان کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ نہ تو علی بن ابیطالب ۔ نے عمرؓ کے بعد زمامِ خلافت اپنے ہاتھ میں لی اور نہ عمرؓ نے دمشق کو اسلامی سلطنت کا پہلا دارالخلافہ بنایا ۔

یہ ان کے مشرق سے متعلق واقعات سے اور خصوصاً ادیان و مذاہب سے ناواقفیت کے نمونہ ہیں ۔

مزید برآں یہ عجیب غلطیاں، مستشرقوں، تاریخ نویسوں اور ان جیسے لوگوں کی ہیں اب اسی سے ماہرین معلوم طبیعیات کی معلومات کے بارے میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے جن کا عام طور پر اس قسم کے مسائل

سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔

ضمناً یہ بات بھی کہنا ضروری ہے کہ ہم مذاہب وادیان کے بارے میں ان کی تمام اطلاعات سے انکار کرنا بھی نہیں چاہتے لیکن اس قدر ضرور جاننا چاہئے کہ ان کی اطلاعات اس قدر قابل اہمیت نہیں ہوتیں کہ ان کے قول کو شدید اعتراضات کے ایک سلسلہ کی بنیاد بنایا جائے۔

ہمارے بعض روشن فکر لوگوں کو ان کی اطلاعات کی کمی کا اعتراف کرنے سے جو چیز روکتی ہے شاید وہ ان کا علمی مقام اور ان کی طبیعی علوم میں ترقی ہے لیکن یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ کسی فرد کا کسی ایک فن میں ماہر ہو جانا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ دوسرے معاملات میں بھی اُسکے نظریات درست ہونگے، ہو سکتا ہے کہ ایک شخص بہترین میکانک ہو لیکن وہ کیمیائی ترکیبوں سے اور ''اسپرین'' کی قرص کی تاثیر سے ناواقف ہو اور اسکے برعکس ایک عالی مرتبہ ڈاکٹر ایک سادہ بولٹ اور نٹ کو لگانے سے عاجز ہو۔ مادہ پرستوں کے پہلے اعتراض کے بارے میں یہ ہمارے جوابات کا خلاصہ ہے۔

ا۔[دائرۃ المعارف فرید وجدی جلد اول، ص۵۰۳] ۲۔[اثبات وجود خدا، ص۴۳]

دوسرا اعتراض

خدا کو دیکھے بغیر کس طرح اس پر ایمان لائیں؟

سب سے عام اعتراض جو مادہ پرست خدا پرستوں پر کرتے ہیں وہ یہ ہے:

''انسان ایک ایسی ہستی کو جسے اپنے حواس سے محسوس نہ کیا ہو کس طرح تسلیم کر سکتا ہے اور اس پر ایمان لا سکتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ نہ تو خدا جسم رکھتا ہے نہ کوئی مکان۔ وہ نہ زمان کا پابند ہے نہ رنگ وغیرہ کا۔ ایسے موجود کا کس ذریعہ سے ادراک کیا جا سکتا ہے؟ ہم تو صرف اس چیز پر ایمان لاتے ہیں جس کا ادراک کرنے میں ہمارے حواس عاجز نہ ہوں درا صل ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے''۔

یہ اعتراض ایک زمانہ سے موضوع گفتگو بنا ہوا ہے اور زیر بحث رہتا ہے لیکن آج مادہ پرستوں نے اسے سائنسی زبان میں ڈھال لیا ہے اور اب اس طرح کہتے ہیں:

''ہم صرف اس چیز کا اعتراف کرتے ہیں جسے سائنس ہمارے لئے ثابت قرار دے۔

ا۔[دائرۃ المعارف، فرید وجدی] ۲۔[اثبات وجود خدا، ص۴۳] ۳۔[دائرۃ المعارف فرید وجدی]
۴۔[خدا از روئے طبیعیات تالیف کامیل فلاماریون، ص۸۹ (نیو ایڈیشن)]

ماورائے طبیعت چیزوں جیسے خدا، روح اور فرشتہ وغیرہ کو سائنس ثابت قرار نہیں دیتی اور ہم کسی ایسی چیز کو قبول نہ کرینگے جسے سائنس ثابت نہ قرار دے"۔[۱]

یقیناً آپ جانتے ہونگے کہ موجودہ زمانہ میں تکنیکی طور پر سائنس کو فلسفہ کے مقابل رکھا جاتا ہے اور سائنس سے مراد معلومات کا وہ حصہ ہے جو موجودات طبیعی کی ساخت اور ان کے آثار سے بحث کرے اور معمولاً یہ ایک خاص موضوع ہے یعنی ہر ایک طبیعی علم کا ایک خاص موضوع ہوتا ہے جو کسی خاص موجود یا موجودات سے متعلق ہوتا ہے لیکن فلسفہ سے مراد وہ علم ہے جو ان تمام کلی قوانین کے بارے میں بحث کرتا ہے جو جہانِ ہستی کے تمام موجودات یا ان کے معتد بہ حصہ پر حکومت کرتے ہیں اور (فلسفہ) عام طور پر ان کے علت ومعلول کے روابط پر روشنی ڈالتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ فلسفہ، سائنسی علوم سے دو باتوں میں ممتاز ہے: ایک "موضوع کا کلی ہونا" اور دوسرا "علت ومعلول کے ہر پہلو پر توجہ کرنا" ہے۔ مثلاً: انسان کی ساخت اور بدن کی مشنری کی کارکردگی ایک سائنسی بحث ہے لیکن جانداروں کے انواع کے اسباب پر بحث کرنا ایک فلسفی بحث سمجھی جاتی ہے۔

بہر حال مادہ پرست کہتے ہیں:

"ہم علوم سائنسی کے رو سے خدا اور ماورائے طبیعت موجودات کے وجود کو ثابت نہیں قرار دے سکتے اور باوجود اس کے کہ سائنس نے اتنی ترقی کرلی ہے اور ہم پر بہت سی حقیقتیں واضح ہو چکی ہیں لیکن وہ ماوراء مادہ موجودت کو اب تک ہمارے لئے ثابت نہیں کرسکی، اس لئے از روئے سائنس ایسی چیزوں کے وجود کا قبول کرنا ناممکن ہے یا زیادہ صحیح الفاظ میں (اس کا قبول کرنا) غیر سائنسی ہے"۔[۲]

﴿جواب﴾

اس اعتراض پر کئی طرح سے بحث کی جاسکتی ہے:

۱ [خدا اور طبیعت، ص ۲۰۶ ۔ اس دانشور کی باتیں بہت تفصیلی ہیں اور اختصار کے خیال سے صرف اتنے پر ہی اکتفا کیا گیا] ۲ [دائرۃ المعارف، ص ۴۸۲]

۱۔ گذشتہ غلطیوں کی تکرار:

ہم اس سے قبل خدا شناسی کے موضوع پر مادہ پرستوں کی تردید میں بہت عمدہ وجوہات پیش کرچکے ہیں جواب بھی اس اعتراض میں نظر آرہی ہے۔

ہم ان کے سائنسی غرور کے مجملہ اور جو چیزیں دیکھتے ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ ہر چیز پر علوم طبیعی کی حکومت قائم کرتے ہیں اور تمام حقایق کو اور اسی طرح تمام چیزوں کو مادی علوم کے ترازو میں تولتے ہیں (مشاہدہ اور تجربہ کرتے ہیں) اور صرف مادی اور طبیعی اسباب پر ادراک کا انحصار کرتے ہیں۔ اب ہم ان حضرات سے ازسرنو سوال کرتے ہیں کہ کیا علوم طبیعی کی فعالیت اور نفوذ کی اور اس کی قلمرو کی کوئی حد ہے یا نہیں؟

ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب مثبت ہوگا کیونکہ علوم طبیعی کی قلمرو بھی طبیعی اور مادی موجودات کی حد تک ہی محدود ہے اور بس۔ اس بناء پر کیسے ممکن ہے کہ ایسی چیز کا ادراک طبیعی آلات سے کیا جائے جو غیر محدود ہے۔

بنیادی طور پر خدا اور ماورائے طبیعت موجودات، علوم طبیعی کی قلمرو (حدود) سے باہر ہیں اور جو چیز فطرت سے باہر ہو اس کے متعلق یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ طبیعی اسباب سے اس کا ادراک کیا جاسکے گا۔ ماورائے طبیعت کا نام اسم با مسمّیٰ ہے اور اسے نہ تو علوم طبیعی کے ترازو پر تولا جاسکتا ہے اور نہ اس سے اس کا حساب کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح علوم طبیعی کے مختلف شعبوں میں ہر ایک کام کے لئے ایک علیحدہ آلہ اور ایک علیحدہ پیمانہ مقرر ہے جو دوسرے کام کے لئے کارآمد نہیں ہوسکتا اسی طرح فلکیات کے مطالعہ اور تجزیہ کے لئے اور مائیکروب شناسی (جراثیم شناسی) کے لئے جو آلات استعمال ہوتے ہیں، ان سب میں کافی فرق ہوتا ہے۔

ایک ماہر علوم مادی بھی اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ ایک منجم اور ستارہ شناس سے کہا جائے کہ وہ فلاں جرثومہ کو ستاروں کے حسابات اور ذرائع سے ہمارے لئے ثابت کرے اور اسی طرح کسی ماہر جراثیم شناسی سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ جراثیم شناسی کے آلات سے مشتری کے چاندوں کا پتہ

۱ [اثبات وجود خدا، ص ۴۴] ۲ [در فرہنگ قصص قرآن، ص ۶۰]

چلائے گا، کیونکہ ہر ایک اپنے سائنسی شعبہ کا ماہر ہے اور وہ اپنے دائرہ علم سے باہر کسی چیز کو مثبت یا منفی انداز سے نہیں دیکھ سکتا تو پھر ہم علوم طبیعی کو کس طرح یہ حق دے سکتے ہیں کہ وہ نیچر سے ہٹ کر بحث کرے کیونکہ اس کا دائرہ طبیعت اور اسکے آثار و خواص تک محدود ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہ حق ایک ماہر طبیعیات کو دے سکتے ہیں کہ وہ کہہ سکے کہ ''میں ماورائے طبیعت کے بارے میں خاموش رہتا ہوں کیونکہ یہ کام میرے مطالعہ اور میرے آلات کے حدود سے باہر ہے''۔ جو ''اصول فلسفہ حسی'' کے بانیوں میں سے ایک ہے ''فلسفہ حسی کے بارے میں کلمات'' (کلماتی درپیرامون فلسفہ حسی) نامی کتاب میں کہتا ہے:

''چونکہ ہمیں موجودات کے آغاز و انجام کا پتہ نہیں ہے اس لئے ہم کسی سابقہ یا بعد آنیوالے وجود سے انکار نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ہم اسے موجود بھی قرار نہیں دے سکتے (غور کیجئے!)۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ فلسفہ حسی' عدم علم کی وجہ سے اس بارہ میں ہر قسم کا تبصرہ کرنے سے پرہیز کرتا ہے۔ اسی طرح ذیلی علوم بھی جو فلسفۂ حسی کی بنیاد ہیں موجودات کے آغاز و انجام کے بارے میں فیصلہ کرنے سے احتراز کرنا چاہئے یعنی خدا کے علم وحکمت کا اور اس کے وجود کا ہم انکار نہیں کرتے اور نفی اور اثبات کے بارے میں اپنی غیر جانبداری قائم رکھتے ہیں''۔

ہمارا مقصد بھی یہی ہے کہ عالم ماورائے طبیعت کا مشاہدہ علوم طبیعی کے دریچہ سے نہیں کیا جا سکتا اصولاً جس خدا کو طبیعی آلات و اسباب کے ذریعہ ثابت کرنا چاہتے ہو وہ خدا پرستوں کی نظر میں خدا نہیں ہے۔ کیونکہ جس چیز کو اسباب طبیعی ثابت قرار دیتے ہیں وہ مادہ کے حدود کے اندر ہے اور اسی کے خواص رکھتی ہے اور ایک ایسے موجود کو جو خود مادی اور طبیعی ہے کس طرح مادہ اور نیچر کا خالق کہہ سکتے ہیں؟؟

تمام دنیا کے خدا پرستوں کے عقیدہ کی بنیاد اس پر ہے کہ خدا مادہ سے اور مادہ کے خواص سے بالکل منزہ (پاک) ہے اور کسی مادہ آلہ سے اس کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔

اس بناء پر یہ امید نہ رکھنی چاہئے کہ خالقِ موجوداتِ جہاں کو مائیکروسکوپ یا ٹیلسکوپ کے ذریعہ آسمان کی گہرائیوں میں دیکھا جا سکتا ہے ایسی امید بے جا اور فضول ہے۔

۱؎ [دائرۃ المعارف، ص۳۸۲] ۲؎ [دائرۃ المعارف] ۳؎ [دائرۃ المعارف]

۲۔ اس کی نشانیاں

اصولی طور پر عالم آثار میں ہر موجود کو پہچاننے کا ذریعہ یہ ہے کہ ہر موجود کو اس کے اثر سے پہچانا جا سکتا ہے حتیٰ کہ ان موجودات کو بھی جنہیں ہم آنکھ سے اور دوسرے حواس سے معلوم کر سکتے ہیں' حقیقت میں ہم ان کو ان کے آثار سے ہی پہچانتے ہیں (غور کیجئے!) کیونکہ کوئی موجود ہمارے منطقہ فکر میں داخل نہیں ہوتا اور یہ محال ہے کہ ہمارا دماغ موجودات کے لئے ظرف کا کام دے۔ مثال کے طور پر:

اگر آپ ایک جماعت کو بلاتے ہیں اور اسے آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور اس کے وجود کو محسوس کرتے ہیں (اس کے لئے) ابتداء میں آپ اپنی آنکھیں اُدھر گھماتے ہیں جس طرف کسی موجود کے ہونے کا گمان ہو' نور کی روشنی اس پر پڑتی ہے اور آنکھ کی پتلی سے نورانی شعاعیں ایک خاص نقطہ پر جسے شبکیہ (Retina) کہتے ہیں منعکس ہوتی ہیں۔ بینائی کے اعصاب اسے اخذ کر کے دماغ تک پہنچا دیتے ہیں اور انسان اسے پہچان لیتا ہے۔

اور اگر یہ فعل لمس کے ذریعہ ہو تو زیر جلد اعصاب چھونے کے سبب سے اسے اخذ کرتے ہیں اور اس کی اطلاع دماغ کو دیتے ہیں اور انسان اسے پہچان لیتا ہے۔

پس ایک جسم کا ادراک' اس کے (رنگ' آواز اور لمس کے) اثر سے ہوتا ہے اور وہ جسم خود بھی دماغ کے اندر داخل نہیں ہوتا اور اگر اس میں رنگ نہ ہوتا یا اعصاب اس کا ادراک کرنے میں عاجز ہو جاتے تو وہ ہرگز پہچانا نہ جاتا۔

ہم ایک جملہ کا اور اضافہ کرتے ہیں: ایک موجود کو پہچاننے کے لئے ایک اثر کافی ہے مثلاً: یہ معلوم کرنے کیلئے کہ دس ہزار سال قبل کسی نقطۂ زمین پر کوئی آبادی تھی یا ان کی حالت یا وضع یا ولیسی تھی تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زمین کے نیچے سے نکلے ہوئے ایک مٹی کے برتن یا ایک زنگ آلودہ ہتھیار کو کافی سمجھا جاتا

۱؎ [اثبات وجود خدا، ص۵۴] ۲؎ [اثبات وجود خدا (آخر کار ایک کتاب ''اثبات وجود خدا'' نامی لکھی گئی جو خدا شناسی کے بارے میں ہم عہد چالیس دانشوروں کے نظریات کا مجموعہ ہے۔ اس میں سے چند حصے نمونے کے طور پر بیان کئے گئے]

ہے اور اسی نشان کی بناء پر وسیع پیمانے پر مطالعات کئے جاتے ہیں اور اسی ایک اثر سے اس آبادی کا طرز زندگی، طرز فکر اور وضع قطع کا اندازہ لگاتے ہیں۔ یا اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ ہر موجود کو خواہ وہ مادی ہو یا غیر مادی، اس کے اثر سے پہچانا جاتا ہے اور اس لحاظ سے کہ ایک موجود کو دریافت کرنے کے لئے صرف ایک اثر کافی ہے تو کیا یہ تمام موجودات جو سراسر اور حیرتناک باریکیوں سے بھرپور ہیں اور جو تمام جہان ہستی پر چھائے ہوئے ہیں خدا کو پہچاننے کیلئے کافی نہیں ہیں؟

آپ ایک موجود کو پہچاننے کیلئے ایک اثر پر اکتفاء کرتے ہیں اور ایک مٹی کے برتن سے کم از کم چند ہزار سال پہلے گزری ہوئی آبادی کے حالات دریافت کر لیتے ہیں حالانکہ خدا کو پہچاننے کیلئے ہمارے سامنے بے انتہا اثرات، بے انتہا موجودات اور بے انتہا تنظیم موجود ہے تو کیا خدا کو پہچاننے کے لئے اس قدر آثار کافی نہیں ہیں؟؟

۳۔ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں اور جو کچھ نہیں دیکھتے

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ علوم مادی نے اپنے ہاتھ سے اپنی قبر کھود رکھی ہے اور ایسے اسباب پیدا کر دیئے ہیں جو مادہ پرستی اور الحاد کے عقیدہ کی تردید کے لئے بہترین آلات ہیں۔

شاید سابق میں ایک دانشور کہہ سکتا تھا کہ:

''حواس جس چیز کا ادراک نہیں کرتے ہیں اسے قبول نہیں کرتا''۔

لیکن آج سائنس کی ترقی نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ:

''جو موجودات جہاں میں قابل احساس نہیں ہیں ان کی تعداد ان سے بہت زیادہ ہے جسے ہم نے دریافت کر لیا ہے۔ نیچر کے اندر اس قدر موجودات ہیں کہ وہ حواس خمسہ میں سے کسی کے ذریعہ بھی دریافت نہیں ہو سکتے اور معلوم شدہ موجودات کی تعداد ان کے مقابلہ میں صفر کے برابر ہے''۔

نمونہ کے طور پر ہم چند چیزیں آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں:

۱۔ طبیعیات میں ہم سے کہا جاتا ہے کہ اصلی رنگ سات سے زیادہ نہیں ہیں کہ ان میں کا پہلا سرخ اور

سب سے آخری بنفشی Violet ہے لیکن ان سے ہٹ کر ہزاروں رنگ ہیں جن کا ہم ادراک نہیں کر سکتے اور خیال ہے کہ شاید بعض حیوانات ان میں سے چند کو دیکھ سکتے ہوں۔

مطلب واضح ہے کہ رنگ، نور کی موجوں کے نیچے پیدا ہوتے ہیں خواہ وہ سورج کا نور ہو یا کوئی مرکب نور ہو اس میں مختلف رنگ ہوتے ہیں جو سفید رنگ کو تشکیل دیتے ہیں اور جب وہ کسی جسم پر چمکتے ہیں تو جسم رنگ کے مختلف حصوں کو اپنے میں جذب کر لیتا ہے اور بعض کو لوٹا دیتا ہے۔ جس رنگ کو وہ لوٹا دیتا ہے وہ وہی رنگ ہوتا ہے جسے ہم دیکھتے ہیں اسی لئے تاریکی میں اجسام کا کوئی رنگ نہیں ہوتا اور ایک لحاظ سے رنگوں میں اختلاف امواج نور کی شدت وضعف کا نتیجہ ہے یعنی اگر ہر سکنڈ میں ارتعاش (حرکت) کی تعداد ۴۵۸ ہزار ارب تک پہنچ جائے تو سرخ رنگ پیدا ہوتا ہے اور ۷۲۷ ہزار ارب سے رنگ بنفشہ اور ان دونوں سے کم یا زیادہ تعداد میں ہوں تو سیکڑوں رنگ پیدا ہوتے ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتے۔

۲۔ آواز کی موجیں ۱۶ مرتبہ فی سکنڈ سے لیکر ۲۰،۰۰۰ مرتبہ فی سیکنڈ تک ہوں تو ہمیں سنائی دیتی ہیں اور اس سے کم یا زیادہ ہوں تو وہ ہمارے لئے قابل ادراک نہیں ہیں۔

جو کچھ ہم ارتعاش نور کی امواج سے ادراک کرتے ہیں وہ فی سکنڈ ۴۵۸ ہزار ارب سے ۷۲۷ ہزار ارب تک ہوتے ہیں اس سے کم یا زیادہ جو امواج اور ارتعاشات فضا میں موجود ہیں وہ ہمارے لئے قابل دید نہیں ہیں۔

۴۔ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ چھوٹی مخلوقات جو ذرہ بین سے نظر آتی ہیں (وائرلیس اور بیکٹیریائی جراثیم) ان کی تعداد انسانوں سے کئی گنا زیادہ ہے اور وہ سادہ آنکھ سے نظر نہیں آسکتے۔ اور اس سے بھی زیادہ چھوٹے جاندار ہونگے جن کا سائنس نے آج تک پتہ نہیں چلایا ہے۔

۵۔ ایک ایٹم (ذرہ) ایک مخصوص ساخت رکھنے کے باوجود اور پروٹونوں کے اطراف الیکٹرونوں کی گردش، اپنے میں اس قدر عظیم قدرت رکھنے کے باوجود کسی حس کے لئے قابل ادراک و قابل دید نہیں ہے حالانکہ جہان طبیعی کے تمام موجودات اور تمام اجسام ایٹم سے ہی تشکیل پائے ہیں اور اس

غبار کے ذرہ کو جسم ہم ہوا میں بمشکل دیکھ سکتے ہیں وہ بھی لاکھوں ایٹم سے تشکیل پاتا ہے۔

جو دانشور اس سے پہلے ایٹم کا ذکر کرتے تھے ان کا قول ایک مفروضہ اور تھیوری سے بڑھ کر نہ ہوتا تھا لیکن اب کوئی شخص ان کی بات ماننے سے انکار نہیں کر سکتا۔

اس بناء پر کسی چیز کے محسوس نہ ہونے کو اس کے موجود نہ ہونے کی دلیل نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ ایسی بہت سی غیر محسوس چیزیں ہیں جن سے دنیا بھری ہوئی ہے لیکن ہمارے حواس اس کے ادراک سے عاجز ہیں۔ چنانچہ ایٹم کے اکتشاف سے پہلے یا ان موجودات کے انکشاف سے پہلے جو ذرہ بین کی مدد سے دیکھے جا سکتے ہیں کسی کو حق حاصل نہ تھا کہ وہ ان کے وجود سے انکار کرتا اور ہو سکتا ہے کہ بہت سے ایسے دوسرے موجودات جو ہماری نظر سے پوشیدہ ہوں اور آج تک سائنس ان کا انکشاف کرنے میں کامیاب نہ ہوئی ہو اور بعد ازاں اس راز سے پردہ اٹھ جائے اور عقل و وجدان ہمیں ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ہم (علم کے محدود ہونے کے سبب سے اور ان کے ادراک سے عاجز ہونے کی وجہ سے) ان کے بارے میں مثبت یا منفی رویہ اختیار کریں۔

خلاصہ یہ کہ "حواس اور طبیعی آلات کا دائرہ کار محدود ہے اور ہم دنیا کو اس کے اندر محدود نہیں سمجھ سکتے۔

کہیں غلطی نہ ہو جائے!

ہم دعویٰ تو نہیں کرنا چاہتے کیونکہ آج سائنسی وسائل کے ذریعہ الیکٹرونوں، پروٹونوں یا بعض رنگوں اور اس جیسی چیزوں کا انکشاف ہو چکا ہے یا سائنس کی ترقی کے بعد بہت سی پوشیدہ چیزوں کا انکشاف ہو جائے گا او یہ بھی ممکن ہے کہ ایک روز عالم ماورائے طبیعت (عالم بالا) کا طبیعی اسباب و آلات سے انکشاف ہو جائے۔!!

نہیں اس بات کا امکان نہیں ہے کیونکہ جس طرح ہم نے کہا ہے کہ نیچر اور مادہ سے ماوراء چیزوں کا معمولی اور طبیعی ذریعوں سے ادراک نہیں کیا جا سکتا اور وہ بالکلیہ اسباب مادی کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح ان موجودات کے ادراک اور انکشاف سے پہلے ان کا انکار ہمارے لئے

جائز نہ تھا اور ہمیں حق نہ پہنچتا تھا کہ محض اس وجہ سے کہ ہم ان چیزوں کا دراک نہیں کر سکتے تھے اور اسباب طبیعی ہمارے لئے ان کی نشاندہی نہ کرتے تھے اور وہ چیزیں جنہیں سائنس ہمارے لئے ثابت قرار نہیں دیتی تھی ہم اس کے معدوم ہونے کو تسلیم کر لیں۔ اسی طرح طبیعت کے ماوراء چیزوں کی ہم نفی بھی نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہمیں چاہیے کہ اس غلط روش کو چھوڑ کر پہلے خدا پرستوں کی باریک عقلی دلائل کا مطالعہ کریں اور بعد میں اپنے عقیدہ کا اظہار کریں تو مسلمہ طور پر اس کا نتیجہ مثبت ہوگا۔

تیسرا اعتراض

کیا ہم طبیعی اسباب کے باوجود خدا کے محتاج ہیں؟؟

خدا پرستی اور دین کا مطلب کیا ہے؟ آخری دور کے بعض مادہ پرست دانشوروں نے لوگوں میں خدا شناسی کے جذبہ اور ان کے مذہبی عقائد کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جس کی حیثیت

دعوے سے بڑھ کر نہیں ہے اور اس لحاظ سے اس کے جواب کی چنداں ضرورت نہ تھی لیکن ہم فرض کرتے ہیں کہ ان کے اس دعوے کی تائید میں ان کے پاس دلیلیں بھی موجود ہیں اس لئے اس کے جواب میں مصروف ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں:

"مذہبی افکار انسان کی طبیعی قوانین سے ناواقفیت کی پیداوار ہیں"!

"انگلس" جس کا شمار بین الاقوامی کمیونزم کے بانیوں میں ہوتا ہے کہتا ہے:

"دین انسان کی محدود اور کوتاہ عقل کی پیداوار ہے"۔!

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مادہ پرستوں کے عقیدہ کے مطابق انسان اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں ہوا' بارش' رعد' برق' طوفان' زلزلہ' آفتوں اور بلاؤں جیسے حادثات سے دوچار ہوتا تھا اور ان کے طبیعی اسباب کی کوئی تشریح اور توضیح کرنے سے عاجز تھا مجبوراً اس نے ان حوادث کی پیدائش کے سلسلہ میں ایک غیبی طاقت کا نام خدا رکھا اور اس کا معتقد ہو گیا اور اسے تمام دنیا کا خالق سمجھنے لگا۔ مثال کے طور پر چونکہ بارش کے ہونے ہوا کے چلنے' گھاس وغیرہ کے اگنے کا اصلی سبب اس کی نظروں سے اوجھل تھا اس لئے وہ سمجھنے لگا کہ بارش کے ہونے' گھاس کے اگنے اور ہوا کے چلنے کا سبب خداوند ہے اور وہ اس بات سے غافل ہے کہ بارش' سمندر کے پانی کے بخارات کا' اور گھاس کا اگنا' زندگی کے ان اسباب (حرارت' پانی اور غذائی مواد) کے فراہم ہونے کا اور زندگی سے متعلق طبیعی قوانین کے ایک سلسلہ کا نتیجہ ہے۔

انسان ابتداء میں جب مچھروں سے جن میں ملیریا کے جراثیم ہوتے ہیں اور جو مرطوب جگہ اور دلدل میں انڈے دیتے ہیں (اور جن کا نام آنوفل ہے) سے بے خبر تھا اس وقت اس کا عقیدہ تھا کہ دلدلوں میں ایک مخلوق ہوتی ہے جنہیں جن کہا جاتا ہے وہ مذکورہ بیماری کا سبب بنتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ انسان کی رموز خلقت سے اور گوناگوں حوادث کے طبیعی اسباب سے ناواقفیت نے اسے مجبور کیا کہ وہ خدا کا اور ماورائے طبیعت وجود کا معتقد ہو۔ لیکن رفتہ رفتہ انسان نے طبیعی اسباب کا پتہ چلایا اور سمجھا کہ ہر طبیعی معلول ایک طبیعی علت بھی رکھتا ہے اور اسے کسی غیبی قوت کی اور خدا کی کوئی حاجت نہیں ہے لہٰذا جس قدر علم کی بنیاد مضبوط ہوتی جائیگی اور خلقت کے اثرات ظاہر ہوتے جائیں گے اسی

قدر دین کی بنیاد اور اساس کمزور ہوتی جائے گی۔ اس کے بعد وہ مزید کہتا ہے کہ خدا پرست اسباب طبیعی کے قائل نہیں ہیں بلکہ اس کی بجائے خدا کے قائل ہیں۔ اسی عقیدہ کی وجہ سے بہت سے مادہ پرست "سائنس" کو دین کا مدمقابل قرار دیتے ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ فلاں موضوع کی تفسیر طبیعی طور پر اس طرح ہے اور دینی لحاظ سے اُس طرح۔

﴿جواب﴾

اس اشکال کا جواب بہت واضح ہے کیونکہ تمام موجودات و حوادث کے لئے علل طبیعی تسلیم کرنے کے باوجود ایک غیر طبیعی مبدا کو ماننے میں جو ان طبیعی اسباب کا پیدا کرنے والا ہے کونسا امر مانع ہے؟!

تفصیل کے لئے حسب ذیل چند باتوں کو پیش نظر رکھا جائے:

ا۔ بدنیتی یا معلومات کی کمی؟

پہلی دلیل میں بھی مادہ پرستوں کی مذہبی تعلیمات سے کامل بے توجہی منعکس ہو رہی ہے اب مجبوراً دو چیزوں سے کسی ایک کو قبول کرنا پڑیگا۔ یا تو یہ کہنا پڑے گا کہ وہ دینی طور طریقوں سے اور دینداروں کے اعتقادات سے واقعی لاعلم رہے ہیں یا یہ کہ جان بوجھ کر غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔ اگر پہلا شبہ صحیح ہو تو یہ بُری بات ہے اور اگر دوسری بات صحیح ہے تو اس سے بھی زیادہ بُری بات ہے۔ کونسا پڑھا لکھا یا ان پڑھ خدا پرست ہوگا جو طبیعی اسباب کا منکر ہو حالانکہ بنیادی طور پر طبیعی اسباب کا قبول کرنا ضروری اور فطری امر ہے اور سب لوگ جانتے ہیں کہ آگ جلاتی ہے' پانی آگ کو بجھاتا ہے' بغیر بادل کے بارش نہیں ہوتی اور بادل ہواؤں کے ذریعہ حرکت کرتے ہیں وغیرہ......۔

بنیادی طور پر لوگ کس لئے زندگی کے کاموں اور وسیلوں کے پیچھے پھرتے ہیں۔ تجارت اور صنعت کے پیچھے' علم اور دوا کے پیچھے جاتے ہیں۔ یقیناً آپ کہیں گے کہ طبیعی اسباب پر اعتقاد رکھنا ہر ایک کے لئے ایک فطری امر ہے جو اس (انسان) کو کوشش اور دوڑ دھوپ کی طرف مائل کرتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دیوانے تک بھی گرمی کے احساس کے باعث پانی کی تلاش میں جاتے ہیں اور سردیوں میں اور سرد ہوا کے وقت دھوپ یا آگ کی طرف جاتے ہیں۔ بھوک مٹانے کے لئے روٹی کھاتے ہیں نہ کہ پتھر۔

پیاس بجھانے کے لئے پانی سے استفادہ کرتے ہیں نہ کہ کسی اور چیز سے۔ پس کہنا چاہئے کہ وہ بھی اس حقیقت سے واقف ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہر چیز کیلئے ایک خاص علت اور سبب ہوتا ہے اس لحاظ سے وہ بھی قانونی اسباب کے معترف ہیں۔

کتب آسمانی کی رو سے اور دینی پیشواؤں کے اقوال کی رو سے یہ (موجودات کے لئے طبیعی اسباب کا) موضوع قطعی طور پر تسلیم شدہ ہے خصوصاً اس بارے میں قرآن مجید کی آیتیں بالکل واضح اور روشن ہیں۔ ان میں ہواؤں کے چلنے، بارش کے ہونے، نباتات کے اگنے اور انسان کے پرورش پانے کے بارے میں حقیقتوں کا ایک سلسلہ بیان کیا گیا ہے جس کی بنیاد قانونِ اسباب طبیعی پر ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ ان ہی آیات کے توسط سے خداوند کا لوگوں سے تعارف کرایا گیا ہے[1]

۲۔ آپ کیوں غلط راستہ پر چلتے ہیں؟!

یہ لوگ خدا پرستی کے عقیدہ کی پیدائش اور اس کے اسباب کی جو تعبیر کرتے ہیں اس سے ان کی عجیب طرز فکر ظاہر ہوتی ہے کیونکہ یہ لوگ اس شخص کی مانند ہیں جو صاف راستہ چھوڑ کر سنگلاخ زمین میں اور غلط راستے پر چل رہا ہو۔

انسان نے کیوں پہلے دن سے اس عالم کے مبداء علم و قدرت کے وجود کا عقیدہ قائم کیا ہے؟ اس کا جواب بہت واضح ہے:

جب انسان نے عالمِ آفرینش کے حیرت انگیز نظام میں، اس کی قدرت اور علم کے، سورج اور چاند کی منظم گردش کے، نباتات اور میووں کی مناسب پیداوار کے، انسان کے پراسرار اور گوناگوں اعضاء اور نازک جسم کے آثار دیکھے تو تمام چیزیں باآواز بلند اس سے کہہ رہی تھیں کہ اراداہ و عقل سے محروم اسباب اور اندھے و بہرے حادثات ہرگز اس عظیم کارخانہ کے انجینئر اور نقشہ بنانے والے نہیں ہو سکتے۔ فطرت اور وجدان کی آواز نے بھی موجودات کی اس منطقی دعوت سے ہم آہنگ ہو کر اس کی (انسان کی) مبداء جہانِ ہستی کی طرف رہنمائی کی۔

آخر کار انسان نے خواہ وہ جس قدر بھی کم عقل اور کوتاہ فکر تھا لیکن پھر بھی اس میں اتنا شعور تھا کہ اپنی

حقیر زندگی کے مرکز اور عمارت پر غور کر سکے اور دیکھے کہ ایک عمارت کی تعمیر کے لئے مختلف قسم کے سینکڑوں کاریگر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں تب عمارت بنتی ہے۔ نقشہ نویس Architeet بناتا ہے، ایک جماعت بنیاد کھودتی ہے کچھ دوسرے لوگ مختلف مقامات سے اس کا سامان یعنی اینٹ، پتھر اور لکڑی فراہم کرتے ہیں اور کچھ لوگ اس کو لا کر جمع کرنے کا ذمہ لیتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ بیسیوں عقلمند آدمی اپنی عقل کو کام میں لاتے ہیں تب کہیں ایک عمارت بنتی ہے اور اس کا ذاتی شعور اس کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کہے کہ بے شعور اور بے ارادہ اسباب جیسے ہوا، بارش، رعد و برق اور اس جیسی چیزوں نے عمارت کا مصالحہ حادثاتی طور پر جمع کر دیا اور اتفاقاً ایک شاندار عمارت بن کر تیار ہو گئی ہے[1]

پس انسان ہر زمانہ میں اپنی ذاتی فطرت اور شعور کی رو سے جانتا تھا کہ یہ منظم کارخانہ کسی عاقل خالق کا محتاج ہے اور یہ کسی حادثہ کے ذریعہ وجود میں نہیں آیا ہے۔

جب اس نے اس وسیع دنیا پر نظر ڈالی اور دیکھا کہ اس کے ہر ایک گوشہ میں اسرار و رموز پوشیدہ ہیں اور وہ ایک پروگرام اور ایک معین نظام کے ماتحت ایک خاص مقصد اور خاص منزل کی طرف رواں دواں ہیں یا کم از کم جب اس نے اپنی ہستی کی حیرت انگیز معموں یعنی دل، آنکھ اور کان وغیرہ کی طرف توجہ کی تو وہی فیصلہ جو اپنی سکونتی عمارت کے متعلق کیا تھا خواہ مخواہ وہی فیصلہ اب دنیا، موجودات اور خود اپنے متعلق بھی اس نے دیا۔ اور یہ بات یقین کرنے کے قابل نہیں ہے کہ انسان کی فکر خواہ جس قدر بھی پست رہی ہو ایک مختصر سی عمارت کے متعلق تو وہ ایسا فیصلہ دیدے لیکن نظام عالم اور جہان ہستی کے بارے میں فیصلہ کرنے میں وہ حیران و پریشان رہ جائے۔ ہر عقل ہمیشہ انسان کے ساتھ رہی ہے اور خدا پرستی اور دین کا مطلب بھی یہی ہے۔

اس لحاظ سے عقل و فکر انسانی ہمیشہ دین اور خدا پرستی کا سرچشمہ رہی ہے نہ کہ اس کی جہالت۔ اور انسان کی عقل و فکر جس قدر کامل ہوگی گئی خدا شناسی میں بھی اسی قدر اضافہ ہوتا گیا اور اگر ابتدائی دور میں خدا کو غیر صحیح طریقہ سے پہچانتا تھا تو اپنے کمال کے زمانے میں اسے زیادہ بہتر اور زیادہ صحیح طریقہ پر

پہچان لیا ہے۔

دراصل یہ بات قابل تعجب ہے کہ یہ لوگ خدا پرستی کے عقیدہ کی پیدائش کے بنیادی اور واقعی اسباب کو چھوڑ کر اس کے برعکس (چیزوں) کو علت قرار دے رہے ہیں۔

۳۔خدا شناسی سائنس کے دوش بدوش آگے بڑھتی ہے!!

مادہ پرست جو کچھ کہتے ہیں اس کے بالکل برعکس 'خدا پر ایمان رکھنا' سائنس کی رہنمائی کا نتیجہ ہے اور ''سائنس'' کی ترقی کے ساتھ ساتھ خدا شناسی کی بنیاد زیادہ مضبوط ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ قدم ملا کر آگے بڑھ رہی ہے۔

جس قدر سائنس آگے بڑھتی جائے گی اسی قدر نظم جہان ہستی اور اسرار خلقت سے نئے نئے پردے اٹھتے جائیں گے اور اس کے نظام کے بارے میں ہمارے ایمان میں اضافہ ہوگا اور اس باعظمت محل کی تعمیر کی تنظیم اور پیچیدگیاں جس قدر ظاہر ہوتی جائیں گی اس کے بنانے والے کی قدرت و عظمت اتنی ہی نمایاں ہوتی جائیں گی۔ اگر ہم ہزار سال پہلے خدا شناسی کے بارے میں کوئی دلیل پیش کرنا چاہتے تھے تو فطرت کے محسوس ظواہر پر سے آگے قدم نہ رکھ سکتے تھے اور فطری طور پر ہماری دلیلیں محدود اور سربستہ رہتی تھیں لیکن آج چھوٹے سے چھوٹے موجود یعنی ایٹم سے لیکر بڑے بڑے ستاروں اور کہکشانوں کو اور دور ترین موجودات سے لیکر نزدیک ترین موجودات کو اس مقدس ذات کے شناخت کرنے میں وسیلہ بنا سکتے ہیں۔

آج سائنس کی ترقی کی وجہ سے ایک درخت کے پتے سے یا ایک بال کے ذریعہ سے مختلف طریقوں سے خدا کو پہچانا جا سکتا ہے اس بناء پر سائنس نہ صرف یہ کہ خدا شناسی کی مخالف نہیں ہے بلکہ خدا شناسی کا بہترین وسیلا اور ذریعہ ہے۔(غور کیجئے!!)

ہاں! انسان گذشتہ زمانے میں ایک سبز پتے کو صرف ایک سادہ چیز اور ایک بال کو صرف ایک حقیر چیز اور آسمان کو سوائے ایک نیلگوں پلیٹ کے جس میں چاندی کی میخیں گاڑ کر آراستہ کیا گیا ہو اور خود کو سوائے گوشت و پوست اور ہڈیوں کے کچھ نہ سمجھتا تھا حتیٰ کہ اس نے اس وسیع دنیا میں سوائے اپنی زندگی

کے محدود ماحول کے اور کوئی چیز نہ دیکھتی تھی اور رموز خلقت سے بالکل ناواقف تھا لیکن آج وہ بیدار ہو چکا ہے اور ہر ذرہ کے دل میں ایک چمکتا آفتاب اور ہر درخت کے پتے پر سینکڑوں پوشیدہ بھیدوں کا مطالعہ کرتا ہے یہ بات بھی مسلم ہے کہ جس قدر کسی کارخانہ کی اہمیت زیادہ ظاہر ہوتی جائے گی اس کے بنانے والے کے مرتبہ کی اہمیت اور قیمت بڑھتی جائے گی۔ اگر ہم آج کے اور کل کے انسان کا تقابل کریں تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں میں وہی فرق ہے جو ایک عام اور ان پڑھ شخص اور ایک عظیم دانشور میں ہوتا ہے۔ بتائیے کہ ان دونوں میں سے کون خدا کو بہتر طریقہ پر پہچان سکتا ہے؟؟

اسی لحاظ سے ہم کتابوں کا اور دین کے بزرگ پیشواؤں کے اقوال کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں انسان کو موجودات عالم میں غور و فکر کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور جو لوگ اس میں کوتاہی کرتے ہیں ان کو سرزنش کی گئی ہے او مخلوقات کے مطالعہ کو خدا شناسی کا بہترین وسیلہ قرار دیا گیا ہے [1]

اب ازروئے انصاف فیصلہ کیجئے کہ آیا سائنس کے زیر سایہ خدا شناسی کی بنیادیں اور دین کے ستون ہل گئے یا زیادہ مضبوط ہو گئے؟؟

اس حقیقت کو ہم تنہا ہی بیان نہیں کر رہے ہیں بلکہ علوم طبیعی کے بزرگترین ماہر بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر ان میں سے چند جملے ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں:

''ہرشل'' کہتا ہے:

''جس قدر علم کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے اسی قدر خداوند ازلی وابدی کے وجود کو ثابت کرنے کیلئے قوی تر اور دندان شکن دلیلیں ہاتھ آتی جاتی ہیں۔ واقعتاً ماہرین ارضیات اور ریاضی دان اور

---

[1] [یہ بات پیشوایان اسلام سے بھی پوچھی گئی تھی کہ بعض لوگ تمام موجودات کو فطرت کی پیداوار سمجھتے ہیں انہیں جواب دیا گیا کہ اگر فطرت سے مراد ایک بے ارادہ بے شعور موجود ہے تو یہ بات نظم عالم کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکتی۔ (وہ ذات جو خود زندہ موجود نہ ہو وہ دوسرے کو کس طرح وجود بخش سکتی ہے) اور اگر اس سے مراد وہ ایک ذی شعور موجود ہے تو اس میں صرف خدا کے نام کا فرق ہے۔ (اس بیان کو تفصیل سے باب توحید میں خود امام صادق - سے نقل کیا گیا ہے)]

ماہرین فلکیات اور ماہرین طبیعیات شانہ بہ شانہ چل رہے ہیں اور سائنس کے محل یعنی خدا کے باعظمت محل کو مضبوط بنا دیا ہے"۔ (یہ عبارت ہمارے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے)۔

"ماؤنٹ ٹل" اپنی کتاب دائرۃ المعارف میں کہتا ہے:

"علوم طبیعی کی اہمیت محض اس لحاظ سے نہیں ہے ہماری عقل کو مطمئن کر دیتے ہیں (اور ہماری ضروریات کا تحفظ کرتے ہیں) بلکہ ان کی زیادہ اہمیت اس وجہ سے ہے کہ عقل ہمیں اتنا بلندی پر لے جاتی ہے کہ ہم خدا کی عظمت کا ادراک کر سکتے ہیں اور ہمیں اس کی ذات کی بزرگی اور حمد وثناء کے احساسات سے زینت بخشتی ہے"۔

"نیوٹن" کے اس بارے میں بہت وسیع خیالات ہیں۔ اسی ضمن میں وہ کہتا ہے:

"ہم کان کا مطالعہ کرنے کے بعد جان لیتے ہیں کہ اسکا بنانے والا آواز سے متعلق تمام اصولوں کو بخوبی جانتا تھا اور آنکھ کا بنانے والا نور اور بصارت کے پیچیدہ قوانین سے پوری طرح باخبر تھا اور افلاک کی تنظیم کے مطالعہ سے اس کی بزرگی کی حقیقت کا ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ کس مخصوص طریقہ سے ان (افلاک) کا انتظام چلا رہا ہے"۔ لے و لے

۴۔ ہم اسباب طبیعی پر آپ سے زیادہ ایمان رکھتے ہیں!

صاحبان! ہم جہان طبیعی کے علل ومعلول کے منکر نہیں ہیں۔ ہم عالم اسباب پر آپ سے زیادہ ایمان رکھتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہمارے لئے خدائے تعالیٰ کو پہچاننے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہیں اور ہم نے ان ہی عالم طبیعی کے علل ومعلول کی مدد سے اسے پہچانا ہے اگر ہم ان حیرت انگیز اور منظم علل واسباب سے اپنی آنکھیں بند رکھتے تو یہ کہنے میں ہمیں باک نہیں کہ ہم ہر چیز کو اپنے ہاتھ سے گنوا بیٹھتے۔

ان لوگوں کو جو پروردگار عالم کی مقدس ذات کو دنیا کے زلزلوں اور طوفانوں جیسے اتفاقی حادثات میں تلاش کرتے ہیں (اگرچہ وہ ہماری سطحی نظر میں اتفاقات ہیں لیکن درحقیقت وہ بھی ایک صحیح ومسلمہ نظم وضبط کے تحت وقوع پذیر ہوتے ہیں) ہم رسمی طور پر ان لوگوں کو غلطی پر سمجھتے ہیں۔

اس جہان کے اسرار کے انکشاف سے اور طبیعی اسباب پر سے پردہ اٹھنے کے بعد نہ صرف یہ کہ ہمارے ایمان میں تھوڑا سا بھی تزلزل پیدا نہیں ہوتا بلکہ سائنسی ترقی کے متوازی ہمارا ایمان اس مبداء بزرگ پر زیادہ مضبوط اور زیادہ قطعی ہو جاتا ہے۔ اور ہم اس جہان کے حیرت انگیز اسرار کے مطالعہ سے غیر معمولی لذت حاصل کرتے ہیں۔ ہم آپ کے سائنسی انکشافات کے نتیجوں سے آپ سے زیادہ شاد اور مسرور ہیں۔

ہمارا اعتقاد ہے کہ خدا پرستی کا راستہ آپ کے ہاتھوں لیکن آپ کی توجہ کے بغیر روز بروز زیادہ ہموار اور زیادہ صاف ہوتا جا رہا ہے۔ ہم ان تمام آثار کو خدا کی جانب سے سمجھتے ہیں اور ایسا سمجھنے میں ہم بالکل حق بجانب ہیں کیونکہ اگر آپ بھی اصل موضوع کی تصویر کشی میں غلطی کے مرتکب نہ ہوتے اور صحیح طریقے سے سوچتے تو پوری طرح تصدیق کرتے کہ بے جان اور بے مقصد فطرت اس قدر عاجز ہے کہ درخت کے ایک پتے کی پیدائش کی نسبت بھی اس کی جانب نہیں کی جا سکتی۔

ضروری یادداشت

جاننا چاہئے کہ ہمارے اس کہنے کا مقصد کہ دین کی بنیادی علوم طبیعی کی ترقی کے زیر سایہ زیادہ مستحکم ہو رہی ہیں۔ اصل میں یہ وہی عقیدہ ہے جو خدا پر اور اس جہانِ ہستی کو پیدا کرنیوالے پر ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس بات کا ادعا کریں کہ سائنس اور موجودہ تمدن کی ترقی سے انسان "اخلاقی اور عملی" لحاظ سے بھی آگے بڑھ گیا ہے بلکہ شاید حقیقت اس کے برعکس ہے کیونکہ اس میں شک نہیں کہ علوم طبیعی کی ترقی کے ساتھ ساتھ مادی سلسلے میں بھی ترقی ہوئی اور عیش ونوش اور شہوت رانی کے وسائل بھی بڑھ گئے اور عام طور پر ہر شخص کے اختیار میں آگئے اور دوسری طرف ہر قسم کی کامل آزادی جو اس طرز تمدن کا خاصہ ہے لوگوں کے لئے خود بخود اخلاقیات سے اور دینی آداب سے دور ہونے کا سبب بن جاتی ہے اور لوگوں کے علمی اور روحانی رجحان کو کمزور کر دیتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ علوم طبیعی کی ترقی نے اگرچہ خدا شناسی کے راستہ کو ہموار کر دیا ہے اور اس مبداء بزرگ کو پہچاننے کے لئے کئی تازہ دلیلیں ہمارے ہاتھ آ گئی ہیں لیکن بے لگام لوگوں کی یہ ترقی اس کے غلط استعمال کے باعث ان کے اخلاق پر الٹا اثر ڈال رہی ہے اور

اسی وجہ سے موجودہ دور میں اخلاقی برائیوں اور جرائم کی تعداد میں بھی صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

چوتھا اعتراض

خدا یا طبیعی اسباب!

دوسرا اعتراض جو ڈاکٹر "سخنر" و "ہڈسن تتمل" اور "ملسکوٹ" جیسے مادہ پرست دانشوروں کے کلمات میں پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ "طبیعی قوانین اور اسباب کا اعتراف کرنے کے بعد قوانین وعلل سے بالاتر "خدا" نامی کسی موجود پر اعتقاد نہیں رکھا جا سکتا یا تو دنیا پر طبیعی قوانین و اسباب اثر انداز ہونگے یا اس سے مافوق قدرت۔ اور چونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں طبیعی قوانین پوری طرح اثر انداز ہیں اور دنیا کے تمام حوادث اور تمام موجودات عالم فطرت کے ناقابل تغیر قوانین و اسباب کے محکوم ہیں اس لئے فطرت سے مافوق کسی قدرت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ خلاصہ یہ کہ طبیعی اسباب کو موثر سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس سے اوپر کسی قدرت کو ماننا قابل قبول نہیں ہے"۔

زیادہ وضاحت کے لئے ان کے چند کلمات یہاں درج کئے جاتے ہیں:

۱۔ "ہڈسن تتمل" کہتا ہے:

"جو کچھ اس عالم ہستی میں ہے فضا میں منتشر ذرات سے لیکر انسان کی عقل تک تمام چیزیں ناقابل تغیر قوانین کے تابع ہیں اس لئے دنیا میں کوئی خالق نہیں ہے"[1]

۲۔ ایک دوسرا مادہ پرست "ملسکوٹ" کہتا ہے:

"اگر کوئی معین و مشخص موجود مادہ کو خاص ترکیب سے اپنے تسلط میں لاتا ہے اور اس پر حکومت

کرتا ہے اور اس موقع پر فطرت کے لازمی قانون کا عمل دخل ختم ہو جاتا ہے تو ہر وہ اثر جو اس اتفاق کا نتیجہ ہوتا ہے بالفاظ دیگر وہ اس خود سر ارادہ کا نتیجہ بن جاتا ہے!"[2]

۳۔ جرمن ڈاکٹر "سخنر" کتاب "قوت اور مادہ" میں کہتا ہے:

"جو لوگ پیدا کرنیوالے کی قوت کے وجود کو مادہ اور فطرت سے خارج سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس نے عالم کو اپنی ذات میں سے یا عدم سے پیدا کیا ہے تو یہ بات جو وہ کہتے ہیں علوم طبیعی کے ان بنیادی اصولوں کے خلاف ہے جس کی بنیاد تجربات و قواعد پر قائم ہے"[3]

سابقہ اعتراض کے مقابلہ میں اس اعتراض کے اندر جو فرق موجود ہے وہ اس نکتہ میں ہے کہ سابقہ اعتراض میں وہ بات کہنا چاہتے تھے کہ طبیعی اسباب کے باوجود ضروری نہیں ہے کہ اس سے بالاتر اسباب پر اعتقاد رکھیں لیکن اس اعتراض میں وہ کہتے ہیں کہ بنیادی طور پر ان دو باتوں یعنی طبیعی اسباب پر اعتقاد اور خدا پر ایمان رکھنے کے اعتقاد کو باہم جمع نہیں کیا جا سکتا اور قطعی طور پر ان دونوں میں سے کسی ایک کو قبول کرنا پڑیگا کیونکہ ان دونوں کا قبول کرنا باہم متضاد باتیں ہیں۔

﴿جواب﴾

اس اعتراض کا جواب دیتے وقت چند امور کو پیش نظر رکھنا چاہئے:

خدا بھی کتنا عجیب ہے

۱۔ یہ بیانات پھر ہمیں ایک تلخ حقیقت کیطرف (یعنی مادہ پرست لوگوں کی خدا پرستوں کے حقیقی خیالات سے ناواقفیت) کی طرف متوجہ کرتے ہیں جس کی جانب ہم نے پہلے کئی بار اشارہ کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان لوگوں نے دینداروں کے عقائد کی یا تو پوری طرح تحقیق نہیں کی یا ان دینی عقیدوں کو سادہ لوح اور ان پڑھ عوام سے حاصل کیا ہے تاہم اس میں غالباً صرف ایک پارٹی کا قصور نہیں ہے بلکہ اس اعتراض میں بنیادی طور پر نادان دینداروں کی ایک جماعت کا حصہ بھی ہے

[1] [تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں بھی پیشوایان اسلام کے سامنے ایسے اعتراضات کئے جاتے تھے]

جنہوں نے خدا کا اس طرح تعارف کرایا ہے جس سے اس قسم کے اعتراضات نے جنم لیا ہے۔ لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ ہر جماعت کے اعتقادات کو یا تو ان کے دانشوروں سے لیا جائے یا اس جماعت کی معتبر کتابوں سے نہ کہ اس جماعت کے عوام سے۔!

بہر حال یہ کلمات گواہی دیتے ہیں کہ مادہ پرست لوگ خدائے تعالیٰ کے بارے میں عجیب تصورات باندھ رکھے ہیں اور حقیقت میں ان کے اعتراضات ان ہی باطل تصورات کی بنیاد پر ہیں کیونکہ:

۱۔ ان لوگوں نے خدا کو ایک ایسی قدرت فرض کر لیا ہے جو پوری طرح فطرت کے باہر ہو اور اس سے دور اور اس سے لاتعلق ہو اور عالم فطرت بھی خود بخود معینہ اصول وقوانین کے ماتحت گردش میں رہتا ہے اور کبھی کبھی خدا اپنی غیر محدود قوت سے استفادہ کرتے ہوئی کسی گوشہ سے اعمال کے ذریعہ اپنی قدرت کا ظہار کرتا ہے او قوانین طبیعی کو درہم و برہم کر دیتا ہے اور ملسکوٹ کے قول کے مطابق ''ایک خودسرارادہ کا مالک ہے''!۔

اس بناء پر چاہئے تو یہ تھا کہ دنیا میں ایک بدنظمی قائم رہتی اور طبیعی اسباب ہمیشہ اپنے منظم کاموں میں مشغول نہ رہتے تا کہ ہمیں خدا کے وجود کا پتہ چلتا اور زیادہ واضح الفاظ میں خدا کا ماننا اس عالم فطری میں بدنظمی کو قبول کرنے کے مترادف ہے کیونکہ نظم وقوانین' مسلمہ طور پر تمام موجودات طبیعی پر حکومت کرتے ہیں پس خدا کے وجود کا کوئی محل باقی نہیں رہتا۔

۲۔ ان کا یہ خیال ہے کہ خدا تمام چیزوں کو بلاواسطہ پیدا کر دیتا ہے اور اس کا عمل' اسباب کے اصول کے مطابق نہیں ہے اور ایسے خدا کے وجود کا اقرار خواہ مخواہ مادی قوانین اور طبیعی علل واسباب کے انکار کے مساوی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ خدا کے بارے میں ان صاحبان کا تصور بہت وحشتناک ہے وہ خدا جس کیخلاف وہ لڑ رہے ہیں، اس کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہے۔ کونسے عاقل خدا پرست نے یا خدا پرستوں کی کونسی صحیح تحریر نے خدا کو ایک خودسرارادہ رکھنے والے کے طور پر متعارف کرایا کس نے اس کو ہر چیز میں راست اور بلاواسطہ اثر انداز سمجھا ہے اور کس دین میں اور کن دینداروں کے عقائد میں طبیعی علل او اسباب کو باطل

قرار دیا ہے۔

یہ بات بہت ہی حیرتناک ہے کہ یہ لوگ بغیر کسی مطالعہ اور تحقیق کے فیصلے صادر کرتے ہیں حالانکہ ہم جس چیز سے کامل واقفیت نہیں رکھتے تو (اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد بھی) ہم اس کا قطعی فیصلہ کرنے کی جرأت نہیں کرتے لیکن یہ لوگ ان باتوں میں جس کی انہوں نے کوئی تحقیق نہیں کی بغیر مطالعہ کے قطعی رائے کا اظہار کر دیتے ہیں۔ اس لئے اس اعتراض کا سب سے بہتر جواب یہ ہے کہ خدا کے بارے میں خدا پرستوں کے جو عقائد ہیں انہیں تفصیل سے بیان کر دیا جائے اور ان کے عقائد پر کافی روشنی ڈالی جائے۔

ہم کہتے ہیں: خدا ایک بے پایان موجود ہے اور وہ ایک لامتناہی قدرت ہے اور پورت قدرت رکھنے کے باوجود کبھی وہ خلاف حکمت کوئی کام نہیں کرتا۔ اور ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ موجودات کا پیدا کرنیوالا موجودات سے جدا نہیں ہے۔ ہر جگہ موجود ہے اور ہر چیز کے ساتھ ہے اس کے باوجود زمان ومکان سے پاک ہے اور اس کے لئے کوئی حد اور اندازہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔[1]

ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ قوانین طبیعی خدا ہی کا فعل ہیں اور موجودات میں نظم وضبط قائم رکھنا اسی کا کام ہے اور یہ سب چیزیں اس کے وجود کی گواہ ہیں۔

خدائے تعالیٰ نے اس طبیعی دنیا میں ہر مخلوق کے لئے ایک سبب اور ہر چیز کے لئے ایک اثر اور ایک نتیجہ قرار دیا ہے اور وہ طبیعی اسباب کے ذریعہ سے آثار کو وجود میں لاتا ہے اور علل واسباب کو علیحدہ کر کے ان کا درہم برہم کرنیوالا نہیں بنتا۔ جتنے بھی طبیعی اسباب وقوانین ہیں ان میں کا ہر ایک اس کی قدرت کا نشانہ اور اس کے ارادہ کا پرتو ہے۔[1]

ان باتوں کو پیش نظر رکھنے کے بعد اس اعتراض کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا کیونکہ طبیعی قوانین اور طبیعی طریقے کے ماننے سے نہ صرف یہ کہ ایسے خدا کی نفی نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کے وجود کو ثابت کرنے کا بہترین وسیلہ ہیں اور خلاصہ یہ کہ قوانین طبیعی اور ان کی منظم رفتار اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ مافوق فطرت کوئی قدرت ہے جو ان موجودات کی پیدا کرنیوالی اور ان کا انتظام چلانیوالی ہے۔

قوانین طبیعی کا انتظام کون کر رہا ہے؟

۲۔ جو کچھ ان کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ: وہ لوگ قوانین طبیعی کے مستقل اور نا قابل تغییر قوانین کا ایک سلسلہ سمجھتے ہیں جو خود بخود وجود میں آ گیا اور تمام موجودات اس کے تابع ہیں۔

ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ: قوانین طبیعی سے آپ کا مطلب کیا ہے؟

مجبوراً وہ یہ جواب دینگے: قوانین طبیعی وہی قوانین ہیں جو موجودات میں سے ہر ایک چھوٹے بڑے پر حکومت کرتے ہیں مثلاً: دل مقررہ طریقہ پر دھڑکتا ہے۔ دماغ کی مشنری خاص طریقہ پر کام کرتی ہے۔ نظام شمسی کے سیارے مقررہ فاصلوں پر منظم حرکتوں کے ساتھ سورج کے اطراف گردش کرتے ہیں۔ الیکٹرون اپنے منظم اور مقررہ مدار پر (نیوکلیس) کے اطراف پروانہ کی طرح گردش کرتے ہیں۔

اور پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سچ ہے کہ یہ منظم قوانین جو سرتا پا تمام موجودات جہان پر حاوی ہیں خود بخود منظم ہو گئے اور بغیر کسی نقشہ اور غور و فکر کے موجودہ صورت اختیار کر لی اور دنیا کے تمام ذرات کو اپنا محکوم بنا لیا یا یہ کہ ان کا معلول ایک فکر قوی اور عقل بے پایان ہے اور یہ تمام چیزیں ایک نقشہ اور ایک معینہ مقصد کے تحت منظم ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ وجدان اور عقل سلیم دوسری بات کو قبول کرتی ہے اور ہرگز اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم کہیں کہ: یہ طبیعی قوانین حادثات کا نتیجہ ہیں اور خود بخود موجودہ صورت اختیار کر لی ہے۔ اس بات کا ثبوت وہی برہان نظم ہے جس کا سابق میں تفصیلی ذکر ہو چکا ہے اور ہم نے یہ بات کہی ہے کہ بنیادی طور پر یہ تنظیم عقل و شعور کا پتہ دیتی ہے اور حساب احتمالات کی رو سے یہ بات محال ہے کہ ایک منظم کارخانہ کسی حادثہ کا نتیجہ ہو۔

نٹ بولٹ یا موجد اور انجینئر

۳۔ اگر یہ اعتراض سو فی صد درست ہے تو پھر تمام دنیا بھر کے موجدوں، انکشاف کرنیوالوں، تحریر کرنیوالوں اور ہنرمندوں کا انکار کرنا ہوگا۔ آپ پوچھیں گے کیوں؟

اسلئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ فلاں کارخانہ میں چرخیاں نٹ اور بولٹ اور آراستہ اور مخصوص ساز و سامان موجود ہے اور (وہ کارخانہ) ایک معینہ نظام کے ماتحت اور منظم پروگرام کے تابع چل رہا ہے اور سب مل کر اپنا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

اب ہمیں یہ کہنا چاہئے کہ: یا تو ان سائنسی قوانین نے ان چرخیوں اور اس کارخانہ کے اجزا میں سے ہر ایک کو ایک مخصوص محور کے اطراف گردش میں رکھا ہوا ہے اور انہیں ایک مخصوص کام میں لگا کر ان پر حکومت کر رہے ہیں یا ان سے بالاتر ایک انسان کی فکر و قوت (ان پر حکومت کر رہی ہے) اور ان دونوں میں کوئی ہم آہنگی نہیں ہے اور جبکہ مخصوص قوانین کا وجود ان تمام اجزاء پر حکم چلا رہا ہے قابل انکار نہیں ہے تو پھر مجبوراً ہم کو اس بالاتر قوت کا انکار کرنا پڑے گا اور کہنا پڑے گا کہ موجدوں اور انجینئروں کا وجود قطعی جھوٹ ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی شخص ایسی بات ماننے پر تیار نہ ہوگا کیونکہ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا اور اس کارخانے کے سائنسی قوانین کو وہ انسانی فکر و قوت کا نتیجہ سمجھتا ہے جس نے انہیں وجود بخشا اور وہ اس کی نگرانی کر رہا ہے، یقیناً یہی صاحب کارخانہ عالم اور قوانین طبیعی کا بھی ہونا چاہئے۔

فطرت خدا کا فعل ہے

۴۔ جس چیز کو ہم فطرت کہتے ہیں اور جسے دانشوروں نے سائنس کی مدد سے آج دریافت کر لیا ہے اور وہ اس پر نازاں ہیں۔ اس میں وہ تمام بھید شامل ہیں جنہیں عقل کی قوت نے منکشف کر دیا ہے اور وہ تمام اسرار بھی شامل ہیں جنہوں نے اپنے شاندار اور رموز سے بھرے چہرے کو فطرت کے پردے کے پیچھے نظروں سے پوشیدہ کر رکھا ہے اور اپنے بیقرار عاشقوں کو یعنی دانشوروں اور مفکروں کے طبقہ کو مسلسل دوڑ دھوپ میں مصروف رکھا ہوا ہے اور یقینی طور پر (پوشیدہ اسرار) اس سے لاکھوں گنا زیادہ ہیں جو دریافت ہو چکے ہیں۔ ہاں! یہ سارا کام خدا کا کام ہے اور خدا کا منشاء ہے اور خدا کا ارادہ اور اس کی مشیت ہے۔ ان میں سے نہ کسی کا وجود از خود ہے نہ کسی کا ارادہ۔

قانون کشش ثقل اور مرکز سے گریز کی قوت نے اگرچہ کہ ستاروں کو ان کے مدار میں رکھ کر ان کی منظم گردش کو جاری رکھا ہوا ہے لیکن اس کے باوجود ان میں نہ کوئی ارادہ ہے اور نہ اختیار اور وہ اپنے آثار و نتائج سے بھی بے خبر ہیں۔ نہ صرف یہ دو قانون بلکہ تمام بے جان فطرت "دو سالہ بچے" کے برابر بھی

عقل و ہوش اور ارادہ و اختیار نہیں رکھتی اس کے ساتھ ہی یہ تمام قوانین ایک حیرتناک تنظیم کے ساتھ اور غیر معمولی قوت سے ایک سوچ سمجھے پلان اور ایک معین مقصد کے ماتحت اپنے اہم فرائض منصبی کی انجام دہی میں مصروف رہتے ہیں۔

صاحبان! یہ وہ چیزیں ہیں جنھوں نے اس علم و قدرت کے مبداء بزرگ کی طرف ہماری رہنمائی کی۔ یہ تمام چیزیں کائنات کے اس مبداء بزرگ کے وجود کی گواہ ہیں یہ چیزیں خاموش ہونے کے بعد بھی ہزاروں زبانیں رکھتی ہیں اور ہر زبان سے اپنے پیدا کرنیوالے کے علم و حکمت کی تفسیر بیان کرتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں اسی سے وابستہ ہیں اور اسی کی مطیع و فرمانبردار ہیں۔

اندھی بہری فطرت جو عقل و شعور اور ارادہ سے محروم ہے۔ وہ اس قابل بھی نہیں کہ ایک مرتب مٹی کا کرہ پریشان اور بے ترتیب حادثہ کے ذریعہ بنا سکے تو پھر یہ کہاں ممکن ہے کہ وہ ایسے حقیر اور پست موجود کو جو آنکھ سے دکھائی بھی نہیں دیتا اور جس کا نام ''نطفہ'' ہے اسے اسقدر پرورش کرے اور عظمت بخشے کہ وہ ایک صاحب فکر انسان بن جائے اور فضا کو اپنی جولانگاہ بنالے۔

ایسی دنیا جس کے اسرار کے مقابلہ میں تمام دانشور عاجز ہیں اور اسی کے ایک راز کا انکشاف ہی ایک دانشور کے لئے کافی ہے کیونکہ اس سے ہمیشہ کے لئے اس کا سر فخر سے بلند اور اس کا نام ہمیشہ کے لئے عزت کے ساتھ تاریخ انسانی میں بحیثیت ایک عظیم کاشف یا ایک عظیم موجود کے لکھ دیا جاتا ہے۔

ہاں! ایسی دنیا کسی بے روح مادہ اور کسی بے شعور فطرت کا معلول (نتیجہ) نہیں ہو سکتی۔ یہ فطرت خدا کا فعل ہے نہ کہ اس سے علیحدہ کوئی چیز۔

پانچواں اعتراض

کیا بدنظمی آفات اور بلائیں

انسان کو الحاد کی طرف لے جاتی ہیں؟؟

یہ وہ باتیں ہیں جنھوں نے عقل کو حیران کر دیا ہے۔

انسانی علوم کی قدر و قیمت

''میں نہیں جانتا'' اور ''نہیں ہے'' کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟

براہ کرم اس سوالنامہ کی خانہ پری کیجئے۔

میں نامعلوم باتوں کے متعلق دس سال تک سوالات پوچھ سکتا ہوں لے

دوسرا اعتراض جو قدیم زمانہ سے مادہ پرستوں کی جانب سے زور و شور سے اٹھایا جاتا ہے وہ آفتوں اور بلاؤں کا مسئلہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر جہانِ ہستی کے وسیع کارخانہ کی بنیاد ایک دانا اور قادر مبداء کے ارادہ کے تابع ہے اور اس عظیم کارخانہ کی تمام مشنری جس کا نام ''جہانِ خلقت'' یا ''طبیعت'' ہے صحیح اور حکیمانہ انداز سے کام کر رہی ہے تو کیوں وقت بے وقت کسی باد نسیم (کے چلنے سے زمانہ کے کاروبار درہم و برہم) ہو جاتے ہیں؟ اور کیوں طوفان اور سیلاب اور زلزلے اس کمزور موجود کے ناتوان جسم میں جسے انسان کہا جاتا ہے لرزہ پیدا کر دیتے ہیں اور اس کی زندگی اور اس کے آرام کے محل کے کسی حصہ کو اپنے قدموں تلے روند دیتے ہیں؟ مصائب اور تکلیفیں اس کی لطیف روح کو روزانہ کیوں مجروح کرتی رہتی ہیں۔ آخر کیوں اور کس لئے؟۔

اگر ہم یہ کہیں کہ دنیا کا یہ وسیع میدان طبیعی اندھے اور بہرے قوانین کی بھاگ دوڑ کا میدان ہے تو اس کیوں اور کیسے کا جواب دینا بہت آسان ہو جائے گا۔ فطرت جو کبھی ''غضبناک'' ہو جاتی ہے اور کبھی ''مہربان اور صلح جو'' اور ہر حال میں خواہ وہ غصہ کی حالت میں یا صلح کی حالت میں خود اس سے بے خبر رہتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کا اعتراض ان پر لوٹ جاتا ہے لیکن اگر ہم اس دنیا کے تمام واقعات و حادثات کو جو پہاڑ سے لیکر ذرہ تک سے متعلق ہوں ایک حکیمانہ اور صحیح نقشہ کے مطابق سمجھیں تو اس کیوں اور کیسے کا جواب مشکل ہو جاتا ہے۔

شاید ان ہی عمدہ عوامل میں سے کوئی ایک عامل اس مسلک کے چند مادہ پرستوں کی توجہ کا مرکز رہا ہو جن کی تحریروں میں ان کی مختلف عبارتیں خواہ وہ نظم میں ہوں یا نثر میں ہمیں نظر آتی ہیں حتیٰ کہ عرب کے ایک شاعر نے اس مسلک کی طرف اپنے میلان کا اظہار کیا ہے۔

هذا الذی ترک الادهام حائرة وصیر العالم النحریر زندیقا

''یعنی یہی وہ بات ہے جس نے عقلوں کو حیران کر دیا ہے اور ماہر دانشوروں کو الحاد کی طرف گھسیٹ لیا ہے''۔

واحد چیز جس کا آخری اور موجودہ دور کے مادہ پرستوں نے اپنے اعتراض میں اضافہ کیا ہے وہ بدنظمی کا اور زائد اعضا کا موضوع ہے (یقیناً ان کے لحاظ سے) وہ لوگ موحدوں اور خدا پرستوں کے

لے [بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو محسوس نہیں ہوتیں لیکن ان کی حقیقت اب کسی دانشور سے پوشیدہ نہیں رہی۔ ہمارے کرۂ زمین پر مختلف حرکتیں موجود ہیں جن کے منجملہ ''مدوجزر'' بھی ہے جو زمین کی سطح پر ہوتا ہے اور اس کے اثر سے ہمارے پاؤں کے نیچے کی زمین کا حصہ روزانہ دوبار تقریباً ۳۰ سنٹی میٹر اونچا ہو جاتا ہے اور کوئی ایسی علامت موجود نہیں ہوتی جس سے اس مدوجزر والی حرکت کا پتہ چل سکے۔

دوسری چیز ہوا ہے جو ہمارے اطراف موجود ہے جس میں غیر معمولی وزن اور سنگینی ہے اس طرح کہ ہر انسان کے بدن کو تقریباً ۱۶ ہزار کلو میٹر گرام وزنی (ہوا) کا بوجھ برداشت کرنا پڑتا ہے اور ہمیشہ ایک عجیب دباؤ کے تحت رہتا ہے لیکن جب تک یہ دباؤ ہمارے بدن کے اندرونی دباؤ کے برابر رہتا ہے ہمیں اس سے کوئی تکلیف نہیں پہنچتی حالانکہ کسی شخص کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ہوا میں بھی وزن موجود ہوگا۔ ''گیلیلو'' اور ''پاسکال'' سے پہلے یہ بات تمام لوگوں سے پوشیدہ تھی اور اب بھی بلکہ سائنس اس کی صحت کی تصدیق کرتی ہے حواس اس کو نہیں دیکھ سکتے۔ اور ایسی غیر محسوس چیزیں ہیں جن کے وجود کے بعض ماہرین طبیعیات معترف ہیں وہ ان لوگوں کے خیال کے مطابق ایک ''اثر'' ہے جس نے تمام جگہ کا اور تمام چیزوں کا احاطہ کیا ہوا ہے اور ان میں سے چند' اسے تمام موجودات کی اصل سمجھتے ہیں اور اس طرح اس کی تشریح کرتے ہیں کہ ایک موجود ہے جس کا کوئی وزن نہیں ہے جس میں کوئی بو نہیں ہے وہ بے رنگ ہے اور تمام ستاروں کے درمیانی حصہ کو اور تمام جگہ کو پُر کیا ہوا ہے اور تمام چیزوں کے اندر اس کا اثر ہے اور طبیعی طور پر ہمارے لئے قابل ادراک نہیں ہے]

عقیدے کے برخلاف کہتے ہیں کہ قانون نظم ایک عام اور عالمگیر قانون نہیں ہے ہم کبھی اس جہان کے کسی گوشہ اور کنارہ میں کوئی بدنظمی دیکھتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ان کی پیدائش میں کوئی ہدف اور کوئی مقصد موجود نہ تھا۔ مثلاً بعض حیوانات میں ہم زائد اعضا دیکھتے ہیں جنہیں زندگی میں ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ڈاکٹر ''مخبر آلمانی'' جو ان مادہ پرستوں کے کٹر طرفداروں میں سے ہے کہتا ہے:

لے [اس بات کی تائید کے لئے اگر ہم ''کامیل فلاماریون'' کے اقوال سے چند جملے جو اس نے کتاب (اسرار مرگ) میں لکھے ہیں آپ کے سامنے پیش کر دیں تو کوئی قباحت نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے:

''لوگ جہل اور نادانی کی وادی میں زندگی گزار رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ انسان کی یہ جسمانی ترکیب اس کی رہبری حقیقت کی طرف نہیں کر سکتی اور یہ حواس خمسہ اس کو ہر چیز میں دھوکہ دیتے ہیں اور واحد چیز جو انسان کو حقیقت تک پہنچاتی ہے وہ عقل و فکر اور علمی باریک بینی ہے''

اس کے بعد وہ ان امور کا ذکر شروع کرتا ہے جن کے ادراک سے حواس عاجز ہیں۔ ان میں سے ایک ایک کو بیان کر کے ہر حس کے محدود ہونے کو ثابت کرتا ہے حتیٰ کہ وہ بیان کرتا ہے:

''پس نتیجہ یہ نکلا کہ آج کی ہماری عقل اور ہماری سائنس ہمیں اس بات کا قطعی پتہ دیتی ہے کہ ذرات' ہوا اشیاء اور قوتوں کی بعض حرکتیں ایسی موجود ہیں جنہیں ہم نہیں دیکھ سکتے اور حواس خمسہ میں سے کسی ایک ذریعہ اس کو محسوس نہیں کر سکتے۔ اس بناء پر اس کا امکان ہے کہ ہمارے اطراف ان کے سوا بھی دوسری چیزیں موجود ہیں اور زندہ اور ذی حیات موجودات وجود رکھتے ہوں جنہیں ہم محسوس نہیں کر سکتے میں یہ نہیں کہتا کہ وہ موجود ہیں بلکہ یہ کہتا ہوں کہ ممکن ہے موجود ہوں۔ اسلئے کہ سابقہ بیانات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہم جس چیز کو محسوس نہیں کر سکتے اس کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ نہیں ہے پس جبکہ سائنس کی رو سے ہم پر پوری طرح ثابت ہو چکا کہ یہ ظاہری حواس اس بات کی قابلیت نہیں رکھتے ہر چیز ان پر منکشف ہو جائے بلکہ یہ ہمیں کبھی دھوکہ دے جاتے ہیں اور خلاف واقعہ بات ہمیں بتاتے ہیں۔ ہمیں یہ تصور نہ کرنا چاہئے کہ موجودات کی تمام حقیقتیں اسی بات پر منحصر ہیں جسے ہم محسوس کرتے ہیں بلکہ ہمیں چاہئے کہ اس کے خلاف عقیدہ رکھیں اور کہیں کہ ممکن ہے موجودات ہوں جنہیں ہم محسوس نہیں کر سکتے کیونکہ مائیکروب کے دریافت ہونے سے پہلے کوئی یہ نہ خیال کرتا

""اگر مختلف عالموں کی خلقت اور پیدائش اور انسانوں اور حیوانوں کا مسکن اور ٹھکانا ایک ہی مبداء کے ذمہ اور قدرت کے ہاتھ میں اور اس کے اختیار میں ہوتا اور (یہ تمام کام) اسی کے ذریعہ انجام پذیر ہوتے تو اس وسیع فضا کو (جو ہر چیز سے خالی ہے اور اس میں کوئی چیز قابل استفادہ موجود نہیں ہے اور اس (علاقہ) کو گوناگوں ستاروں اور سیاروں نے اپنی دوڑ دھوپ کا میدان اور جولانگاہ بنایا ہوا ہے) کس غرض سے پیدا کیا۔ نظام شمسی کے دوسرے کرے ہمارے روئے زمین کی طرح انسانوں جیسے افراد کے لئے قابل استفادہ کیوں نہیں ہیں؟ بعض دوسرے (معترضین) نے بعض جانداروں کی نہ دیکھنے والی آنکھوں کی موجودگی پر اعتراض کیا ہے جو کہ تاریک غاروں میں زندگی بسر کرتے ہیں اور اسی طرح ان کو مردوں کی پستانوں پر اور ان جیسی بعض چیزوں پر اعتراض ہے اور انہوں نے ان چیزوں کو اس مقصد کے لئے گواہ بنایا ہے۔

مادہ پرستوں کے برخلاف اور برعکس بحثیں

سچ تو یہ ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ ان لوگوں سے کس قسم کی گفتگو کریں۔ اگر آپ بھول نہ گئے ہوں تو ان صاحبان کے سابقہ اعتراض میں ہم نے دیکھا تھا کہ انہوں نے اس میں نظم جہان ہستی اور فطرت کے ناقابل تغیر قوانین کو عالم کے مبداء علم وقدرت کے انکار کی دلیل کے طور پر پیش کیا تھا اور ان کا ارادہ خدا کو بدنظمیوں میں یا بقول ان کے ان امور کی انجام وہی میں ایک خودسرانہ ارادہ کے طور پر ظاہر کرنے کا تھا اور دنیا کے علل ومعلول کے انتظام کو فطرت کے مستقل ہونے اور فطرت سے بالا کوئی قوت اور کوئی

تھا کہ کڑوروں مائیکروب ہر جسم کے اطراف موجود ہونگے اور ہر ذی حیات کی زندگی ان کی جولانگاہ قرار پائے گی"۔

نتیجہ یہ کہ ظاہری حواس اس بات کی صلاحیت نہیں رکھتے کہ موجودات کی حقیقت کو ہمیں بتا سکیں اور وا حد چیز جو دقائق سے ہمیں آگاہ کرتی ہے وہ ہماری عقل اور فکر ہے۔ (نقل از علی اطلال المذہب المادی، تالیف فرید وجدی، ج ۴)]

۱ [یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آلات طبیعی اور اسباب طبیعی کے خدا کے وجود کا ادراک کرنے سے عاجز ہو جانے پر کس طرح اس کے وجود پر ایمان لایا جائے؟ اس سوال کا جواب واضح ہے جیسا کہ تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے۔ ہر موجود کو اس کے آثار سے شناخت کیا جا سکتا ہے اور پہچانا جا سکتا ہے اور دلیل نظم اور حساب احتمالات کی رو سے جس کی تشریح کتاب کے ابتدائی حصہ یں گزر چکی ہے۔ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ یہ تمام موجودات ایک سرچشمہ علم وقدرت کے آثار ہیں جس نے اس وسیع اور پر اسرار دنیا کو پیدا کیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری بہت سی عقلی دلیلیں بھی موجود ہیں جو ہمیں اس کے وجود سے پوری طرح آشنا کرتی ہیں۔ (سابق میں ان میں سے چند باتوں کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے]

۲ [مادہ پرست ماہرین خود بھی ایسے موجودات کے قائل ہیں جن کا انہوں نے تجربہ سے اور قوت حسی سے ادراک نہیں کیا ہے اور خدا پرست لوگ خدا کے بارے میں جن صفات کے قائل ہیں یہ (مادہ پرست) ان سے ناواقف ہیں۔

منجملہ ان کے ایک "اثر" ہے جس کو وہ مادہ پرست امواج نور کا حامل سمجھتے ہیں اور اپنی مشکلات کو اسی سے حل کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں "اثر" ایک غیر مادی موجود ہے (علوم طبیعی کے لحاظ سے نہ کہ از روئے فلسفہ) جس میں نہ بو ہے اور نہ وہ دیکھا جا سکتا ہے اور نہ حواس سے اس کا ادراک کیا جا سکتا ہے نہ اس کا آغاز ہے اور نہ انجام۔ وہ ابدی ہے اور تمام روئے زمین اور تمام موجود اسی سے مملو ہیں۔ وہ تمام کی اصل اور تمام کا سرچشمہ ہے اور تمام موجودات کا خلاصہ ہے اور نہایت لطیف ہے جس کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا اور وہ کسی ذریعہ اور کسی وسیلہ سے قابل ادراک نہیں ہے۔ آپ پوری طرح غور کیجئے کہ خدا پرست لوگ خدا کی جن خاص صفات کے معتقد ہیں وہ ماہرین طبیعیات بھی اثر (یا فرضی وخیالی موجود) کے لئے ان تمام باتوں کے معتقد ہیں یہاں تک کہ بعض ماہرین طبیعیات اس کو عالم ہستی کا خدا اور ان تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا سمجھتے ہیں۔ "ارنسٹ ہیکل" جیسے مشہور دانشور نے بعض ایسی چیزوں کا پتہ چلایا ہے جن کا اس سے پہلے پتہ نہ چلایا جا سکا تھا اور صرف آثار سے ان کو پہچانا ہے اور کوئی شخص ان کے وجود سے اور ان میں حیات وزندگی کی موجودگی سے انکار نہیں کر سکتا جیسا کہ اس بارہ میں "کلوڈبرنارڈ" کا قول سابقہ بحثوں میں نقل کیا جاچکا ہے۔

کتاب "حیوانی فزیالوجی" میں یہ عبارت موجود ہے:

"زندگی کی کوئی تعریف نہیں کی جا سکتی لیکن تجربہ سے اور مشاہدہ سے زندگی کے مظاہر اور آثار سے اور ان مظاہر کی رنگارنگی سے اس کا پتہ چلایا جا سکتا ہے"۔

ارادہ نہ ہونے، دلیل کے طور پر ہمارے سامنے پیش کرنے کا تھا۔

اب جبکہ ہم نے واضح اور روشن منطق کے ذریعہ یہ بات ثابت کردی ہے کہ ان صاحبان نے خدا پرستوں کے عقیدے کے بارے میں غیر معمولی غلطی کی ہے اور وہ خدا جس کی مخالفت کے لئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں وہ بالکل خارجی وجود نہیں رکھتا اور فطرت کے یہ مستقل انتظامات اور نا قابل تغیر قوانین نہ صرف یہ کہ اس مبداء بزرگ کے وجود کی نفی نہیں کرتے بلکہ وہ اس کے وجود کی روشن ترین اور قطعی دلیل ہیں وہ (مادہ پرست) لوگ بات کو بالکل الٹ کر اور بدنظمی کے موضوع کو پیش کر کے کہتے ہیں: اتفاق کی بات ہے کہ اس جہان فطری کا انتظام اس قدر مستقل اور درست نہیں ہے جس پر آپ تکیہ کر سکیں بلکہ اس کے ہر گوشہ سے اس کے بے مقصد ہونے اور بغیر پلان کے ہونے کے آثار ظاہر ہورہے ہیں۔

بہت اچھا! جب بات ایسی ہی ہے تو ہم بھی ان کے قدم بہ قدم چلتے ہیں اور وہ اپنے عقیدے کو ثابت کرنے کے لئے جو طریقہ اختیار کرینگے ہم بھی اسی طریقہ سے ان کے ساتھ بحث میں شامل ہوجائیں گے۔سابقہ اعتراض کو بالکل نظرانداز کرتے ہوئے ہم فرض کرتے ہیں کہ موجودہ اعتراض ہی پہلا اعتراض ہے جو ہمارے درمیان زیر بحث ہے اس لئے ہم آپ کی توجہ حسب ذیل چند باتوں کی

ایک ماہر طبعیات کہتا ہے:

''ہم خلیات کا تجزیہ اور تحلیل کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کا کوئی اور دوسرا حصہ بھی ہے جو ان اجزاء کو وجود بخشنے والا ہے لیکن وہ کون ہے ہم نہیں جانتے''۔

ایک دوسرا دانشور کہتا ہے:

''زندگی کے حالات دراصل ایک دور دراز واقع سمندر کی طرح ہیں جس کی موجیں دیکھی جاسکتی ہیں اور ہم صرف اس کی چمک سے استفادہ کرسکتے ہیں''۔

ماہرین طبعیات کے زندگی کے بارے میں یہ مختصر بیانات جن میں انہوں نے اس کی (زندگی کی) حقیقت سے اپنی کامل ناواقفیت کا اعتراف کیا ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس کی حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا]

جانب مبذول کراتے ہیں:

انسانی علوم کی قدر و قیمت

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کسی چیز کے مفید ہونے یا مفید نہ ہونے کا کس طرح پتہ چلے اور اس کو ناپنے کا آلہ کونسا ہے؟ مثلاً اسی بات کو لیجئے کہ لامحدود فضا کے بارے میں جو بے شمار ستاروں کی جولانگاہ ہے ہماری معلومات غیر معمولی سطحی ہیں یا نظام شمسی کے فلاں سیارہ کے بارے میں جس کے متعلق ہم نسبتاً زیادہ معلومات رکھتے ہیں یا غار میں رہنے والے حیوانات کی نابینا آنکھوں کے وجود کے بارے میں کہ وہ فائدہ مند ہیں یا بے فائدہ ہمیں کس طرح پتہ چلے؟

وہ یقیناً یہی بات کہتے ہیں کہ: ''جہاں تک ہم جانتے ہیں اور ہماری عقل کام کرتی ہے اور جہاں تک ہم انسانی عقل کے تیز رفتار گھوڑے پر آگے گئے ہیں ہمیں ان موضوعات کے فائدہ کا پتہ نہیں چلا اسی لئے ہم اپنے پانے یا نہ پانے کو ہونے یا نہ ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں اور بالفاظ دیگر ہماری نظر میں فائدہ کی تشخیص یا عدم تشخیص ہی ان کے وجود یا قطعی معدوم ہونے کا پیمانہ ہے۔

بہت اچھا! ہم بغیر اس کے کہ اس پیمانے کی اہمیت کے بارے میں کوئی گفتگو کریں ہم ان صاحبان سے صرف اس قدر گزارش کرتے ہیں کہ آج کے بعد سے وہ اس جملہ ''فائدہ نہیں رکھتا'' کی بجائے یہ کہیں کہ ''ہمیں اس میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا''۔کیونکہ یہ بات زیادہ صحیح اور احتیاط سے نیادہ قریب ہے۔ظاہر ہے کہ ان دو جملوں کے درمیان کافی فرق ہے۔ ہر صورت میں اس جملے بدلنے سے ان صاحبان کے اعتراض کی صورت بالکل بدل جائے گی اور ایک ''نفی مطلق'' کے روپ میں سے ''نہ جانے'' کی ایک شکل باہر آجائیگی یعنی جہاں کہیں وہ کہتے ہیں ''فائدہ نہیں رکھتا'' ان کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ انہیں اس کے فائدے کا کوئی پتہ نہ چلا۔اب اس سوال کی باری ہے کہ ہمارا کسی چیز کے نہ پانے یا کسی چیز کے بارے میں ہماری ناواقفیت اس کے بے فائدہ ہونے کی دلیل ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اس سوال کا صحیح جواب حاصل کرنے کے لئے ہمیں پہلے اس سوال نامہ کو پُر کرنا پڑے گا:

براہ کرم اس سوال نامہ کی خانہ پری کردیجئے!!

۱۔ کیا انسان کی معلومات محدود ہیں یا غیر محدود۔ یقیناً اس سوال کے جواب میں ہم لکھیں گے کہ محدود ہیں کیونکہ پوشیدہ چیزوں کے بارے میں انسان کی موجودہ معلومات نہایت ہی کم اور بے حقیقت ہیں اور ہر سائنسی حل شدہ مسئلہ کے اطراف ہزاروں غیر حل شدہ مسئلے بھی موجود ہیں جن پر سے دانشوروں کی غیر معمولی کوششوں سے رفتہ رفتہ پردے اٹھ رہے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ موجودہ دریافت شدہ چیزوں اور غیر دریافت شدہ چیزوں کا تناسب قائم کریں تو اس نتیجے میں ایک اتنی چھوٹی کسر حاصل ہوگی جو صفر سے کچھ زیادہ بڑی نہ ہوگی۔

ہم ہر چیز کے مقابلہ میں خود اپنے سے زیادہ قریب ہیں اور تمام چیزوں سے زیادہ ہمارے قریب ہماری زندگی اور حیات ہے اور بکمال افسوس کے ساتھ ہمیں یہ اعتراض کرنا پڑے گا کہ ہم نے ابھی تک ان کی حقیقت سے تھوڑی سی بھی واقفیت حاصل نہیں کی۔ ایک دانشور کہتا ہے:

''جانداروں کی زندگی اوران کی حیاتی کیفیت ایک وسیع اور کشادہ سمندر کی طرح ہے کہ ہم دور سے اس کی موجوں کی چمک کو دیکھتے ہیں''۔

یا فرانسیسی عظیم دانشور ''الکسیس کارل'' کے قول کے مطابق جیسا کہ وہ کتاب ''انسان موجود نا شناختہ'' (نہ پہچانا ہوا موجود انسان) میں لکھتا ہے:

''واقعی انسان سرتاپا رازوں کا مجموعہ اور مبہم حیثیت کا مالک ہے کیونکہ اسے آسانی سے نہیں پہچانا جا سکتا حتیٰ کہ وہ کہتا ہے:

۱۔[جو کچھ مسلم اور قطعی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی مخلوق و موجود بغیر کسی اسباب کے وجود میں نہیں آیا اور بروئے فلسفہ یہ مسلمہ امر ہے کہ علت سے معلول کا جدا ہونا ناممکن ہے۔ اس بنا پر اب یہ مسئلہ نزاعی نہیں رہا کیونکہ خدا پرست لوگ حوادث کے طبیعی اسباب کے معتقد ہیں اور ان کی نظر میں موجودات اپنی تاثیر کے اثرات کی وجہ سے طبیعی قوانین اور طبیعی پیمانوں کے پابند ہیں لیکن اس کے علاوہ وہ ان تمام طبیعی عوامل اور اسباب اور مسلمہ طبیعی قوانین کو ماورائے طبیعت اور غیبی طاقت کے زیر اثر سمجھتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہی ان سب اسباب کا پیدا کرنے والا ہے]

حقیقت میں اپنے متعلق ہماری لاعلمی زیادہ ہے اور ہم ابھی تک اپنی اندرونی دنیا کے وسیع علاقوں سے ناواقف ہیں اور انسانی زندگی کی تحقیق کرنیوالے اور مطالعہ کرنیوالے بہت سے محققین جن باتوں کے متعلق سوالات کرتے ہیں وہ بغیر جواب کے ہی رہ جاتے ہیں''

علوم طبیعی کے ماہر کہتے ہیں کہ آج ہم نے کافی مطالعہ کے بعد اصل تشکیل دینے والے جزء ''خلیہ'' (وہ سب سے چھوٹا موجود جو زندگی کی مستقل وحدت کی تشکیل کرتا ہے) کو پہچان لیا ہے اور جس طرح کہ ہم ایک خلیہ کا تجزیہ کر سکتے ہیں اور اس کے اجزاء اور مواد کو ایک دوسرے سے جدا کر سکتے ہیں اسی طرح ہم پیچیدہ ترکیب سے سابقہ صورت بھی بحال کر سکتے ہیں لیکن ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ ہم اس میں زندگی کو واپس نہیں لا سکتے۔ یہ حیات کیا ہے اور کیسی ہے؟ ہم نہیں جانتے!۔

۲۔ کیا علوم انسانی اپنے کمال کی ممکنہ آخری حد تک پہنچ چکے ہیں یا ابھی تکمیل کا راستہ طے کر رہے ہیں؟

اس سوال کے جواب میں بھی ہمیں بلا جھجک لکھ دینا چاہئے کہ اب اور ہمیشہ ہم اپنی پیش قدمی جاری رکھیں گے۔ علوم کی تکمیل کی رفتار میں کبھی کوئی کامل رکاوٹ حائل نہ ہوتی صرف اتنا ہوا کہ اس کی رفتار کبھی کچھ زیادہ سست ہوگئی اور کبھی کچھ زیادہ تیز اور اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ابد تک کبھی اس میں کوئی وقفہ پڑے گا۔ ہر سال اور ہر ماہ اور ہر دن جو گزرتا ہے ہماری معلومات میں تازہ باتوں کا اضافہ ہوتا جاتا ہے اور ہمارے علوم کا ذخیرہ بڑھتا جاتا ہے۔

۳۔ اب تک جن باتوں کا انکشاف ہو چکا ہے کیا اس کی پہلے پیشین گوئی کی جا سکتی تھی۔ مثلاً ۵۰۰ سال پہلے کئی ہزار کلوگرام وزنی راکٹ کو فضا (خلاء) کے باہر بھیجنا اور ایک عظیم فضائی پلاٹ فارم کا سیارۂ زہرہ کی جانب قائم کرنا قابل تصور یا قابل پیش بینی تھا؟ اگر کوئی دانشور قیاس اور فرضی طور پر بھی اس قسم کی کوئی بات کرتا تو اس کی ہنسی نہیں اُڑائی جاتی تھی اور اس کے دماغ کو اعصابی امراض کا شکار نہیں سمجھا جاتا تھا؟ اور کیا ان موجودات کا وجود جو صرف ذرہ بین کے ذریعہ سے ہی دیکھا جا سکتا ہے اور خود ایٹم کی غیر معمولی طاقت اور اس جیسی صدہا مثالوں کے بارے میں گزشتہ زمانے میں کسی کے دل میں ایسا خیال بھی گزر سکتا تھا۔؟

قطعی طور پر اس کا جواب نفی میں ہوگا۔

۴۔ کیا آپ یہ بات تسلیم کریں گے کہ آئندہ دس سال' سو سال' ہزار سال' دس ہزار سال میں انسان کے لئے جو جو نئی چیزیں (اگر عمر باقی رہی اور تیسری جنگ اسے خاک اور راکھ کا ڈھیر نہ بنا دے) ایجاد ہونگی آج آپ ان کا تصور بھی مشکل سے کر سکتے ہیں اور وہ کسی طرح قابل پیشں گوئی نہیں

۱۔ [﴿اللّٰهُ الَّذِی یُرسِلُ الرِّیَاحَ فَتُثِیرُ سَحَاباً فَیَبْسُطُهُ فِی السَّمَآءِ کَیفَ یَشَآءُ وَ یَجعَلُهُ کِسَفاً فَتَرَی الوَدْقَ یَخرُجُ مِنْ خِلاٰلِهٖ﴾ (روم/۴۸) "اللہ وہ ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے تا کہ وہ ابر کو اٹھائیں پھر اللہ تعالیٰ اس (ابر) کو جس طرح چاہتا ہے آسمان میں پھیلا دیتا ہے اور اس کے ٹکڑے کر دیتا ہے پھر تم بارش کو دیکھتے ہو جو اس کے اندر سے نکلتی ہے"۔

اس آیت میں آسمان کی طرف ابر کی حرکت کا سبب اسی ہوا کے چلنے کو بتایا گیا ہے اور اسی طرح بارش کے ہونے کا سبب ایک منظم اور خاص حساب کو بیان کیا گیا اور قدرت کے نشانہ اور خدا شناسی کو اسباب طبیعی کے سلسلہ سے وابستہ کیا ہے۔

اور دوسری آیت:

﴿وَتَرَی الاَرضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنزَلنَا عَلَیهَا المَآءَ اهتَزَّت وَ رَبَت وَاَنبَتَت مِن کُلِّ زَوجٍ بَهِیجٍ﴾ (حج/۵) "تم زمین کو دیکھتے ہو خشک اور افسردہ پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو اس میں جنبش و حرکت پیدا ہوتی ہے اور وہ پھولتی ہے اور ہر قسم کی خوشنما زوج وار نباتات اگاتی ہے"۔

یہ آیت بھی نباتات کی پیدائش' بارش اور پانی کی تاثیر اور زبان کی تبدیلی کے بارے میں تفصیلات بیان کرتی ہے۔ اور اسے خدا کو پہچاننے کا ذریعہ قرار دیتی ہے۔ اور اگر آپ چاہتے ہوں کہ بالکل واضح طور پر خدا پرستوں کی باتوں سے اس حقیقت کا پتہ چل جائے تو دینی کتابوں اور ان احادیث کی طرف رجوع کیجئے جن میں خدا کی عظمت اور قدرت کو بطور اسباب طبیعی بیان کیا گیا ہے اور بنیادی طور پر بلغ مذہبی پیشواؤں کے جملوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ خدا نے ہر موجود اور ہر مخلوق کو پیدا کرنے میں علل و اسباب سے ہی ابتدا کی تھی۔ ایک مشہور روایت کے مطابق جس میں کہا گیا ہی: "ابی اللّٰہ ان یجری الامور إلّا باسبابها"۔ "خدائے تعالیٰ کسی امر کو جاری کرنے سے انکار کرتا ہے مگر اس کے اسباب کے ذریعہ سے"]

ہیں۔ افسوس ہے ہماری معلومات پر کہ ہمارے آج کے عالی مقام اور محقق ڈاکٹروں کی معلومات کی قیمت اس زمانے کے پہلی کلاس کے چھوٹے سے لڑکے کی معلومات کے مقابلہ میں بھی کوئی وقعت نہ رکھیں گی۔ اگر ہم ان سوالات کے جوابات جرأت کے ساتھ نہ لکھ سکیں تو کم از کم اتنا تو لکھیں کہ اس بات کا قوی امکان ہے۔

ہم اس سوالنامہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ علوم حاضرہ نے ہم پر جن چیزوں کا انکشاف کیا ہے اگر چہ وہ ہر لحاظ سے قابل استفادہ ہیں لیکن ہم اپنے مجہولات (نامعلوم چیزوں) کے بارے میں ایک یکطرفہ اور قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے اور اگر "سائنس" کسی چیز کو دریافت کرنے سے عاجز رہ جائے تو ہم اس عدم دریافت پر بھروسہ نہیں کر سکتے اور اسے انکار کے ایک آلہ کے طور پر استعمال نہیں کر سکتے۔ اگر سائنسی علوم کسی چیز کی وضاحت کرنے سے عاجز ہو جائیں تو اس کو بے اثر اور بے فائدہ نہیں کہا جا سکتا اور یہ نشان (لیبل) اُن پر چسپاں کیا جا سکتا ہے جس طرح کہ موجودہ معلومات کے بارے میں اور علوم فضائی وغیرہ کے غیر معمولی ترقی کے بارے میں ہم گزشتہ زمانے میں پیش بینی نہیں کر سکتے تھے تو اس بات کے ماننے میں اب کونسا امر مانع ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ ان ہی موجودات کے اسرار و فوائد کے بارے میں جو ہماری ناقص معلومات کے لحاظ سے بے فائدہ سمجھے جا رہے ہیں آئندہ ان پر کتابیں لکھی جائیں گی۔

ایک ہوشیار دانشور کے لئے ضروری ہے کہ اس دنیا کے بارہ میں نہایت احتیاط سے قدم اٹھائے کیونکہ سابقہ تمام تجربات اور معلومات نے ہمیں یہ بنیادی نکتہ سمجھا دیا ہے کہ یہ کارخانہ ایک سادہ اور معمولی کارخانہ نہیں ہے۔ ایٹم کے اندر کے عجیب اسرار سے لیکر انسان کے دل' آنکھ اور اعصاب تک تمام چیزیں ہمیں یہ دلاس دیتی ہیں کہ اس دنیا کے بھید اس سے بھی بہت زیادہ پیچیدہ اور زیادہ مشکل ہیں جتنا کہ ہم انہیں خیال کرتے ہیں۔

اس کارخانہ کی تعمیر میں جو قدرت اور عقل استعمال ہوئی ہے اس کے مختلف پہلوؤں کے مطالعہ کے بعد ہماری عقل عاجز ہو گئی ہے اور یہ بات اُن اسرار و رموز کے بارے میں ہر قسم کی بے احتیاطی کرنے اور

جلد بازی سے فیصلہ کرنے سے ہمیں روکتی ہے۔

غلطی نہ کیجئے! کیونکہ ہم ان بیانات سے یہ بات ثابت کرنا نہیں چاہتے کہ یہ موضوعات جن کے فائدوں سے ہم فی الحال ناواقف ہیں مفید اور سودمند ہیں بلکہ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس کا احتمال ہے اور اس سے قطعی انکار سائنس اور منطق دونوں لحاظ سے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

لہٰذا اگر ان موجودات کو ان تجربات پر جو عالم کائنات کے کشف شدہ حصوں سے متعلق ہیں تکیہ کر کے سو فیصد مفید قرار نہ دیں تو کم از کم اس پر "پوشیدہ" ہونے کا لیبل لگا دیں۔ اس بات سے کس طرح

---

۱ [یہاں پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فلکیات کے مشہور دانشور "کپلر" کی ان باتوں کا ذکر کر دیا جائے جو اس نے اتفاقات اور حادثات کے بارے میں کہی ہیں:

"کل جب میں دریائے فکر میں غوطہ زن تھا اچانک مجھے کھانے کے لئے بلایا گیا۔ میری جوان بیوی نے میز پر ایک طرف سلاد رکھ دیا تھا میں نے اس سے کہا کیا تم باور کرتی ہو کہ آغاز عالم آفرینش سے آج تک دھات کے برتن "کاہو کے پتے" نمک کی ڈلیاں "تیل کے قطرے" سرکا اور پکے ہوئے انڈے کے ٹکڑے ہر طرف کسی نظم وضبط کے بغیر فضا میں پھیلے ہوئے ہوں اور کوئی حادثا اور اتفاق انہیں ایک دوسرے کے ساتھ ملا دے اور ان کے اختلاط سے ایسا سلاد بن جائے؟ اس کی بیوی نے جواب دیا: یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ ایسا اچھا سلاد تیار نہیں ہو سکتا۔ اور اس عمدہ طریقہ سے اسے تیار نہیں کیا جا سکتا"۔ (نقل از کتاب "خدا در طبیعت" تالیف فلاماریون ص ۱۵۸)

"کپلر" نے یہ سوال اس موقع پر کیا تھا کہ ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۶۰۴ء میں ایک بہت روشن ستارہ آسمان پر نمودار ہوا تھا اور یہ واقعہ ماہرین نجوم کے لئے دلی ترغیب کا باعث ہوا کیونکہ یہ بات ستاروں کے نظم کے برخلاف معلوم ہو رہی تھی اور اس روز تک متغیر ستاروں کی جانب کسی نے توجہ مبذول نہ کی تھی لہٰذا بعض لوگ اس کے وجود کو اتفاق اور حادثہ کا نتیجہ قرار دے رہے تھے اور بعض دوسرے دوسری وجوہات بتا رہے تھے۔ خلاصہ یہ کہ کوئی شخص اس بات کے لئے آمادہ نہ تھا کہ اسے کسی حادثہ کا نتیجہ تسلیم کرے۔ "کپلر" کی گہری سوچ اور اس کے بعد اس کا اپنی بیوی سے یہ سوال اسی وجہ سے تھا۔ بعد میں یہ مشکل حل ہو گئی اور معلوم ہوا کہ ستاروں کی ایک قسم ایسی ہے جن کی صورت بدلتی رہتی ہے۔ (نقل از کتاب "خدا در طبیعت")]

ان تمام عقل اور قدرت کے آثار کو (جو ہم تمام جہاں میں مشاہدہ کر رہے ہیں اور ان نغموں کو جو ایٹم کے دل سے لیکر کہکشانوں تک تمام پوشیدہ اور ان پہچانے ہوئے موجودات کے دلوں میں بکھرے ہوئے ہیں) نہ دیکھا ہوا اور نہ سنا ہوا قرار دیدیں؟

یہاں پر ہم آپ سے ایک مثال پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ کسی آثار قدیمہ کی کھدائی میں کسی تباہ شدہ آبادی کی جو ہزاروں سال پہلے اس دنیا میں زندگی بسر کر رہی تھی بہت سی تختیاں ہمیں دستیاب ہوئیں ان کو پڑھ کر ہمیں معلوم ہوا کہ ان پر کئی نئی باتیں اور حقیقتیں کھدی ہوئی ہیں اور مختلف علمی، اجتماعی اور تاریخی جلسوں کے غیر معمولی دلکش اور مؤثر اشعار یا نثر یا بیان ان میں درج ہیں لیکن چند ایک تختیوں پر ایسی تحریر تھی جس کے سمجھنے سے ہم عاجز تھے اور سچ تو یہ ہے کہ ہم نے اس کا ذرا سا بھی مفہوم نہ سمجھا۔ کیا آپ کے خیال میں یہ بہتر ہے کہ ہم کہہ دیں کہ ان تختیوں پر ایک متمدن اور عقلمند قوم کے آثار ہیں جو زمین کے اندر بطور یادگار موجود تھے اور یہ سطریں جو پڑھی نہ گئیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سمجھنے کی کنجی ہمارے ہاتھ نہ آئی یا کہیں ان سمجھ میں نہ آنے والی سطروں کا وجود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان تختیوں کا لکھنے والا کسی قسم کی تعلیم اور اطلاع سے ناواقف تھا اور ان کلمات کے بارے میں جو کھدے ہوئے تھے یہ کہہ دیں کہ وہ سب قیمتی کلمات اتفاق اور حادثہ کے طور پر وجود میں آ گئے تھے اور اس کی دلیل بھی وہی چند سمجھ میں نہ آنیوالی مبہم سطریں تھیں۔ کیا کوئی باشعور آدمی دوسری بات کے امکان کی تائید کر سکتا ہے؟

میں نامعلوم باتوں کے متعلق دس سال تک سوالات پوچھ سکتا ہوں!

زمانہ کا مشہور دانشور "آئن سٹائن" نے اپنی کتاب میں خلاصہ فلسفہ نسبیت لکھا ہے:

"اب تک ہم نے کتاب طبیعت کا جس قدر مطالعہ کیا ہے اس سے ہمیں بہت کچھ حاصل ہوا ہے اور ہم زبان طبیعت کے اصولوں سے آشنا ہو چکے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم جانتے ہیں کہ ان تمام کتابوں کے مقابل میں جنہیں ہم نے پڑھا اور مطالعہ کیا ہے اب بھی ہم فطرت کے مسائل کو حل کرنے اور اس کے بھیدوں پر سے پردہ اٹھانے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے ہیں"۔

ماہر فلکیات ''فلاماریون'' کہتا ہے:

''ہم غور کرتے ہیں لیکن یہ غور ہے کیا؟ اور ہم راستہ چلتے ہیں لیکن یہ ہمارے پٹھوں کا عمل کیا چیز ہے؟ کوئی شخص اسے نہیں جانتا۔ میں اپنے ارادہ کو ایک غیر مادی قوت سمجھتا ہوں کیونکہ جس وقت میں ارادہ کرتا ہوں کہ اپنا ہاتھ اٹھاؤں تو دیکھتا ہوں کہ میرا غیر مادی ارادہ میرے ہاتھ کو جو مادی عضو ہے حرکت دیتا ہے۔ یہ بات کس طرح وقوع پذیر ہوتی ہے اور وہ واسطہ جس کے ذریعہ سے میری عقلی قوتیں مادی نتیجہ پیش کرتی ہیں وہ کیا ہے؟ کوئی شخص میرے سوال کا جواب دینے والا پیدا نہیں ہوا۔ اے صاحبان! مجھے جواب دیں میرے لئے اسی قدر کافی ہے کہ میں دس سال تک نامعلوم باتوں کے متعلق سوال کر سکتا ہوں اور آپ اسی ہی سے کسی کا بھی جواب نہیں دے سکتے؟''۔

''ولیم جیمس'' ایک دلچسپ بحث کے بعد سائنس علوم کی پیشرفت اور سائنس کی آئندہ وضع کے بارے میں کہتا ہے:

''ہمارا علم ایک قطرہ کی مانند ہے لیکن ہمارا جہل ایک بڑا سمندر ہے، جو واحد چیز ممکن ہے اور جسے تاکید کے ساتھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے معلومات طبیعی کا موجودہ عالم ایک دوسرے وسیع تر عالم سے گھرا ہوا ہے کہ ہم اب تک اس کی خاصیتوں کا پوری طرح پتہ نہیں چلا سکتے'' ۱؎

۱؎ [پیشوایان اسلام خصوصاً امام صادق -کی مادہ پرستوں سے متعلق بحثوں اور اقوال کے ملاحظہ سے یہ بات

کیا یہی باتیں باعث الحاد ہوتی ہیں؟

حقیقی دانشور کون ہے؟

فرسودہ اور پھولی ہوئی آنت کا کیا فائدہ ہے؟

زنگ آلود ہتھیار

''شارل ریشیہ'' نامی مشہور فرانسیسی دانشور اور فرانس میڈیکل کالج کا پروفیسر کتاب ''نمودار ہائی روحی'' (روحانی انکشافات) میں اس طرح لکھتا ہے:

''ایسے وقت میں جبکہ انسان کو موجودہ سائنسی علوم کا بے حد احترام کرنا چاہئے اور اسے اس بات کا بھی پوری طرح اعتقاد رکھنا چاہئے کہ موجودہ علوم جس قدر بھی وسعت اور صحت پیدا کر لیں ہمیشہ ان میں کافی کمی رہیگی''۔

بعد ازاں چند مثالیں پیش کر کے کہتا ہے:

''اگر ہم ایک بربری شخص یا ایک مصری زمیندار یا ایک روسی دیہاتی سے جہان فطرت سے متعلق معلومات کے بارے میں سوال کریں تو وہ لوگ ابتدائی کتابوں میں لکھی ہوئی باتوں میں سے دسواں حصہ بھی نہ جانتے ہونگے اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ ہمارے ہم عصر دانشور ان دیہاتوں کی طرح بن جائیں گے جیسے آج کے دیہاتی فرانس یونیورسٹی کے استادوں کے مقابلے میں ہیں''۔

چند جملوں کے بعد وہ مزید لکھتا ہے:

پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے اور اصولاً توحید اور خدا پرستی کے بارے میں قرآن مجید کی روش بھی یہی ہے اور اس میں حتی المقدور تمام فلسفیانہ دلائل و استدلالات سے پرہیز کیا گیا ہے]

''اس لحاظ سے حقیقی دانشور وہ ہے جو وقت واحد میں جری بھی ہو اور منکسر المزاج بھی۔ منکسر المزاج اس لئے کہ ہمارے علوم حقیر اور مختصر ہیں۔ جری اس لئے رہے کیونکہ نامعلوم چیزوں کو دریافت کرنے کا رستہ ہمارے سامنے کھلا ہوا ہے''۔

اب ہم اپنے اصلی مقصد کی طرف لوٹتے ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مادہ پرستوں کے اعتراض کا عنوان اس طرح قائم کرتے ہیں۔ اگر اس کائنات ہستی کی وسیع عمارت' ایک دانا اور توانا سرچشمہ کی جانب سے ہے تو پھر کیوں وقتاً فوقتاً طوفان سیلاب اور زلزلے ہماری زندگی کے کاروبار کو کیوں درہم برہم کرتے رہتے ہیں اور بنی نوع انسان کی زندگی کا خاتمہ کیوں کرتے رہتے ہیں۔ کیوں مصیبتیں اور آفتیں ہماری لطیف اور زود رنج روح کو اذیت پہنچاتی رہتی ہیں؟ کس لئے ان تمام سیاروں اور ستاروں اور سیاروں کو پیدا کیا جو ہمارے لئے قابل سکونت نہیں ہیں اور کیوں بعض جانداروں میں زائد اعضاء دیکھنے میں آتے ہیں جن کا کوئی فائدہ اور اثر نہیں ہے وہ کیوں اور کس لئے پیدا کئے گئے؟

ہم نے پہلے بتا دیا تھا کہ یہ طرز تظلم اور اس قسم کی سخت گرفت اور تکبرانہ اعتراضات صرف اس شخص کو زیب دیتے ہیں جو اس عالم آفرینش کے تمام بھیدوں سے واقف ہو یا بالفاظ دیگر اس کا علم، علم مطلق ہو جس میں جہل کی ذرا سی بھی آمیزش نہ ہو۔ اگر کسی نے علم کا وہ مقام حاصل کر لیا ہے اور پھر اس نے اس دنیا کے بعض حادثات و موجودات میں کوئی فائدہ نہ دیکھا ہو تو وہ ایسے چون و چرا کرنے کا حق رکھتا ہے لیکن ہم......

لیکن ہم نے زمانہ حاضر کے عظیم دانشوروں کے قول کے مطابق تکوین و خلقت کی ضخیم کتاب میں سے چند اوراق سے زیادہ کا مطالعہ نہیں کیا ہے اور نامعلوم چیزوں کے مقابلہ میں ہماری معلومات کا درجہ ایک غیر معمولی بہت بڑے عدد میں سے صفر کے برابر ہے تو پھر ہم ایسی باتیں کس طرح کر سکتے ہیں''؟؟

آپ نے فرانسیسی دانشور ''شارل ریشیہ'' کے کلمات میں ملاحظہ کیا ہے: ''ہم جدید علوم طبیعی کے

۱۔ [سابقہ بحثوں میں ماہرین علوم طبیعیات کے بہت سے نمونہ ہم نے نقل کئے ہیں]

۲۔ [نقل از دائرۃ المعارف، فرید وجدی، ج ۱، ص ۵۰۳]

برق رفتار ترقی کا پورا احترام کرنے کے قائل ہیں اور اس قدر نمک حرام بھی نہیں ہیں کہ سائنس نے جو اہم خدمات ہمارے اور جہانِ بشریت کے لئے انجام دی ہیں اسے بھلا دیں لیکن یہ بات اس امر کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ جہانِ خلقت کے عظیم اور کشادہ کارخانہ کے مقابلے میں انسانی علم و فکر کی حیثیت کو بھول جائیں اور ''علوم انسانی کی اہمیت'' کے بارے میں غلطی کا شکار ہو جائیں۔

یہ خود پسند انسان!

کہتے ہیں کہ: انسان فطری طور پر خود غرض واقع ہوا ہے اور یہ خود پسندی آج سے زیادہ سابق میں اس پر مسلط رہی ہے، اس کی خود پسندی کا ایک سبب یہ تھا کہ گذشتہ زمانے میں بطلیموس کی ہیئت کے مطابق لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ زمین کی حیثیت مرکزی ہے اور تمام سیارے اور ستارے اس کے اطراف گردش کرتے ہیں لیکن آج سائنسی علوم کی ترقی سے اس کی خود پسندی کے پردے چاک ہو چکے ہیں اور انسان اس جہانِ خلقت میں اپنے اصلی مقام سے واقف ہو گیا ہے۔

لیکن ہم بڑے افسوس کے ساتھ یہ دیکھتے ہیں کہ اگر علوم طبیعی کی ترقی نے ان میں سے بعض پردوں کو اٹھایا ہے تو تعصب اور خود پسندی کے موٹے موٹے پردے اس کی چشم تفکر کے سامنے حائل ہو گئے ہیں۔ جرمن ڈاکٹر ''مختر'' کے یہ کلمات جس میں وہ کہتا ہے کہ:

''نظام شمسی کے دوسرے سیارے کیوں سیارۂ زمین کی مانند انسان جیسی مخلوق کے لئے قابل استفادہ نہیں ہیں؟ کیا یہ وہی بطلیموس جیسی سوچ نہیں ہے؟''۔

لیکن کیا یہ تمام کارخانہ ہماری زندگی اور ہم جیسے لوگوں کی زندگی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں جو ان میں ہماری روئے زمین کی زندگی اور حیات کی شرطوں جیسی شرائط پائی جائیں؟ یہ بات بالکل ویسی ہی ہے کہ ایک پرندہ انسان کے کاموں سے تھوڑا سا واقف ہو کر پارچہ بافی کے ایک عظیم کارخانہ کے اوپر سے گزرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ بڑی بڑی لوہے کی مشینوں اور چند چرخیوں کے اطراف بہت سی چیزیں مسلسل حرکت کر رہی ہیں اور روئی کو مختلف قسم کے رنگا رنگ کپڑوں کی صورت میں باہر نکال رہی ہیں۔ یہ پرندہ بطور استھزا و تمسخر کہتا ہے: اس کارخانے کے چلانے والے کس قدر بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ مجھے تو اس

کپڑے اور اس لباس کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ لوگ کپڑا بنانے کی یہ فضول زحمت کیوں اٹھا رہے ہیں؟ کیا آپ کے خیال کے مطابق یہ باتیں معقول ہیں؟

ہم اپنے وجود کی حیثیت کو کیوں بھول جاتے ہیں اور اپنے آپ کو ہر چیز کے تولنے کا پیمانہ کیوں قرار دیتے ہیں اور اپنے ناچیز علوم پر اس قدر کیوں اتراتے ہیں؟ آج کے سائنسی ترقی کے مقابل میں ہماری پسماندگی کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے اور اس جہانِ ہستی کی حقیقی بزرگی کے مقابلہ میں جسارت کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے۔

غدود اور پھولی ہوئی آنت کا کیا فائدہ ہے؟

اس لئے کہ انسانی علوم کی واقعی اہمیت کو ہم بھول نہ جائیں اور اپنے اور دوسرے تمام لوگوں کی معلومات کے بارے میں مبالغہ سے کام نہ لیں ہمیں چاہئے کہ اس موضوع کو ہمیشہ اپنے پروگرام میں شامل رکھیں اور وہ "سائنس کی تاریخ" کا مطالعہ ہے کیونکہ سائنس کی تاریخ کے ذریعہ ہمیں بڑے بڑے حیرت انگیز سبق مل سکتے ہیں۔ چونکہ بہت سے ایسے عقائد اور نظریات جو اپنے زمانے میں اس شدت سے نافذ رہے ہیں کہ ان کا شمار قطعی چیزوں میں ہوتا تھا لیکن کچھ عرصہ گزرا کہ نہ صرف ان کی اہمیت و قیمت کم ہوگئی بلکہ وہ بعد میں آنیوالوں کے لئے باعث تمسخر اور باعث تفریح بنے۔ ہمیں ان کے عقائد اور نظریات کی رو سے پتہ چلا ہے کہ وہ لوگ سائنس کے موجدوں کو اس کے انکشافات کے جرم میں نادان' بے خبر اور جاہل کے خطاب سے نوازتے تھے۔ لیکن بعد میں آنیوالوں کے تجربات اور آزمائشوں نے ان کے صحیح ہونے کی تائید کردی۔ اگر یہاں ایک دو مثالیں بطور نمونہ پیش کردی جائیں تو کوئی قباحت نہیں ہے:

"رودھ کور" یا "رودہ اعور" کے سب سے آخر میں ایک چھوٹا سا زائد حصہ ہوتا ہے جسے زائدہ "اپنڈلیس" کہا جاتا ہے جو ایک چھوٹی سی نلی کی شکل میں مذکورہ آنت کے آخر میں نظر آتی ہے۔ اس حصہ کے سوجن کی وجہ سے "اپنڈلیس" جیسی مشہور بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔

ا [ازدائرۃ المعارف، فرید وجدی، مادہ الہ] ۲ [خدا اور طبیعت، اشاعت اول ص ۱۱۲]

قبل ازیں دانشوروں کی ایک جماعت اس عضو کے وجود کو زائد سمجھتی تھی یہاں تک کہ بعض کا خیال تھا کہ ہر تندرست انسان آپریشن کے ذریعہ اسے نکلوا سکتا ہے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ نہ صرف یہ عضو زائد نہیں ہے بلکہ اس میں داخلی عفونت کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک حساس کیفیت موجود ہوتی ہے اور وہ بدن کے لئے "خطرے کی گھنٹی" کا کام دیتی ہے۔ اور یہ عضو انسان کو بدن کے تمام داخلی حساس حصوں پر مختلف بیماریوں کے حملے سے آگاہ کرتا ہے تا کہ وہ اس کا مقابلہ کرکے کامیابی حاصل کرسکے۔

اسی طرح انسان کے گلے کے دونوں جانب دو غدود ہوتے ہیں جسے "لوزتین" کہا جاتا ہے۔ بعض سائنسدان اس کے زیادہ (بے ضرورت) ہونے کا بہت زیادہ چرچا کرتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اسے جراحی کے ذریعہ بچپن میں نکال دینا چاہئے تا کہ وہ پیپ آلودنہ ہوجائیں لیکن بعد کے مطالعات سے پتہ چلتا ہے کہ ان دو غدودوں کا وجود انسان کی سلامتی کے لئے بہت اہم ہے، اس لئے بعض ماہر ڈاکٹرز رسماً ہدایت کرتے ہیں کہ جب تک لازمی نہ ہوجائے یعنی مذکورہ غدود میں جب تک پیپ نہ پڑجائے اور وہ خطرناک نہ بن جائیں ان کا آپریشن کرنے سے احتراز کیا جائے۔

خلاصہ یہ کہ کل کی بہت سی نامعلوم چیزیں آج معلوم کی فہرست میں شامل ہوتی جارہی ہیں اور اسی طرح آج کی بہت سی نامعلوم چیزیں کل معلوم ہوجائیں گی اور ان (نامعلوم) چیزوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اس مختصری جگہ میں اس کی تفصیل بیان نہیں کی جاسکتی؟ کیا یہ سائنس کی رفتار کی کیفیت اور اس کی پیشرفت سے ناواقفیت کی دلیل نہیں ہے؟

زنگ آلود گی ہتھیار

ان تمام حالیہ بیانات اور سابقہ بیانات سے ہمارا مقصد صرف ایک بات بیان کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ (مادہ پرست) لوگ اس قسم کی بحثوں میں اب بھی "انکار کا ہتھیار" لیکر مقابلہ کے میدان میں آجاتے ہیں اور صرف ایک حقیقت کی نفی کرنے کی خاطر یہ کہہ کر صبر کرلیتے ہیں کہ سائنس اس بارے میں خاموش ہے اور یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ چونکہ سائنس نے اس بارے میں کوئی انکشاف نہ کیا اس لئے

ا [علی اطلال، ج ا، ص ۴۲]

اس قسم کی بات کبھی نہیں ہو سکتی۔ہم بتا دینا چاہتے ہیں کہ ان سائنسی آراء اور نظریات کی تبدیلی کے بعد ان زنگ آلود اور فرسودہ ہتھیاروں کو جو خلافِ فیشن بن چکے ہیں' چھوڑ دیں اور منفی رخ اختیار کرنے اور منفی پہلوؤں میں سخت رویہ اختیار کرنے کی بجائے مثبت پہلوؤں کی طرف توجہ دیں تا کہ جہانِ ہستی کے اسرار سے زیادہ واقفیت حاصل ہو سکے۔

یہ بات درست ہے اٹھارویں،انیسویں صدی عیسوی کے مقابلوں میں یہ حربہ مناسب تھا لیکن آج سائنسدانوں نے اعتراف کر لیا ہے کہ یہ منطق صحیح نہیں ہے۔آپ غلط نہ سمجھ لیں ہم نے تو اس حقیقت کو ثابت کر کے صرف زیر بحث اعتراض کے جواب کے صرف ایک حصہ کو نمایاں کیا ہے نہ کہ تمام کو۔آئندہ بحث میں اس کے جواب کا بقیہ حصہ قارئین گرامی کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

اب ہم اس بات کی اجازت چاہتے ہیں کہ ایک دوسرے عظیم ماہر علوم طبیعی کے اقوال کو نقل کریں:

''ولیم گروکس'' جس کا شمار انگلینڈ کے دانشوروں میں ہوتا ہے اور جو سلطنت کی مجلس علمی کا رکن ہے اور ''تشعشع مادہ'' (Radiation) (شعاع افگنی) کا انکشاف کرنیوالا ہے اپنی سائنسی بحثوں میں جو کہ بعد میں ایک مجموعہ کی شکل میں شائع ہو چکی ہیں اس طرح کہتا ہے:

''ان روحانی بحثوں کے حل کرنے میں جس بات نے میری بہت زیادہ مدد کی اور طبیعی انکشاف کے راستے کو مجھ پر آسان بنا دیا وہ ایسے انکشافات تھے جن کا مجھے وہم بھی نہ تھا۔میرا صحیح اور راسخ اعتقاد اپنے جہل اور نادانی پر تھا لیکن بہت سے سائنسی مطالعہ کرنیوالے اس بات کو نہیں سمجھ سکتے اور اس قابل فخر سائنسی سرمایہ کے بہت بڑے حصہ کی نفی کر دیتے ہیں''۔!!

ناگوار حادثے اور نظام زندگی

اس خوبصورت تصویر کو دیکھئے!

نومولود بچے اس قدر کیوں روتے ہیں؟!

امام صادق -کا ایک دلچسپ قول

انسان کی زندگی میں ہمیشہ مشکلات اور تکالیف پیش آتی ہیں۔انفرادی مصیبتیں ایسی ہیں جیسے کسی

عزیز کی مصیبت یا بیماری۔اور اجتماعی تکلیف' زلزلے طوفان اور سیلاب کی طرح ہے۔ہر ادیب اور شاعر اپنی زندگی کے حالات بیان کرتے وقت ان مصیبتوں اور ناکامیوں کا قصہ پیش کرتا ہے جن سے اسے سابقہ پڑا ہے برخلاف اس کے وہ تمام کوششیں جو جسم انسانی کے آرام کے لئے اور خیال و فکر انسان کی راحت کے لئے کی جاتی ہیں وہ اس (کوشش کرنے والے انسان) کی زندگی کا میدان ہمیشہ اس قسم کے حادثوں کی جولانگاہ بنا دیتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ زندگی کی وضع اور تمدن کی تبدیلی سے سوچنے کا انداز بھی بدل جاتا ہے۔ایک دن وہ تھا کہ چیچک اور ملیریا معاشرہ انسانی پر ظلم و ستم ڈھاتے تھے اور انہیں انبوہ در انبوہ ملک عدم کی جانب روانہ کر دیتے تھے لیکن وہ اور ان جیسی دوسری بیماریاں تقریباً نابود ہو چکی ہیں اور ان کا کوئی نشان باقی نہیں رہا ہے لیکن ان کی بجائے ''سرطان''، ''بچوں کا فالج'' اور دوسری بیماریاں جن کا طریقہ علاج ابھی تک دریافت نہیں ہوا ہے،مظالم ڈھا رہی ہیں اور دوسری طرف ڈرائیونگ کے حادثات اور دوسرے مختلف حادثات ہیں اور سب سے بدتر ذہنی امراض ہیں جن کی زیادتی سے دن بدن خطرناک صورت پیدا ہو رہی ہے اور یہ حادثات اُن بیماریوں کے قائم مقام ہو گئے ہیں۔طبیعی حادثات جیسے سیلاب' زلزلے اور طوفان بھی اپنی جگہ باقی ہیں اور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے انسانی معاشروں میں دھوم مچاتے رہتے ہیں اور ایٹم و راکٹ کے زمانے کے انسان اور طاقتور اور فضا میں اڑنے والے انسان کے سامنے چارہ جوئی

---

۱ [خلاصہ یہ کہ خدا پرست لوگ اس خدا کے معتقد نہیں ہیں جو اس دنیا کے باہر ہے کیونکہ ان کے خیال میں وہ لامکان ہے تو پھر اندر اور باہر کے بارے میں بحث کیسی۔وہ ہر جگہ موجود ہے اور اس کا ارادہ تمام چیزوں پر غالب ہے۔

فن الہیات کا مشہور ماہر ''سترون'' (ولادت ۱۸۰۸۔وفات ۱۸۷۴) کہتا ہے:

''جاننا چاہیئے کہ دنیا کو بنیادی طور پر چلانا اور اس کا انتظام کرنا ایک عقل کلی کے توسط سے جو دنیوی ماحول سے باہر ہے عمل میں نہیں آتا بلکہ ابدی غیر متزلزل عقل کل کے ذریعہ سے عالم کائنات کی قوتیں اور ان کے روابط ترتیب دیئے جاتے ہیں''۔

اس بات کی مفصل شرح ''صفات خداوند'' کی بحث میں آئیگی]

کے تمام راستے بند کر دیتے ہیں۔

ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ ان ہی باتوں نے ایک جماعت کو عالم ہستی کے انتظام کے مسئلہ میں کشمکش و پیچ میں ڈال دیا ہے اور اسی سبب سے انہوں نے خدا کے ان تمام حیرت انگیز اور عجیب آثار سے جو دنیا کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پھیلے ہوئے ہیں اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں اور الحاد کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ شائد قارئین کرام آپ نے اپنے مطالعہ کے دوران ان بد باطن لوگوں کی تحریرات اور اشعار میں ملاحظہ کیا ہوگا کہ انہوں نے اس قسم کے واقعات پر تنقید کی ہے اور اس جہان کے پیدا کرنے والے کے خلاف نکتہ چینی کی ہے۔ ہر حال میں یہ بحث اس قابل ہے کہ کافی باریک بینی اور حوصلے کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا جائے تا کہ اس قسم کے لوگوں کی فکری لغزشوں سے دور رہا جا سکے۔

ہم اس بحث میں اپنی باتوں کو دو علیحدہ علیحدہ حصوں میں پیش کرتے ہیں:

۱۔ فرض کیجئے کہ ہم موجودہ معلومات سے بلاؤں' آفتوں اور تکلیفوں کے فلسفہ کا پتہ نہیں چلا سکتے تو کیا یہ بات ہمیں اس امر کی اجازت دیتی ہے کہ ایک بڑی حقیقت سے جو گذشتہ بحثوں میں عالم خلقت کے حیرت انگیز انتظام کے بارے میں ہم پر آشکار ہوئی ہے ہم اس سے آنکھیں بند کر لیں اور اس دنیا کو تصادفی حادثات و اتفاقات کا مجموعہ سمجھ لیں؟

۲۔ ہم نے انفرادی اور اجتماعی مصائب و آلام اور تکلیفوں کے فلسفہ کے بہت سے حصوں کا بخوبی پتہ چلا لیا ہے اور ہمارے پاس اس کا تسلی بخش جواب بھی موجود ہے بلکہ اگر آپ کو تعجب نہ ہو تو ان ہی

۱؎ [جیسا کہ پہلی بحث میں بیان کیا گیا خدا پرست لوگوں کا شمار علل و اسباب طبیعی اور اس کے آثار کے طرفداروں کی صف اول میں ہوتا ہے حتی کہ بعض بزرگ اور بعض محققین کہتے ہیں کہ معجزات میں بھی علل و اسباب مخفی ہوتے ہیں لیکن ہم ان اسباب و علل کی حقیقت سے واقف نہیں ہو سکتے اور معلول بغیر علت کے ہرگز نہیں ہوتا اس لئے معلول طبیعی کے لئے ہمیشہ علل طبیعی کی ضرورت ہوتی ہے اور معجزہ کے لئے بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یہ ایسے اسباب ہوتے ہیں جن کا ہم ادراک نہیں کر سکتے اور وہ اسباب غیر معمولی ہوتے ہیں۔ "اعجاز" کے سلسلے میں مفصل بحث کے لئے ترجمہ تفسیر المیزان تالیف استاد علامہ طباطبائیؒ کی جانب رجوع کریں]

موضوعات میں سے اس "مبداء بزرگ" کے وجود سے ہم زیادہ واقف ہو گئے ہیں یعنی یہ بات خود اپنی جگہ پر توحید کی دلیل ہے۔ فی الوقت ہماری بحث حصہ اول سے متعلق ہے۔

اس خوبصورت تصویر کو دیکھئے

فرض کیجئے کہ دنیا کے کسی مشہور میوزیم میں ہم ایک خوبصورت تصویر کو دیکھتے ہیں وہ تصویر ایک چاندنی رات کا منظر پیش کرتی ہے۔ چاند کی دھیمی روشنی تاریکی کے دل کو چیر کر منتشر بادلوں کے ٹکڑوں کی پشت میں سے جھانکتی ہے۔ چاند کے اطراف ایک خوبصورت ہالہ گھیرا ڈالے ہوئے اور اس کی خوبصورتی میں اضافہ کئے ہوئے ہے۔ تصویر کی ایک جانب صاف شفاف پانی کی ایک نہر نظر آ رہی ہے جو منظم پتھروں کے درمیان سے گزر رہی ہے اور اس کی روپہلی موجیں چاند کی روشنی میں دلفریب انداز میں چمک رہی ہیں اور تصویر کی دوسری جانب چند سوار نظر آ رہے ہیں جو کامل جنگی ساز و سامان سے آراستہ تیزی سے چلے جا رہے ہیں اور ان کی چہروں سے ظاہر ہے کہ وہ شبخون مارنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اس تصویر کی ہر چیز دلکش اور دلفریب ہے لیکن اس کے ایک گوشہ میں چند تاریک اور مبہم نقطے لگے ہوئے ہیں۔ ہم نقاشی کے فن سے پوری طرح واقف نہیں ہیں وہ ہمیں بے فائدہ اور فضول یا کم از کم بدنما اور برے معلوم ہو رہے ہیں اور میوزیم کے کارکنوں کا یہ دعوی ہے کہ یہ تصویر کسی پرانے مشہور ہنر مند کی بنائی ہوئی ہے۔

کیا ہماری عقل ہمیں اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ اس نفیس تصویر کو کسی ماہر نقاش کا شاہکار ہونے سے انکار کر دیں اور ان ہی چند نامعلوم اور مبہم نقطوں کو دلیل بنا کر کہدیں کہ یہ ایک ناواقف شخص کے بے ترتیب قلم کا نتیجہ ہے جو کپڑے پر نمودار ہو گیا ہے اور ادعا کریں کہ اس تصویر کا بنانے والا فن نقاشی سے ذرا سا بھی واقف نہ تھا یا اس کے برعکس ان تمام روشن اور درخشان نقطوں کو اس بات کی دلیل سمجھیں کہ وہ چند تاریک اور مبہم نقطے بھی اپنے اندر کچھ اسرار رکھتے ہوں گے۔ کیا ایک بے روح اور بے جان تصویر' ایک انسان کے وجود سے جس میں سرتاپا مختلف قسم کی عجیب مشنریاں نصب ہیں زیادہ قیمتی ہے؟ کیا ایک گلاب کی ٹہنی یا ایک خوبصورت پرندہ' نقاش کی بنائی ہوئی ایک تصویر کے مقابلے میں انسان کے تعریف و

حیرت کے جذبہ کو زیادہ برانگیختہ نہیں کرتی؟ تو پھر اس عالم بالا کے حیرت ناک نقوش' کہکشاں' منظم اور عظیم سیارے' رحم کے اندر نطفہ کا وجود' ایٹم کے ہستہ کے اطراف الیکٹرونوں کی گردش اور دوسرے ہزاروں حیرت انگیز نقوش کا کس طرح مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ کس قدر نادانی اور جہالت کی بات ہے کہ انسان ان تمام آثار کو محض اس وجہ سے کہ اس نے ابھی تک اپنے ناقص مطالعہ کے ذریعہ اس وسیع عالم کے تمام اسرار سے واقفیت حاصل نہیں کی ہے، اندھے بہرے اتفاقات اور حادثات کا نتیجہ قرار دیدے؟ ہم اس دنیا کے اسرار کے بارے میں علم ہی کتنا رکھتے ہیں جو ان چیزوں کے بارے میں جن سے ہم واقف نہیں ہیں گستاخانہ فیصلے صادر کریں۔ اب ہم آپ سے اجازت چاہتے ہیں کہ انسان کا علم محدود ہونے کے بارے میں ہم نے گزشتہ جو بحث کی ہے اس سے متعلق مشہور انگریز سائنسدان "رولیفر لوڈج" کا ایک جملہ نقل کریں جو بے تار ٹیلیگراف کا موجد سمجھا جاتا ہے وہ کہتا ہے:

"جو کچھ ہم جانتے ہیں اس چیز کے مقابلے میں جتنا ہم کو جاننا چاہیے صفر کے برابر ہے۔ بعض لوگ اس بات کو بغیر عقیدہ اور ایمان کے کہہ دیتے ہیں لیکن میں پورے اعتقاد کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں"۔

نومولود بچے اس قدر کیوں روتے ہیں؟؟

جو چیز ہمیں سب سے زیادہ عالم ہستی کے رموز و اسرار کے حل میں تحمل' باریک بینی اور موشگافی کی دعوت دیتی ہے اور ہر قسم کی سختی اور جرأت سے باز رکھتی ہے وہ یہ ہے:

"بہت سے ایسے موضوعات جو فرسودہ ہو چکے تھے جن کے متعلق کسی کو خیال بھی نہ تھا کہ ان میں کوئی راز پوشیدہ ہوگا لیکن مطالعات کے بعد دانشوروں کو اس میں سے بہت سے قابل توجہ بھید دستیاب ہوئے ہیں اور اسی قسم کے موضوعات ہیں جو ہم سے کہتے ہیں: غیر معمولی موجود کے اسرار کے بارہ میں فیصلہ کرتے وقت ہم احتیاط سے قدم اٹھائیں"۔

اگر ہم ان موضوعات میں سے ایک نمونہ یہاں پیش کردیں تو کوئی قباحت نہیں ہے: آپ چاہے صاحب اولاد ہوں یا نہ ہوں آپ نے یہ بات ضرور دیکھی ہوگی کہ نومولود بچے بہت زیادہ روتے ہیں اور

ان کی آواز بے چین کرنیوالی اور جانکاہ ہوتی ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ آدمی سوچنے لگتا ہے کہ یہ معصوم بچہ کیوں اس قدر رو رہا ہے؟ اس کی بے چینی کا سبب کیا ہے؟ وہ جسے دنیا کی اور دنیا کی ناکامیوں کی کوئی خبر نہیں ہے کیوں اس قدر رو رہا ہے؟ لوگ غالباً سطحی نظر سے اس بات کو دیکھتے ہیں اور یقیناً اس بات کو ایک فرسودہ یا بیہودہ تصور کرتے ہیں حالانکہ دانشوروں کے مطالعات نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ نومولود کا رونا' زندگی اور حیات کے عوامل میں سے ایک ہے اور اگر اسے زندگی کے پروگرام سے خارج کر دیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ اسی کا خطرناک نتیجہ نکلے کیونکہ بچہ کے اعصاب وعضلات کی نشوونما کے لئے اور اس کی ہڈیوں کی مضبوطی کے لئے سب سے زیادہ ورزش اور حرکت کی ضرورت ہے۔

بچے خواہ کتنے ہی چھوٹے ہوں ان کی صحت اور نشوونما میں حرکت اور ورزش کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے اور اسی وجہ سے یدِ قدرت نے بچوں میں خصوصاً ان کی کم عمری میں ایک قسم کی بے چینی' حرکت اور جوش ودیعت کر رکھا ہے اور انہیں ہمیشہ حرکت و ورزش میں لگا رکھتا ہے تاکہ ان کے اعصاب مضبوط ہوں اور ان کے عضلات اور ہڈیاں ضروری نشوونما پالیں اور جیسے جیسے بدن کے مختلف حصوں میں ضروری استحکام پیدا ہوتا جاتا ہے، انسان کا تعلق ورزش اور حرکت سے کم ہوتا جاتا ہے۔ لیکن عمر کے ابتدائی سالوں میں جبکہ بدن تیزی سے بڑھتا رہتا ہے بچہ کو ورزش اور حرکت سے روکنا اس کی صحت اور نشوونما کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتا ہے اور ممکن ہے کہ اس کی نشوونما ہی رک جائے۔ لیکن اس کمزور شیر خوار نومولود میں نہ تو اس قدر طاقت وقوت ہوتی ہے کہ ورزش کے مختلف ذریعوں سے استفادہ کرسکے اور نہ اس کے پاؤں میں اتنی سکت ہوتی ہے کہ وہ پیدل چل سکے جس کا شمار بہترین اور سالم ترین ورزشوں میں ہوتا ہے۔ بچے کا پیدا کرنیوالا جس نے اسے عالم رحم کے خطرناک مرحلوں سے سلامتی کے ساتھ باہر نکالا اور مکمل صحت کے ساتھ اس دنیا میں بھیجا اس کی اس ضرورت کی تکمیل بالکل سادہ طریقہ سے کی ہے اور رونے کو جو بچے کے لئے کامل ورزش ہے اس کے قبضہ میں دے رکھا ہے۔ آپ نے یقیناً دیکھا ہوگا کہ روتے وقت بچے کے جسم کی تمام مشنریاں تیزی سے کام کرنے لگتی ہیں۔ دل کے خون کی تیز گردش کی وجہ سے چہرہ کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے۔ سانس کی مشنری تیزی سے کام کرنے لگتی ہے۔ اعصاب' آنتوں' حلق' پلکوں اور

جڑوں پر اس سخت دباؤ کا اثر نمایاں ہو جاتا ہے اور ہاتھ اور پاؤں بھی حرکت کرنے لگتے ہیں اس لئے اس کو "گریہ" نہ کہنا چاہئے بلکہ اسے "نومولود بچے کے لئے ایک کامل ورزش" کہنا چاہئے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے ایک عظیم دینی رہنما حضرت امام جعفر صادق - کے اقوال میں بچے کے رونے کا ایک اور فائدہ بھی بتایا گیا ہے جو قابل غور ہے۔ اپنے ایک تفصیلی بیان میں جو جہانِ خلقت میں توحید کے اسرار کے بارے میں اپنے ایک دوست مفضل بن عمر کے نام تھا اس طرح وضاحت کرتے ہیں:

"اے مفضل! بچے کے دماغ میں رطوبتیں ہوتی ہیں اگر وہ وہیں رہ جائیں تو اس کا نتیجہ خطرناک ہوسکتا ہے نابینائی اور اس جیسے امراض پیدا ہونے کا امکان ہے لیکن گریہ اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ وہ رطوبتیں بچے کے دماغ سے آنسوؤں کے قطروں کی شکل میں باہر آجاتی ہیں اور اس سے اس کی آنکھوں کی سلامتی اور تندرستی قائم رہتی ہے۔ جس طرح بچہ کو رونے سے فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ اپنے ماں باپ کو بھی اسے خاموش کرانے کے سلسلے میں زحمت دیتا ہے اور ماں باپ اس کی راحت کے تمام سامان فراہم کردیتے ہیں تاکہ وہ نہ روئے لیکن وہ اس بات سے ناواقف ہوتے ہیں کہ رونا بچے کے لئے زیادہ اچھا اور زیادہ نتیجہ بخش ہوتا ہے اسی طرح اس بات میں کونسی رکاوٹ ہے کہ بہت سے ایسے موجودات ہوں جن میں بہت سے فائدہ اور منافع ہوں لیکن عالم خلقت کے بامقصد ہونے سے انکار کرنے والے اس سے بے خبر رہ جائیں"۔

خوب اچھی طرح دیکھئے کہ یہ "گریہ" جو ایک فرسودہ موضوع ہے یہی ایک واحد راستہ ہے جس کے ذریعہ سے بچہ اپنی تکلیف اور بے چینی کا اظہار اپنے ماں باپ کے سامنے کرسکتا ہے اس کے علاوہ وہ بچے کی نشو ونما میں بھی وہ کافی مدد و معاون ہوتا ہے، یہ ایک چھوٹا سا نمونہ ہے اس لحاظ سے کیا آپ کا خیال ہے کہ اگر ہمیں دنیا کے بعض موجودات اور حوادث کے اسرار سے آگاہی حاصل نہ ہو سکے تو کیا یہ ممکن ہے

۱۔[آقای مکارم نے خود یہ بحث تحریر کی ہے]

کہ ہم توحید کے ان تمام روشن اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والے نقاط کو فراموش کر کے اس سے انکار کردیں۔؟؟

نسبی اور اصلی بلائیں

نسبی حقائق اور اصلی حقائق میں غلطی نہ کرنی چاہئے

ہر شخص پانی میں اپنا ہی عکس دیکھتا ہے

سوچنے کا صحیح طریقہ

ہماری گفتگو مادہ پرستوں کے اس اعتراض (بدنظمی' آفتیں اور بلائیں کس لئے ہیں؟) کے جواب میں

کچھ طویل ہو گئی ہے لیکن یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ یہ موضوع بہت سے مادہ پرستوں کو گمراہ کرنے کا بھی سبب بنا ہے۔اسی دلیل کی بناء پر اس سے اس قدر جلد صرف نظر نہیں کرنا چاہئے۔ہم اس بارے میں اب تک بہت کچھ بحث کر چکے ہیں اور اس بحث کے بہت سے تاریک نکتے کافی حد تک روشن ہو چکے ہیں۔

اب ہم آپ کی توجہ اس حصہ کی نئی بحث کی جانب مبذول کراتے ہیں۔

اگر آپ طوفان اور زلزلوں وغیرہ جیسے حادثات کو معمولی اور سطحی مطالعات کے دریچہ سے دیکھیں گے تو وہ بظاہر بہت ہی تکلیف دہ ،ہولناک اور نفرت آمیز نظر آئیں گے اور اخبار نویسوں کے قول کے مطابق "فطرت کے غصہ کے مظہر" اور "فطرت کا غصہ" ہیں لیکن اگر ہم ان باتوں کا باریکی سے مطالعہ کریں اور عاجلانہ فیصلوں سے باز رہیں تو اس کا نتیجہ دوسری صورت میں نمودار ہو گا یعنی ہم اس حقیقت تک پہنچ جائیں گے:

اصلی حقائق اور نسبی حائق میں غلطی نہ کرنی چاہئے

ہمارے مطالعات اس دنیا کے موجودات اور حوادث کے فوائد اور نقصانات کے بارے میں ہمیشہ "نسبی" ہوتے ہیں یعنی ان مطالعات میں ہم تولنے کے پیمانے کو اپنے حالات سے یا ان لوگوں کے حالات سے وابستہ کردیتے ہیں جن کا ہم سے قریبی رابطہ ہے۔جس میں ہمارا فائدہ ہو اس کو اچھا اور مفید اور جو چیز ہمارے لئے مضر ہو اس کی ہم مضر اور خراب سمجھتے ہیں ہم ہرگز یہ حساب نہیں لگاتے کہ فلاں حادثہ جس نے ہماری زندگی پر برا اثر ڈالا ہے، آئندہ سو سال بعد اس کے کیا اثرات مترتب ہوں گے۔

ممکن ہے ایک خاص کیمیائی مادہ ہماری نظر میں "سم قاتل" ہو کیونکہ وہ ہمارے بدن کی مختلف مشنریوں پر برا اثر ڈالتا ہے لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہی مادہ دوسرے جاندار کے لئے "حیات بخش دوا" کا کام دیتا ہے اور برخلاف ایک دوسری مادہ کے جو ہمارے لئے حیات بخش دوا کی حیثیت رکھتا ہے وہ اکثر دوسرے لوگوں کے حق میں سم قاتل ہے۔لیکن کیا صرف ہمارا فائدہ اور نقصان ہی کسی چیز یا حادثہ کے اچھا اور برا ہونے کی دلیل ہے؟

باوجود اس کے آخری اور قطعی فیصلہ کرنے کے لئے اس حادثہ کے تمام اثرات کے مختلف پہلوؤں کو

پیش نظر رکھنا ہو گا اور بحیثیت مجموعی اس کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔

خلاصہ یہ کہ "نسبی مطالعات" جو شرائط اور موضوعات کے فریم میں پوری طرح موزوں ہو جاتے ہیں وہ ہرگز قطعی فیصلہ کی بنیاد نہیں بن سکتے اور اس سلسلے میں ہر ممکن غلطی ہم سب سے سرزد ہو گی اور یہ بات بہت اہم اور نا قابل معافی ہے۔

اس حقیقت کی وضاحت کے لئے چند ضروری مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

ہر شخص پانی میں اپنا ہی عکس دیکھتا ہے

فروردین (ایرانی شمسی سال کا پہلا مہینہ) ہے گھرے بادل نیلگوں آسمان پر چھائے ہوئے ہیں اور پہاڑ اور صحرا میں ٹھہر ٹھہر کر بارش ہو رہی ہے۔پیاسی زمینیں سیراب ہو چکی ہیں اور پھولوں میں اور نئے پودوں میں کافی تازگی اور خوبصورتی پیدا ہو گئی ہے۔ہلکی مرطوب روح پرور نسیم ہر طرف گلاب کا عطر چھڑک رہی ہے۔اور رجہان طبیعت کو ناقبل تعریف عظمت اور خوبصورتی بخش رہی ہے۔سچ مچ کتنا سہانا اور دلفریب منظر ہے؟ کیسی نعمت ہے؟ کیسی نیک بختی ہے یا یہ سب ہماری نظر کے لحاظ سے۔

چیونٹیوں کا چھتہ یا پرندہ کا گھونسلہ موسلا دھار بارش میں تباہ ہو جاتا ہے۔چند چیونٹیاں مٹی کے تودوں کے نیچے رہتی ہیں۔سوراخوں کے اندر خوراک کے ذخیرے تباہ ہو گئے اور تمام راستوں اور غلام گردشوں کو پانی نے گھیر لیا ہے اور آذوقہ جسے جمع کرنے میں سال بھر صرف ہوا تھا تمام بھیگ گیا، تمام چیزیں یا تو پانی پر تیر رہی ہیں یا مٹی کے نیچے دبی ہوئی ہیں۔انڈے جن سے گھونسلوں کی نئی نسلیں تیار ہونا تھیں سب خراب ہو گئے اور جو کمزور اور نحیف بچے مٹی کے تودوں کے نیچے نہیں چھپے وہ سب بیمار ہو گئے اور سخت پریشان ہیں۔کیسی مصیبت ہے؟ کیسی آفت ہے؟ کس قدر رجان لیوا اور المناک صدمہ ہے۔یہ تمام باتیں چیونٹیوں کے لحاظ سے نسیم نے ہندوستان کے عظیم سمندر کے ساحل سے حرکت شروع کی اور پانی کے وافر بخارات کو اپنے ساتھ لے گئی اور ساحلی منطقوں کی ہوا کو گھٹن کی حد تک پوری طرح بخارات سے بھر دیا ہے۔لوگ پریشان ہیں اور ہوا میں گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔

نسیم چلنا شروع ہوتی ہے اور بیابانوں کے خشک اور جلانیوالے علاقوں میں پہنچ جاتی ہے۔پیاسے

درختوں کو تازہ بخشتی ہے اور ہوا کی گرمی کو اعتدال پر لے آتی ہے اس بات سے لوگ خوش و خرم ہیں ۔اب بادِ نسیم زیادہ تیز ہوگئی ہے ۔اب پھر اعتدال پر آ گئی ہے اور دور دراز کے علاقوں تک بادلوں کو پہنچا دیا ہے ۔ہوا میں کافی ٹھنڈک آ گئی ہے اور بجلیاں چمک رہی ہیں اور کڑک رہی ہیں اور ایک علاقہ میں بہت سی نفع بخش بارش ہو رہی ہے ۔کاشتکار اور کسان' تمام ہی خدا کی اس نعمت عظمیٰ سے خوش ہیں ۔اخبارات اپنے اوپر کے صفحات پر ''ایک مسرت بخش خبر'' کے عنوان سے اس خبر کو شائع کر رہے ہیں ۔

یہ ''ہوا'' ابھی چل رہی ہے اور اس میں شدت پیدا ہوتی جا رہی ہے اور ایک لحہ میں وہ اپنی شدت کی انتہا تک پہنچ جاتی ہے اور دیہاتوں پر حملہ آور ہو کر کئی گھروں کو اجاڑ دیتی ہے ۔گاؤں کے چند پرانے درختوں کو گرا دیتی ہے اور اس گاؤں کے بعض مزارعوں کا کافی نقصان کرتی ہے ۔گاؤں کے سب لوگ اس ناگہانی بلا سے پریشان اور مضطرب ہیں اور کسانوں کی محفلوں اور مجلسوں میں اسی ذاب کی باتیں ہو رہی ہیں ۔قریبی شہر کے اخباری نامہ نگاروں نے اس خوفناک طوفان کی تفصیلی رپورٹیں شائع کی ہیں اور اپنے مقالات میں چاشنی پیدا کرنے کے لئے (اس طوفان کے لئے) ''خشم طبیعت''، ''قہر طبیعت'' اور اسی قسم کے عنوان قائم کئے ہیں ۔

یہ طوفان اسی طرح جاری ہے لیکن اس کی شدت میں کمی ہوتی جا رہی ہے اور اب وہ تیز اور مفید ہواؤں کی شکل میں تبدیل ہوگیا اسکے بعد وہ اور نرم ہوگیا اور روح افزا نسیم کی صورت اختیار کر گیا اور دوسرے علاقوں میں بھی اس کے مفید اثرات مرتب ہونے لگے ۔

اگر اب ان مختلف علاقوں کے لوگوں سے کہیں کہ ان واقعات کے بارے میں وہ سب ایک ہی قسم کا فیصلہ کریں جبکہ ان میں سے بعض اسے بالکلیہ بلا سمجھ رہے ہیں اور بعض اسے ایک ''نعمت عظمیٰ'' خیال کر رہے ہیں تو وہ لوگ غلطی کر جائیں گے اور ان کا فیصلہ قطعی نہیں ہوگا بلکہ نسبی ہوگا کیونکہ ان کا ناپنے کا آلہ ان کا اپنا مفاد یا ان کے اپنے علاقہ کا مفاد ہے ۔

البتہ ہم اس نکتہ کو بھی پیش نظر رکھیں کہ ہر حادثہ جو آج وقوع پذیر ہوتا ہے وہ قطعی طور پر کسی بہت پہلے کے سلسلۂ اسباب کا نتیجہ ہوتا ہے اور آئندہ ہونیوالی چیزوں کے ایک طویل سلسلہ کا سبب ہوتا ہے کیونکہ

ایسے بہت سے حوادث اس سے پہلے بھی رونما ہو چکے ہیں جس کی نتیجے میں اسی حادثے کی نوبت آئی ہے اور یہ حادثہ بھی آئندہ زمانے میں وقت پر سلسلۂ آثار کی ایک کڑی ثابت ہوگا ۔اس نکتہ کو پیش نظر رکھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حادثہ صرف مقاموں اور علاقوں کے لحاظ سے ہی مختلف اثرات نہیں رکھتا ہے بلکہ گزشتہ طویل زمانے اور حال اور آئندہ کے لحاظ سے بھی اس کے اثرات مختلف ہونگے ،وہ یہ ہے کہ ہر زمانے کے لوگ اس کے اچھے برے ہونے اور مفید و مضر ہونے کا تعین اپنے مفد کے دریچہ میں سے جھانک کر کرتے ہیں ۔لہٰذا ان میں سے کچھ لوگ اسے نعمت اور کچھ لوگ سے بلا سمجھتے ہیں ۔

سوچنے کا صحیح طریقہ

اس بناء پر اگر ہم سطحی نظر سے اسے دیکھنا چاہیں تو ہمیں چاہئے کہ اپنے مفاد کو پیش نظر رکھ کر ہر ایک حادثہ کے بارے میں فوراً قطعی فیصلہ کر دیں اور اگر ہم ایک فلسفی اور ایک مفکر کی حیثیت سے اس کا صحیح اور تمام پہلوؤں پر حاوی فیصلہ کرنا چاہیں تو ہمیں اس حادثہ کے بارے میں تمام گزشتہ اور آئندہ زمانے کے آثار کو دیکھنا پڑے گا اور اسی طرح مختلف مقامات اور مختلف لوگوں کے حالات کو پیش نظر رکھنا ہوگا ۔اگر یہ چیز ہمارے لئے ممکن ہو سکے تو اس حادثہ کے نقصان سے قطع نظر جہانِ ہستی کے کارخانے کے لئے (ہر جگہ اور ہر وقت کے مقابلہ میں) یہ حادثہ جس کے متعلق ہم ''بلا'' اور ''حادثۂ زیان بخش'' اور ان جیسے عنوانات قائم کرتے ہیں بحیثیت مجموعی زیادہ مفید ثابت ہوگا ۔اور اگر ہم میں اتنی قدرت نہیں ہے کہ ہم اس کے ہر پہلو کا مطالعہ کر سکیں تو ہمیں اس کا قطعی اور کلی فیصلہ کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے ۔ہمیں ہرگز اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ ہم اس کے اثرات صرف ایک خاص علاقہ میں یا ایک خاص زمانے میں دیکھ کر اس کے لئے ایسا عنوان قائم کر دیں ۔

اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک انسان کے لئے عام طور پر یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی حادثہ کے تمام پہلوؤں کا ہر زمانے اور ہر علاقے کے لحاظ سے احاطہ کر سکے تو پھر ان حادثات کے بارے میں جو مختلف شکلوں اور مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں قطعی فیصلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

بعض ایسے بیماریاں ہیں کہ انسان اپنی زندگی میں ایک نہ ایک وقت اس میں ضرور مبتلا ہوتا ہے لیکن اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اسے اس بیماری یا اس جیسی بیماریوں کے مقابلے میں ہمیشہ کے لئے تحفظ مل جاتا ہے۔ اگر ہم اس بیماری کے حملہ کے وقت اس پر رائے زنی کرنا چاہیں تو کہہ دیں گے کہ یہ ایک مصیبت اور عذاب ہے لیکن اگر اس بیماری کے پوری عمر کے آثار کو پیش نظر رکھیں تو اسے ایک نعمت تسلیم کرنا پڑے گا۔

اجتماعی زندگی میں کئی ایسے بحرانوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے جو آئندہ زندگی میں انقلابات اور تبدیلیوں کا سرچشمہ ثابت ہوتے ہیں۔ یہی وہ بحران ہیں جو افراد کو اکساتے ہیں کہ بہتر صورت اختیار کرنے کے لئے لڑائی کے لئے تیار ہو جائیں۔ اگر اس بحران پر اس وقت نظر کریں تو وہ ایک بلا معلوم ہوگا لیکن اگر اس کے اثرات کو آئندہ زمانے کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو وہ ایک بخشش اور نعمت معلوم ہوگی۔

مختصر یہ کہ ہم دوسری دفعہ تاکید کرتے ہیں کہ پوری طرح اس نکتہ پر غور کیجئے کہ ہم ہمیشہ روزانہ کے مطالعات میں (زندگی کی ضروریات اور احتیاجات کی وجہ سے) نسبی فکر کرتے ہیں اور اس سے قطعی نتیجہ نکالتے ہیں۔ غالباً اس غلطی کا روزانہ کے مطالعات پر اتنا اثر نہ پڑے لیکن علمی اور فلسفیانہ مطالعات میں یہ بات ہمیں سخت غلطی میں مبتلا کر دیں گی اور اکثر یہی فکری روش ہمیں ایک عرصہ تک اہم حقائق کے ادراک سے روک دیتی ہے۔ اس حقیقت پر غور کرنے سے ہماری بحث کی بہت سی مشکلات حل ہو جاتی ہیں! (غور کیجئے)

بلائیں بڑی نعمت ہیں!

درد کا احساس ایک نعمت ہے!

عدم کو کس پیمانے سے ناپا جا سکتا ہے؟

اگر بد نظمی نہ ہوتی تو ہم ''نظم'' کو کس طرح جانتے؟

یقیناً آپ یہ بات نہ بھولے ہوں گے کہ ہماری بحث اب بھی مادہ پرستوں کے اس سوال کے بارے میں ہے کہ ''بدنظمی اور بلائیں کس لئے ہیں؟'' ۔ اب سابقہ بحثوں کی تکمیل کے لئے حسب ذیل بحث کی جانب توجہ کیجئے:

درد کا احساس ایک نعمت ہے!

کبھی ہم بیٹھے ہوئے اپنے آپ سوچتے ہیں کہ یہ زود رنج اور حساس سلسلہ جس کا نام ''سلسلۂ اعصاب'' ہے اور جو ہمارے بدن کے مختلف مرکزوں میں پھیلا ہوا ہے سچ تو یہ ہے کہ یہ ہم پر مسلط ہے جب اس (سلسلۂ اعصاب) کو ذرا سی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہماری داد و فریاد کو آسمان تک پہنچا دیتا ہے۔ اگر ایک چھوٹا سا کانٹا بھی ہمارے پاؤں میں چبھ جاتا ہے تو ہمارا ہاتھ اس کی مدد کے لئے پہنچ کر اسے نکال لیتا ہے۔ اگر کبھی گرم چائے ہمارے جسم پر گر جاتی ہے اور ہمارا جسم تھوڑا سا جل جاتا ہے تو ہمیں شام تک چین نہیں آتا۔ اگر یہ اعصاب زود رنج اور جلد اثر قبول کرنے والے نہ ہوتے تو ہم کو اتنی پریشانی کیوں ہوتی؟ ہم آسانی سے آگ کو بجائے چمٹے کے اپنے انگلیوں کے سروں سے اٹھا لیتے اور ہمیں بے آرام بھی نہ ہونا پڑتا۔ ہم دیوار میں کیل اپنی مٹھی سے ٹھونک سکتے تھے اور ہمیں درد کا احساس بھی نہ ہوتا۔ ایسی صورت میں لڑائی یا مار پیٹ کا ہرگز کوئی مفہوم نہ ہوتا اور یہ تمام شور و غل جو اس سلسلہ میں ہوتا وہ خود بخود ختم ہو جاتا کیونکہ کسی کے کان پر گھونسہ مارنا یا تھپڑ مارنا ایک بیہودہ کام ہوتا اور وہ بالکل ہی ایسا

ہوتا جیسا کہ کسی نے دوسرے کے سر کے بال پکڑ لئے ہوں۔ بیماروں کی یہ تمام داد و فریاد سنائی نہ دیتی اور بالکل اطمینان کے ساتھ آپریشن کی ضرورت والے لوگوں کا آپریشن ان کی آنکھوں کے سامنے کرتے اور انہیں بے ہوش کرنے کی کوئی ضرورت نہ پڑتی۔

جب ہم یہ سوچتے ہیں تو اس بنیادی نکتے سے غافل ہو جاتے ہیں کہ یہی زود رنج اعصاب ہیں جو ہمارے بدن کو مختلف خطرات کے مقابلہ میں تحفظ دیتے ہیں اور وہ جسم جو ایک مٹھی گوشت اور ناپائدار ہڈیوں سے بنا ہوا ہے وہ لوہے اور فولاد سے بھی زیادہ پائدار ہو جاتا ہے اور باوجود تمام خطرات میں گھرے ہونے کے ۸۰ سال اور ۱۰۰ سال تک جیتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ (اعصاب) نہ ہوتے تو تھوڑی سی مدت میں ہم اپنے بدن کے اکثر اعضاء کو بے خوفی کی وجہ سے یا تو خراب کر لیتے یا بالکل ضائع کر دیتے۔ چند مرتبہ ہاتھوں آگ کا پکڑنا اس بات کے لئے کافی تھا کہ ہماری انگلیوں کے کچھ حصے جل جاتے اور راکھ ہو کر زمین پر گر پڑتے۔ ہمارے بدن کا گوشت در و دیوار اور کیلوں سے ٹکرانے کے باعث ٹکڑے ٹکڑے ہو کر جھڑ جاتا اور ہمیں پتہ بھی نہ چلتا، احساس نہ ہونے کی وجہ سے درد کا کیا پتہ چلتا بلکہ ہماری اکثر ہڈیاں ٹوٹ جاتیں اور ٹیڑھی ہو جاتیں اور ہمارے جسم کا تناسب بالکل ختم ہو کر رہ جاتا اور ہمارے اندرونی اعضاء ان پیش آمدہ واقعات کی وجہ سے خراب ہو جاتے اور کام کے قابل نہ رہتے اور بغیر اس کے کہ ہم درد کا احساس کرتے یا بے چینی محسوس کرتے یا اس کا کوئی انسداد کرتے، موت کے منہ میں پہنچ جاتے۔

حقیقت میں یہ سلسلۂ اعصاب ایک غیر معمولی نازک مواصلاتی نظام ہے جو بدن کے اکثر نقاط میں پھیلا ہوا ہے اور معمولی سے ناراحتی کے احساس کے ساتھ ہی خطرے کی گھنٹیاں بجا دیتا ہے اور انسان کو خطرہ کا مقابلہ کرنے اور اس کی چارہ جوئی کرنے کے لئے تیار کر دیتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بعض لوگوں کو جن میں تکلیف کا احساس ختم ہو چکا تھا ان کے ہاتھ جلنے پر ان کو اس وقت تک پتہ نہ چلا جب تک کہ گوشت کے جلنے کی بو نہ آئی۔ اگر سچ مچ ہم بھی ایسے ہی ہو جاتے تو پھر کیا ہوتا؟

نتیجہ یہ کہ: مختلف عوامل کے مقابلہ میں اعصاب کے تأثرات (یا بالفاظ دیگر تکالیف یا درد کا احساس

گونا گوں اسباب کی بناء پر) انسان کے بدن کے محافظ اور خدا کی ایک بڑی بخشش ہیں۔ دردوں اور بیماریوں کے سلسلے میں اس نکتہ پر غور کرنے سے ہمیں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ہم کو اجتماعی مصیبتوں اور بلاؤں اور آفتوں کے بارے میں زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

عدم کو کس پیمانے سے جانا جا سکتا ہے؟

''فلسفہ'' میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ''عدم'' کو ہمیشہ ''وجود'' کے ذریعہ سے ہی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ بنیادی طور پر عدم کے معنی ''کچھ نہیں'' کے ہیں ''کچھ نہیں'' کا ادراک کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہم اس کو وجود کے مقابلہ میں رکھ کر اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً: جس وقت ہمارا ایک دوست ہماری نظروں کے سامنے موجود ہے ہماری آنکھ کی پتلی بینائی کے اعصاب کی مدد سے اس کی تصویر دماغ تک پہنچا دیتی ہے اور اس کے ذریعہ سے ہم اپنے مقابل میں ایک وجود کی موجودگی سے واقف ہو جاتے ہیں کیونکہ اس کے وجود نے ہماری بینائی کے اعصاب پر اپنا ایک خاص اثر چھوڑا ہے لیکن جب وہ خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو جاتا ہے تو ہم اب اس تصویر کو اور اس کے اثر کو موجود نہیں پاتے۔ ان دو حالتوں کا ایک دوسرے سے موازنہ کرنے سے ''عدم'' کا مفہوم ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔

کانوں کے راستے اور تمام حواس کے ذریعہ سے ہم اس بات سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ ایک پرندہ کی دلکش آواز درختوں کی شاخ سے صوتی لہروں کی شکل میں ہمارے کانوں میں پہنچتی ہے اور ہم میں مختلف احساسات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اچانک وہ پرندہ خاموش ہو جاتا ہے اب وہ مخصوص تأثرات جو صوتی امواج کے اثر سے ہم میں گونا گوں احساسات کو ابھار رہے تھے، غائب ہو گئے۔ ان دو حالتوں کے باہم تقابل سے ''عدم'' کا مفہوم ہمارے ذہن میں اجاگر ہو جاتا ہے ورنہ ہم نے نہ ''عدم'' کی صورت آنکھوں سے دیکھی ہے اور نہ ''عدم'' کی آواز کانوں سے سنی ہے۔

اگر چہ عدم کا مفہوم سمجھنے کے لئے ایک ہی مثال کافی ہے اور دوسرے موضوعات کے عدم کو بھی ہم

لے [نقل از کتاب ''نا معلوم طبیعی قوتیں'' (قوای طبیعی مجہول'' تالیف فلاماریون]

اسی طرح مقابلہ کر کے جان سکتے ہیں لیکن اگر ہم چاہیں کہ وہ حالت جو موجودات میں سے کسی کے غائب ہونے سے ہمارے اندر پیدا ہوتی ہے اس کو اچھی طرح جان لیں تو ہمیں چاہئے کہ ہر عدم کو جاننے کے لئے علیحدہ طور پر اس کے موجود کا ادراک کریں اور اس موضوع کو ذہن میں رکھیں۔

اگر بدنظمی نہ ہوتی تو ہم "نظم" کو کس طرح جانتے؟؟

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جس طرح ہم عدم کو وجود کے مقابلہ میں معلوم کرتے ہیں اسی طرح ہم ہر وجود کی اہمیت کو عدم کے مقابلہ میں معلوم کر سکتے ہیں۔یعنی جب تک یہ دو حالتیں ایک دوسرے کے مقابل نہ رہیں اس وقت تک نہ وجود کی حالت ظاہر ہو سکتی ہے نہ عدم کی، نہ اس کا پتہ چل سکتا ہے کہ ہر ایک حالت سے کونسے آثار پیدا ہوتے ہیں۔

''تل'' نامی ایک سیاہ نقطہ کیوں ایک گورے اور خوبصورت چہرہ کی دلکشی اور حسن میں اضافہ کرتا ہے؟ اگر آپ یہ سوال کسی فلسفی سے پوچھیں گے تو وہ آپ کو جواب دے گا اسلئے کہ وہ وجود و عدم (سیاہ و سفید) کے تقابل کو آپ کی نظروں کے سامنے مجسم کر کے پیش کر دیتا ہے اور اس سیاہ نقطہ کے ذریعے سے دیکھنے والا بدن کے پوست کے جاذب نظر اور گورے ہونے کو بذریعہ تقابل معلوم کر لیتا ہے۔

اس بناء پر اس بات میں کونسا امر مانع ہے اگر جہان ہستی کا ماہر فن نقاش اس خیال سے کہ ہر ایک دیکھنے والا اس جہانِ عظیم کے حیرت انگیز نظم کی اہمیت کا پتہ چلا سکے اس کے ایک گوشہ میں بدنظمی نام کا ایک سیاہ نقطہ لگا دے (یقیناً سیاہ ہماری نظر کے لحاظ سے اور بدنظمی بھی ہماری نظر کے لحاظ سے ہے) یہ تو عین نظم ہے نہ کہ بدنظمی۔

اگر ہمارے بدن کی تمام منظم مشنریوں کے ہوتے ہوئے جن کا نظم و ضبط ہر عضو سے بلکہ ہر ایک خلیہ سے بخوبی نمایاں اور ظاہر ہے ایک جوڑ بے مصرف (یقیناً جیسا کہ آج کی سائنس نے بتایا ہے) چھوٹے لپتان' اس تمام حیرت انگیز نظم کو سمجھنے کے لئے دیئے گئے ہیں تو اس میں کونسی قباحت ہے تا کہ ہم تقابل کر کے اس عظیم کارخانہ کے نظم کی اہمیت کا پتہ چلا سکیں اور جان سکیں۔ورنہ ممکن تھا کہ تمام بدن ہی بدنظمیوں سے بھرا ہوتا لیکن ایسا نہیں ہے پس یقیناً کسی فوق العادہ قدرت اور عقل کا ہاتھ اس کے بنانے

میں کارفرما ہے۔

اس موضوع کی جانب توجہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کے بدن میں بدنظمی کے نام سے اور طبیعت میں طوفانوں اور زلزلوں کی صورت میں جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ ان منظم کارخانوں کے مقابلے میں ایسا ہی ہے جیسے کسی بڑے جسم پر ایک نقطہ البتہ ہم آج کے ناقص علوم ک ذریعہ (خصوصاً گذشتہ صفحات کی بحث کو پیش نظر رکھتے ہوئے) یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے کہ یہ حادثات بے فائدہ ہیں فرض کیجئے اگر ایسا ہے بھی تو اس میں کونسا امر مانع ہے جبکہ وہ ان دوسرے بڑے فائدوں یعنی عالم موجودات کے حیرت انگیز نظم کی نشاندہی کی غرض سے ہوں؟

اس کے علاوہ ہم خدا کی نعمتوں اور بخششوں کے ایک دریا میں ڈوبے ہوئے ہیں۔اگر وقتاً فوقتاً عارضی طور پر بیماریوں کی وجہ سے ہم ان بخششوں سے محروم نہ ہوں تو پھر کس طرح ہم اس کے وجود کی اہمیت کو سمجھ سکیں گے اور اس کی قدر کر سکیں گے؟ آپ غور کریں اگر دنیا میں بیماری بالکل نہ ہوتی تو ہم یہ سمجھ ہی نہ سکتے تھے کہ بدن کی سلامتی کس قدر عظیم نعمت ہے۔اگر رات کی تاریکی کا پردہ نہ ہوتا تو کیا ہم جان سکتے تھے کہ سورج کے نور کی موجیں جو دن بھر ہم پر ضیا پاشی کرتی ہیں کس قدر گراں بہا نعمت ہیں، اگر وقت بے وقت زمین تھوڑی دیر کے لئے ہمارے قدموں کے نیچے نہ لرزتی تو کیا ہمیں زمین کے امن وسکون کی قدر معلوم ہوتی؟ اگر کبھی قحط نہ پڑتا تو کیا ہم اپنی زندگی میں صحیح طور پر کبھی بارش کے اصلی مقصد کی جانب توجہ دیتے؟

زندگی اور حیات کے سلسلے میں خدا کی عطا کردہ بخششوں کی طرف ہماری پوری توجہ مبذول کرانے اور اس کی پوری قدردانی کروانے کے لئے کبھی کبھی ان میں تھوڑا سا تغیر آئے اور ہمیں اس عظیم اور قابل قدر حقیقت سے واقف کرائے تو کونسا امر مانع ہے۔یہ مختصر اور وقتی تغیرات وہی ہیں جنھیں ہم "بلا" کہتے ہیں کیا اس نکتہ پر توجہ مبذول کرنے سے یہ بلائیں' انسانی معاشرہ کے لئے سبق آموز نہیں بن جاتیں! پس اگر ہم کہیں کہ "بلائیں بڑی نعمت ہیں" تو آپ تعجب نہ کریں لیکن ان "ناگوار حادثات" کا فائدہ صرف یہی نہیں ہے بلکہ اور بھی بڑے فائدے ہیں جن کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔

ہوشیار رہو کی صدا

بھول بھی ضروری ہے لیکن اتنی زیادہ نہیں!

کس ذریعے سے یہ حالت متوازن ہوتی ہے؟

کس طرح انسان اپنی ناتوانی کا اعتراف کرتا ہے؟

مادہ پرستوں کے اس اعتراض کے متعلق کہ "بلاؤں' آفتوں' بیماریوں' ناکامیوں اور ان جیسی چیزوں کا وجود عالم کائنات کے اس سرے سے اس سرے تک توحید کی قبولیت اور نظم و حکمت کے وجود کے ساتھ کس طرح ہم آہنگ ہے؟" ہم نے اس پر کافی بحث اور گفتگو کی ہے لیکن یہ آخری حصہ ہے جس میں ہم اس اعتراض کے بارے میں بحث کریں گے۔

غفلت اور بھول بھی ضروری ہے

ایک موحد اور خدا شناس کی نظر سے دیکھا جائے تو پوری دنیا میں کوئی بھی چیز بے فائدہ' بے مصرف' غلط نقصان دہ اور ناموزوں نہیں ہے اور اس لحاظ سے تمام انسانی صفات اور عادات خواہ ہم اسے اچھا سمجھیں یا برا' سب ہی اچھی اور ضروری اور درست ہیں۔ مثلاً خود پسندی' جاہ طلبی اور دنیا پرستی کے جذبہ کی بنیاد جینے کی خواہش اور مظاہر حیات پر مبنی ہے جو زندگی کے ستونوں کا بنیادی جزء ہے۔ ان غرائز حیاتی میں افراط اور تفریط سے بربادی اور بدنصیبی حاصل ہوتی ہے۔ یوں تو انسان کے تمام وجود میں کوئی چیز زائد یا ناموزوں نہیں ہے اور جو کچھ موجود ہے وہ اپنے وجود کے لحاظ سے مکمل ہے۔ زندگی کی محبت میں افراط دنیا پرستی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور اپنی حیثیت اور شخصیت کے حدود سے آگے بڑھ جانے کا عمل جاہ طلبی کی وجہ سے عمل میں آتا ہے۔

انسان کے وجود کے اندر بنیادی طور پر جو صفات اور حالات موجود ہیں یا موجود ہونے چاہئیں وہ "غفلت" اور "بھول" ہیں۔ انسان کا کوئی عزیز مر جاتا ہے یا تجارت میں نقصان ہو جاتا ہے یا میدان جنگ میں رقیب کے مقابل میں شکست ہو جاتی ہے، خلاصہ یہ کہ اگر زندگی میں کسی بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے تو وہ احساس کرتا ہے کہ اس کے دماغ پر غم و اندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اور اس کا دماغ بوجھ تلے دبے جا رہا ہے اور اس دباؤ سے اعصاب چٹخنے کے قریب ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ کیفیت جاری رہے تو اس کا یہی حال ہوگا لیکن کچھ وقت نہیں گزرتا کہ غفلت' بھول اور بے خبری کے پردے (جس طرح گرمیوں کی تیز دھوپ کو ابر رحمت ڈھانک دیتا ہے یا جس طرح بیابان میں سفر کرنیوالوں کے سروں پر وہ (ابر) سایہ رحمت ڈالتا ہے) اس کے دل کو ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں اور اس کے بعد اس کی جان اور اس کی فکر میں ایک سکون کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور اگر یہ واقعہ پیش نہ آتا تو انسان چھوٹے چھوٹے مصائب اور ناکامیوں کے بعد ہمت ہار دیتا۔ اس لئے "غفلت اور بھول" اپنے مقام پر انسان کی زندگی اور بقاء کی ضامن اور زندگی کے گوناگوں حوادث کے مقابلے میں ان کی پشت پناہ بھی ہیں۔

یہ جذبہ کس طرح معتدل ہو سکتا ہے؟

لیکن اگر اس حالت میں غفلت اور بے خبری حد سے گزر جائے اور انسان تمام چیزوں سے بے خبر اور غافل ہوجائے اور ان امور کے بارے میں جس میں اس کی توجہ اس کی زندگی اور اس کی نیک بختی کے لئے ضروری ہے، وہاں بھی وہ غفلت کرے تو یہ بھی اس کے لئے مہلک ہے۔

اس جذبہ میں اعتدال باقی رکھنے کے لئے وقتاً فوقتاً اور جدت ہوتی ہے۔

یہ بات درست ہے کہ "زندگی کی ناکامیوں" سے ناراحتی پیدا ہوتی ہے لیکن اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ وہی کامیابی سے بھی غفلت اور گمراہی پیدا ہوتی ہے۔

تجربہ سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ جو لوگ ہمیشہ کامیاب اور کامران رہتے ہیں وہ بے حس ہوتے ہیں۔ ان میں ایجاد کا مادہ کم ہوتا ہے۔ وہ مہربانی کے جذبہ انسانی سے خالی، اکھڑ، سخت گیر اور بے لچک ہوتے ہیں ہمیشہ ان کا ایک ہی حال رہتا ہے اور وہ غرور، مستی، غفلت بے خبری اور بے توجہی کی حالت میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کے مقابل میں وہ افراد جنھوں نے زندگی میں ناکامیاں دیکھی ہوں بیدار، چوکس، مہربان، پرعزم روشن خیال اور چارہ جوئی کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہ وہ حقیقتیں ہیں جن کے لئے ثبوت و دلیل کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اور ہر شخص مختصر سے مطالعہ اور تحقیق سے اپنے اور دوسروں کے حالات کا اندازہ کرسکتا ہے۔

بڑے بڑے جابر اور آمر جب اپنے اقتدار سے محروم ہوجاتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ موٹے موٹے پردے ان کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گئے ہیں۔ اب تک وہ ان باتوں کے سمجھنے کی قدرت ہی نہ رکھتے تھے اب انھیں روشنی نظر آتی ہے اور اب وہ ان باتوں کو محسوس کرتے ہیں۔

سنگدل مالدار لوگ جب زوال سے ہمکنار ہوتے ہیں اور ان کا سرمایہ اور مال ضائع ہوجاتا ہے تو انھیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اک نئی دنیا میں داخل ہوگئے ہیں اور اب ان پر نئی چیزوں کا انکشاف ہورہا ہے۔ وہ آرزو کرتے ہیں کہ کاش ہمارا حال پہلے سے ہی ایسا ہوتا اور ہم ان مواقع سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکتے کس طرح انسان اپنی ناتوانی کا اعتراف کرتی ہے؟

وہ انسان جسکے آسمان پر اڑنے کے خوابوں کو سائنسی ترقیوں اور کامیابیوں نے اس کے لئے حقیقت

بنا دیا اور "بجلی" بخالات ایٹم اور فطرت کی تمام قوتیں اس کی فرمانبردار بن چکی ہیں اور اس کی زندگی میں ایک تازہ رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ ممکن ہے وہ اپنی قدرت پر اس قدر مغرور ہوجائے اور اپنی کمزوری اور ناتوانی کی وجہ سے اس قدرت کے مقابلہ میں جس نے اس عالم کائنات کو وجود بخشا ہے بے خبر رہ جائے اور زندگی اور حیات کے مقصد کو بالکل بھول جاتے اور اپنی زندگی شہوت رانی میں گزار دے اور تمام اخلاقی اقدار کو پامال کردے اور کھلم کھلا لوگوں کی حق تلفی شروع کردے۔

اچانک ایک زلزلہ دنیا کے کسی حصہ سے رونما ہوتا ہے یعنی پر سکون زمین تھوڑی سی متحرک ہوتی ہے اور اس کی (انسان کی) زندگی کو ایسا دھکا پہنچاتا ہے کہ اس کے مقابل اسکی تمام قوتیں بے کار ہوجاتی ہیں ساحلی پہاڑوں کی بڑی بڑی چٹانیں سمندر میں گر پڑتی ہیں اور وہ جہاز جو ساحل پر لنگر انداز ہوتے ہیں ساحل پر چڑھ جاتے ہیں اور سمندر کا پانی اور زمین سب گڈمڈ ہوجاتے ہیں اور ایک عظیم شور برپا ہوجاتا ہے۔ وہ طاقتور سلطنتیں جو آسمانوں کو تسخیر کرنے کے لئے سرگرم عمل ہیں ان کی مدد کے لئے دوڑتی ہیں لیکن بہت جلد انھیں معلوم ہوجاتا ہے کہ اس فطرت کے قہر سے مقابلہ کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ صرف ایک کام انجام دیا جاسکتا ہے وہ وہ کہ چند آدمیوں کو اس کام پر مامور کیا جائے کہ وہ اس مصیبت زدہ سرزمین پر ہوائی جہازوں کے ذریعہ خوراک اور لباس پھینکیں اور بھاگ جائیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ حادثہ یا اس جیسے ہر زمانے میں وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا افکار پر گہرا اثر رہتا ہے۔ وہ عقلوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں غفلت اور بھول کے پردے کچھ کچھ اٹھنے لگتے ہیں اور خود بخود انسان کی جان و روح پر ایک عمدہ اثر مترتب ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ انسان اسکے اثرات سے مکمل طور پر واقف نہ ہو لیکن وہ "بے خبر و بے امان" پر اپنا کافی اثر چھوڑ جاتے ہیں۔

کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بلائیں جو اس غفلت، مستی اور بے خبری کی دائمی حالت سے جہاں انسانیت کی طرف متوجہ کرتی ہیں ان بلاؤں سے کم ہیں بلکہ اسکے برعکس وہ اس سے کئی درجہ زیادہ اور بڑھ کر ہونگی۔

خصوصاً اسلئے آگاہ اور بیدار افراد جن کے دلوں میں اس عظیم کارخانہ کی عظمت موجود ہے ان

حوادث سے مختلف اسباق حاصل کرتے ہیں اور ان چیزوں تک دلیوں کی بناء پر پہنچے تھے ان کو اپنی آنکھ سے واضح طور پر دیکھ لیتے ہیں اور آفریدگار جہانِ ہستی کو زیادہ سے زیادہ پہچان لیتے ہیں۔

چھٹا اعتراض

اشکال ششم

یہ "نظم" بد نظمی کی وجہ سے ہے۔

(تدریجی ارتقاء)

منجملہ ان بنیادی اعتراضات کے جو سابقہ لوگوں کے کلمات میں پائے جاتے ہیں حتّٰی کہ مشہور حکیم "ملا صدرا شیرازی" اپنی مشہور کتاب "اسفار" میں مشہور یونانی فلسفی (جو ۲۴۰۰ سال پہلے یعنی پانچویں صدی قبل مسیح میں موجود تھا) کے حوالہ سے جو اعتراض نقل کیا ہے وہ اعتراض "تدریجی ارتقاء" سے تعلق ہے۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ مادہ پرست کہتے ہیں:

"سب سے زیادہ محکم دلیل اور سب سے زیادہ بنیادی راستہ جو توحید اور خدا کے ثابت کرنے کا ہے وہ وہی "نظم" ہے جو پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے لیکن یہ "نظم" اس وقت اس بات کی دلیل بن سکتا جبکہ وہ دنیا کے پہلے روز سے اس کے ساتھ ہوتا اور اسی طرح وجود میں آیا ہوتا اور ایسی صورت میں ممکن ہی کہ ہزاروں ناقص، غیر موزوں اور بے ترتیب وجوٗ پیدائش عالم کے وقت موجود ہوں اور اربوں سال کے گزرنے کے بعد یہ نقائص کم ہوتے گئے اور ہزاروں تغیرات اور تبدیلیوں کے بعد رفتہ رفتہ اس میں کمال پیدا ہوتی کہ مجودہ شکل اختیار کی۔ اس لحاظ سے موجودہ نظم کمال تدریجی کے ایک سلسلہ کی پیداوار ہے اور ایسی صورت میں کیا عجب کہ وہ کسی حادثہ کی پیداوار ہو۔

بالکل صاف الفاظ میں آپ یہ کہتے ہیں کہ: دنیا کسی حادثہ کا نتیجہ نہیں ہو سکتی کیونکہ حادثہ کی بناء پر نظم کا پیدا ہونا ممکن نہیں لیکن ہم یہ تو نہیں کہتے کہ ایک حادثہ نے ہی اس دنیا کو وجود بخشا ہے لیکن اس کا امکان ہے کہ ہزاروں غیر منظم اور بے فائدہ موجودات کے ٹکراؤ سے ہزاروں جانور اور ناقص و بے ترتیب نباتات پیدا ہوئے اور چونکہ ان میں بقا کی پوری شرطیں مکمل طور پر موجود نہ تھیں ناقص حصے رفتہ

رفتہ غائب ہوتے گئے اور موزوں حصے باقی رہ گئے اور ان حصوں نے موجودہ صورت اختیار کر لی ہے۔

"ڈیڈرو" جو اٹھارویں صدی عیسوی کا فلسفی ہے (۱۷۱۳۔۱۷۸۴) وہ اس نظریہ کا طرفدار تھا وہ کہتا ہے "ہم موجودہ مخلوقات کو دیکھتے ہیں اور انھیں مکمل پاتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ وہ فطرتاً کس قدر ناقص پیدا ہوتے یہاں تک کہ حیات کے اس درجہ تک وہ پہنچے ہیں"

بہر حال آج چند مادہ پرست اس اشکال پر فریفتہ ہو چکے ہیں اور اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ دراصل یہ ڈارون کے نظریہ "انتخاب طبیعی" کی توسیع شدہ "اشکال" ہے کیونکہ وہ اکیلا ہی "عالم جانداروں" کے سلسلہ میں یہ عقیدہ رکھتا تھا۔ اور اس نظریہ کے ماسیوں نے اس کا تمام چیزوں پر بلکہ تمام موجودات پر اطلاق کیا اور عجب نہیں کہ ڈارون نے بھی اپنے عقیدہ کی بنیاد اسی نظریہ پر قائم کی ہو۔

"جواب"

یہاں پر بھی مطلب واضح کرنے کے لئے چند باتوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

۱۔ حساب احتمالات اس دلیل کو مسترد کر دیتا ہے۔

اگر آپ کا یہ خیال ہو کہ "نظم" کی دلیل کو ریاضی کے ایک روشن قالب میں ڈھال کر ہم اسے ثابت کر دینگے تو یہ بات محال ہے کہ موجودہ "نظم" کسی حادثہ کا نتیجہ ہوگا اور یہ اعتراض بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ احتمال (تدریجی ارتقاء کا) اس استدلال کے مقابلہ میں ٹک نہیں سکتا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہم نے کہا تھا جو عبارت تعبیر ہوتی ہے اسکے وجود کے احتمال کے بارے میں حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے صحیح اور منظم موجود کا ان دیگر احتمالات کے ساتھ کیا تناسب ہے مثلاً جب ہم قلم کو کاغذ پر رکھ کر اپنی نظریں گاڑ دیں اور قلم کو گردش دیں تو پھر چند احتمالات ہیں۔ احتمال ہے کہ ایک خط بصورت الف کھینچ جائے یا بصورت منحنی اور وہ بھی مختلف وضع کے ساتھ۔ خلاصہ یہ کہ ایک حرف کے پیدا ہونے کے متعلق ہزاروں احتمالات ہیں جن میں سے ایک احتمال تو صحیح ہو سکتا ہے اور باقی سب غلط۔ اس وقت ایک کلمہ یا ایک جملہ کی پیدائش کے لئے لاکھوں احتمالات ہیں اور ایک قصیدہ یا ایک علمی و تاریخی مقالہ کی پیدائش کے لئے اس قدر احتمالات ہو سکتے ہیں جس کے لئے

ہمارے پاس کوئی عدد موجود نہیں ہے یعنی اس کے لئے بے انتہا احتمالات اور بے اور انتہا حالتوں کا امکان ہے جس میں سے صرف ایک حالت صحیح اور ایک ات منظم اور موزوں ہوگی۔ ایسی صورت میں کہ اس ایک احتمال کی نسبت ان تمام احتمالات کے مقابلہ میں صفر کے برابر ہے (اس سلسلہ میں مفصل بحث کتاب کے شروع میں دلیل نظم سے بیان میں ہو چکی ہے) اس بناء پر ہم کہتے ہیں کہ یہ موجودہ نظم جس ترتیب اور جس حساب سے بھی وجود میں آیا ہو حساب احتمالات کی رو سے محال ہے کہ وہ حادثہ کی پیداوار ہو۔

ہم اگر بالفرض ''کرسٹوفر کلمب کولمبس'' کے ساتھ براعظم امریکہ میں پہنچ جائیں اور ہمیں وہاں کوئی انسان یا کوئی مقامی باشندہ نظر نہ آئے بلکہ ہمیں صرف ایک بڑے شہر کے آثار نظر آئیں جس میں کوئی آبادی نہ ہو جس میں منظم سڑکیں اور قسم قسم کی بہت عمدہ اور نازک کام کی ہوئی عمارتیں اور مجسمے اور آبرسانی کے نہایت مرتب سلسلے اور باترتیب درخت اور باغات موجود ہوں جو اپنے بنانے والے کی عقل و دانش کا پتہ دیتے ہوں ۔ اگر تمام دنیا کے لوگ ہم سے کہیں کہ یہ آثار عوامل طبیعی ک حادثہ کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہوئے ہیں جنھیں ان مختلف ناقص اور غیر ناقص آثار نے اربوں سال کا عرصہ طے کرنے کے بعد وجود بخشا ہے جن میں سے اب صرف یہی آثار باقی رہ گئے ہیں اور باقی تمام آثار ختم ہو چکے ہیں اور ان کے پیدا کرنے میں کسی ذی ہوش موجود کا ہاتھ نہیں رہا ہے تو کیا ہم باور کریںگے؟ یا اسکے برعکس بات کو قبول کریںگے اور بلا پس و پیش تسلیم کریںگے کہ اس عظیم شہر کی تعمیر میں کسی صاحب عقل موجود کا ہاتھ کارفرما رہا ہے۔

اسی طرح اگر مثال کے طور پر کتاب ''قانون بوعلی سینا'' یا کوئی اور کتاب ہمارے ہاتھ میں دیدی جائے تو کیا کسی وقت ہمارا یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کے صفحات کو لاکھوں بے علم لوگوں کے ہاتھ لگنے کے سبب سے یہ کتاب وجود میں آ گئی اور اربوں ناقص اوراق ایک حادثہ کے نتیجہ میں کامل بن کر وجود میں آ گئے ہیں اور ناقص کتابیں آہستہ آہستہ درمیان سے غائب ہو گئیں چونکہ وہ لوگوں کے لئے قابل استفادہ نہ تھیں اسلئے کسی نے اسے محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کی تھی تو کیا یہ بات عاقلانہ ہوگی؟

۲۔ بقا کی شرطیں اور کمال کی شرطیں

اگر یہ بات درست ہوتی یعنی آپ کے کہنے کے مطابق اربوں موجودات غیر منظم اور ناقص تھے اور ان میں سے بعض غیر منظم موجودات میں باقی رہنے کی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے رفتہ رفتہ درمیان سے غائب ہو گئے اور جن میں باقی رہنے کی صلاحیت تھی باقی رہ گئے۔ کہہ سکتے ہیں کہ صرف یہی ایک چیز ہے (یعنی تدریجی ارتقاء) جو ''نظم'' کو وجود بخش سکتی ہے کیونکہ یہی موجودات کے وجود کی پہلی شرط ہے لیکن یہ ان دوسرے کمالات کی ضامن نہیں ہو سکتی جو (کمالات) ان کی زندگی میں دخیل نہیں ہیں (غور کیجئے) اس کی تفصیل یہ ہے کہ جو ''نظم'' موجود مخلوقات میں دیکھا جا رہا ہے اس کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ نظم ہے جو موجودات کی زندگی اور بقاء کے لئے لازمی ہے یا بالفاظ دیگر وہ عوامل جن کے فنا ہونے کے ساتھ ہی موجودات بھی فنا ہو جاتے ہیں اور دوسرا گروہ ان عوامل اور قوانین کا سلسلہ ہے جن کا وجود موجودات کی زندگی اور بقاء میں کوئی اثر نہیں رکھتا اور ان کا کمال ان کے زیر سایہ تحفظ پاتا ہے لیکن ان کا فقدان موجود کی نابودی اور فنا کا موجب نہیں ہوتا اور صرف ان کے نہونے سے موجود کی زندگی زحمتوں میں مبتلا ہو جاتی ہے اور اس کا آرام ختم ہو جاتا ہے۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ تدریجی ارتقاء سے صرف پہلی صورت کی وضاحت کی جا سکتی ہے کیونکہ اس نظریہ کے موجب ناقص موجودات بقاء کی عدم استعداد کی وجہ سے درمیان سے ہٹ جاتے ہیں اور باقی رہنے والی چیزیں اپنے اندر صلاحیت رکھنے کی وجہ سے باقی رہ جاتی ہے لیکن دوسرا گروہ جسکا کوئی تعلق موجودات کی بقاو حیات کے ساتھ نہیں ہوتا تو اس نظریہ سے اس کی کس طرح توجیہ کی جا سکتی ہے؟

نمونہ کے طور پر ہم نے ہزاروں مثالوں میں سے چند مثالیں منتخب کی ہیں تا کہ یہ حقیقت واضح ہو جاتے۔

الف۔ انسان کے بدن میں بے شمار ایسی خصوصیات ہیں کہ اگر وہ ہوتیں تو انسان کی زندگی میں کوئی فرق نہ پڑتا مثلاً اگر بالوں کے گانٹھ کے پہلو میں چربی کے غدود بالوں کو نرم کرنے کے لئے اور کان کی تو اور اس کے کئی زاویے' آواز کی موجوں کو جمع کرنے کے لئے نہ ہوتے۔ اگر آنکھ کی پلکیں گرد و غبار سے بچاؤ کے لئے اور پتلی کی سیاہی' امواج نور کی جمع کرنے کے لئے اور خمیدہ عدسوں کی غیر معمولی قوت

دو روز دیک کے مناظر میں مطابقت پیدا کرنے کے لئے اور دندان ثنایا کاٹنے کے لئے اور کونچلیاں ٹکڑے کرنے کے لئے اور اثنا عشری دانت نرم کرنے کے لئے اس قدر غیر معمولی نظم وضبط کے ساتھ موجود نہ ہوتے۔ اگر ہتھیلیوں کے خطوط جو چیزوں کو پھسلنے سے روکتے ہیں اور ہاتھ پاؤں کی انگلیاں جو موجودہ صورت کے لحاظ سے مختلف ہیں اور قسم قسم کے کام انجام دیتی ہیں اور ان جیسی سینکڑوں چیزیں نہ ہوتیں تو کیا انسان کی زندگی معطل ہو جاتی؟ یا اسے (انسان کو) ہلاکت میں ڈال دیتی؟ یقیناً نہیں۔ زندگی جو الجھنوں سے بھری ہوئی ہے اور سینکڑوں مصیبتوں سے وابستہ ہے اور زندگی کے فوائد سے پوری طرح بہرہ ور نہیں ہوتی کیا تدریجی ارتقاء کا قانون، انسان کے بدن میں ان مفادات کی موجودگی کی کوئی توجیہ کر سکتا ہے؟

ب۔ اسی طرح اگر کرۂ زمین میں قسم قسم کی معدنیات، برقی قوت اور موجودات میں ایٹمی قوت وغیر موجود نہ ہوتی، اگر زمین کے تمام خشک حصے جنوبی نصف کرہ میں اور اکثر سمندر شمالی کرہ میں ہوتے۔ اگر کرۂ زمین کے نشیب و فراز موجودہ حالت سے زیادہ پست و بلند ہوتے یا تمام سمندر، بحر مردار کی طرح نمک سے بھرے ہوتے جن میں کوئی مخلوق زندہ نہ رہ سکتی یہ سرزمین ویران ہو جاتی اور ان کی زندگی تباہ ہو جاتی۔

ج۔ اگر پرندوں کے جسم پروں سے ڈھکے نہ ہوتے اور اگر ان کی شکل نکلے جیسے ہوتی اور اگر ان کا وزن زمینی جانداروں سے سبک تر نہ ہوتا یا اگر وہ سب چمگادڑ کی طرح وزنی ہوتے اور ان میں بھی وہی صفتیں ہوتیں تو کیا وہ سب (پرندے) ختم ہو جاتے؟ یقیناً نہیں۔ لیکن ان کو وہ کامل راحت نہ ملتی اور وہ زندگی سے پوری طرح فائدہ نہ اٹھا سکتے۔

خلاصہ یہ کہ اس جہان ہستی کے انتظام کا دائرہ "تدریجی ارتقا" کی بحث کے محور سے بہت زیادہ وسیع ہے کیونکہ اس بحث کا محور صرف "انتخاب طبیعی" "بقاء اصلح" (بہتر چیز کا باقی رہ جانا) اور ناقص اور غیر مناسب موجودات کے درمیان سے نکل جانے کے موضوع کے دائرہ کے اطراف گردش کر رہا ہے اور ظاہر ہے کہ اس طرح نظم عالم کے صرف اس حصہ پر (یعنی جو بقاء اور حیات کی شرائط کے

تابع ہو) اس کا اطلاق ہوگا لیکن ایسے کمالات اور دقیق کاموں جو موجودات کی زندگی میں دخیل نہیں ہیں ان کا مصداق نہیں بن سکتے۔ یہ بات ایک اور دوسری سادہ مثال سے روشن ہو جائیگی۔

اگر کسی پہاڑ میں متعدد غاروں کے آثار موجود ہوں جو ہزاروں سال پہلے موجود تھے اور ہم دیکھیں کہ ان میں سے صرف ایک وسیع غار باقی رہ گیا ہے اور باقی تمام غائب ہو چکے ہیں تو ہم کہیں گے کہ وہ طبیعی علل وعوامل کی بنیاد پر آہستہ آہستہ غائب ہو چکے ہیں اور یہ غار صرف اپنے استحکام کی وجہ سے جو ان کے پتھروں میں تھا انتخاب طبیعی اور بقاء اصلح کے اثر سے باقی رہ گیا ہے لیکن اگر ابھرے ہوئے نقوش اور رنگین اور خوبصورت آثار اس غار کے درو دیوار پر ہوں تو ہم ان آثار کو ہرگز "انتخاب طبیعی" اور "بقاء اصلح" کے معلول نہیں سمجھیں گے کیونکہ جو چیز اس اصل کے ساتھ مربوط ہے وہی غار کے استحکام کی اور اس کی بقاء کی بنیاد ہے نہ کہ یہ اضافی خصوصیات جن کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہے اس لحاظ سے یہ تمام نازک اور پیچیدہ کام اور یہ تمام لطافت و نزاکت جو موجودات جہاں میں موجود ہے بخوبی ثابت کرتے ہیں کہ کمال کا مقام زندگی کی بنیادی شرائط کی بہت بلند سطح پر واقع ہے اور اس میں واضح طور پر بلند فکر اور مقصد کے آثار نمایاں ہیں۔

۴۔ ارتقاو کمال کا سلسلہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟

پہلے اور دوسرے اشکال سے قطع نظر یہ اشکال درپیش ہے کہ اگر سچ مچ ایسا ہے تو ان ناموزوں اور ناقص موجودات کے لاکھوں بلکہ اربوں آثار طبقاتِ زمین میں کھنڈرات کی شکل میں ہمیں نظر آتے جو اس نظریہ کی تائید کرتے اور اس سے یہ ثابت ہوتا کہ یہ انتخاب شدہ منظم موجودات ہزاروں غیر منظم موجودات میں سے ہیں لیکن علم آثار قدیمہ اس کے برعکس ثابت کرتا ہے۔ ہم جتنا پیچھے جائیں گے اور زمین کے مختلف علاقوں میں گزری ہوئی مخلوقات کے آثار پر غور کریں گے تو دیکھیں گے کہ ان میں سے بعض، موجودہ مخلوقات سے کچھ فرق رکھتی ہیں لیکن وہ خود اپنی جگہ منظم ہیں۔ ایک سادہ نقش کو وجود میں لانے کے لئے ہزاروں اوراق باطلہ کو حادثہ کے طور پر وجود میں آنا پڑتا ہے ایسی صورت میں اس عالم ہستی کے ان عجیب نقوش کو پیدا کرنیوالے اوراق باطلہ کی تعداد اربوں سے بھی زیادہ ہو جاتی

ہے وہ (اوراق) کہاں ہیں۔ آپ اس کا جواب کیوں نہیں دیتے؟

ساتواں اعتراض

اشکال ہفتم

کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی چیز عدم سے وجود میں آئے؟

مجملہ ان اعتراضات کے جو کبھی مادہ پرستوں کی جانب سے خدا پرستوں پر کئے جاتے تھے مسئلہ "ابداع" "(تخلیق) ہے اگرچہ اس اعتراض میں کوئی زیادہ علمی پہلو نہیں ہے لیکن اس علمی صورت اور لباس میں بیان کیا گیا ہے اور تبلیغی لحاظ سے یہ موثر ہے۔

کہتے ہیں: "ماہرین علم الٰہیات کے عقیدہ کے مطابق یہ دنیا حادث (جدید) ہے اور عدم سے وجود میں آئی ہے ہم سوال کرتے ہیں کہ کیا کوئی عدم کسی چیز کے وجود کا سبب بن سکتا ہے؟ عدم ایسی چیز نہیں ہے جو کسی چیز کے وجود کا ثابت شدہ ہے کہ کسی عدمِ شے کا کسی شے کے وجود کا سبب بنا ممکن نہیں ہے اور یہ بات بھی ہم جانتے ہیں کہ وجود اور عدم ایک دوسرے کی ضد ہیں پس کس طرح ممکن ہے کہ "عدم" "وجود" کا سبب بن سکے؟ اور آپ کی بات زیادہ سادہ الفاظ میں یہ ہے کہ اے خدا پرستو! تم اس بات کے معتقد ہو کہ دنیا حادثہ ہے اور نیستی سے ہست ہوئی ہے لیکن ممکن ہے وہ نیستی اصل ومنشا ہستی ہو؟"

اور اس بات کا بھی اضافہ کرتے ہیں کہ: "ہر حادث کے لئے ضروری ہے کہ زمان ومکان میں واقع ہو کیا دنیا کے وجود میں آنے سے پہلے بھی زمان ومکان کا تصور کیا جا سکتا ہے تا کہ وہ پیدائش عالم ظرف بن سکے؟"

اس لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ دنیا قدیم وازلی ہے یعنی ہمیشہ سے تھی اور ہے ظاہر ہے کہ ایسی چیز کسی سبب وعلت کی محتاج نہیں ہے۔

جواب

یہ اعتراض دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ عدم کس طرح وجود کا سرچشمہ بن سکتا ہے اور دوسرا یہ کہ اگر دنیا حادث ہے تو زمان ومکان کی محتاج ہے اور اس کے وجود سے پہلے زمان ومکان موجود نہ تھے۔ ہم ہر حصہ کا علیحدہ جواب دینگے لیکن حصہ اوّل کئی لحاظ سے قابل بحث ہے۔

۱۔ اس اشکال اعتراض کا حل اگر چہ ہماری نظر میں نہایت سادہ اور واضح ہے لیکن یہ جاننا چاہئے کہ مادہ پرست لوگ اس اشکال اعتراض سے مستثنٰی نہیں ہیں اور یہ اعتراض ان پر بھی وارد ہوتا ہے۔

اسکی تفصیل یہ ہے کہ: مادہ پرستوں کا اعتقاد ہے کہ دنیا کا مادہ قدیم اور ازلی ہے اور ہمیشہ اس میں تغیر وتبدل ہوتا رہتا ہے اور ایک شکل سے دوسری شکل میں منتقل ہوتا رہتا ہے حتٰی کہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دنیا کے مادہ میں ازل سے اب تک نہ کوئی کمی ہوئی ہے اور نہ اس میں کوئی اضافہ ہوا ہے اور اسکے تمام تغیرات اور تبدلات صرف اس کی شکل میں ہوئے ہیں۔

اس لحاظ سے دنیا کے موجودات کی موجودہ صورت اور اسی طرح اس سے قبل کی صورتیں تمام حادث تھیں کیونکہ ہر ایک عدم کے پیچھے آیا ہوا ہے اور ان کا وجود یکے بعد دیگرے چلا آ رہا ہے لہٰذا یہ شکلیں جو "موجودات کی صورت" کی شکل میں موجود ہیں ان کے اپنے عقیدے کے مطابق حادث ہیں۔ یہ بات ان کے لئے قابل غور ہے کیونکہ صورت اور کیفیت کا بھی اپنی جگہ ایک وجود ہے اور یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ عدم سے وجود میں آئی ہیں یعنی وہی اعتراض جو وہ "مادہ" کے وجود کے بارہ میں خدا پرستوں پر کرتے ہیں "صورت" کی شکل میں ان پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اس

بات کو ایک سادہ سی مثال کی صورت میں بیان کریں تا کہ مطلب پوری واضح ہو جائے۔

فرض کیجئے کہ ہم نے قلم ہاتھ میں لیکر کسی اپنے عزیز دوست کو خط لکھا یا موسم بہار کے کسی خوبصورت منظر کی تصویر کاغذ پر کھینچی تو مادہ پرست کہتا ہے:

اس سیاہی اور کاغذ کا مادہ ازلی اور قدیم ہے لیکن اس شکل اور صورت کو جس کا اثر پہلے کاغذ پر موجود نہ تھا اور جو ہمارے ہاتھوں کے توسط سے وجود میں آئی ہے ازلی اور قدیم نہیں سمجھا جا سکتا اور اسے مجبوراً حادث کہنا پڑتا ہے۔"

اب میں کہنے کا موقع ملتا ہے کہ یہ شکل وصورت جو تمھارے خیال میں حادث ہے کس طرح عدم سے وجود میں آ گئی۔ کیا عدم، وجود کا سرچشمہ ہو سکتا ہے؟

ہر چند مادہ پرستوں نے موجودات کے اس شکل وصورت والے اعتراض کا جواب دیا ہے لیکن ہم بھی ان کے مادۂ عالم کے بارے میں بار بار پوچھتے رہے ہیں چنانچہ اس اشکال کا وہ کوئی جواب تیار نہ کر سکے۔ اب ان کو اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ کہیں: "یہ اشکال مکتب الہیین کے لحاظ سے ناقابل حل اور مادہ پرستوں کے مکتب کے لحاظ سے قابل حل ہے۔"

۲۔ اگر اشکال مذکور کے بارہ میں تھوڑا سا غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ اشکال اس جگہ سے پیدا ہوا ہے جہاں لفظ "سے" استعمال ہوا ہے وہ اس معنٰی میں ہے جو ان جملوں میں ("مکان کو اینٹ پتھر اور گارے سے بنایا گیا ہے" "کاغذ کو روئی سے اور میز کا لکڑی سے" اور "لباس کو اون سے بنایا گیا ہے") استعمال ہوا ہے۔ جس طرح اس جملہ میں لفظ "سے" مادی علیت اور ایک موجود کے اصلی سرچشمہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ "دنیا عدم سے وجود میں آئی ہے" کے جملہ میں بھی اسکے یہی معنی لئے گئے ہیں حالانکہ اس جگہ یہ معنی مطلوب نہ تھے وہ علت مادی کے طور پر استعمال نہ ہوا ہے بلکہ منشاء یہ ہے دنیا پہلے وجود نہ رکھتی تھی اور بعد میں پیدا ہوتی اور بالفاظ دیگر یہ جملہ "حدوثِ عالم" (دنیا کا پیدا ہونا) کے معنی سمجھانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے اس کے کہنے کا ہی منشاء نہ تھا کہ عدم 'دنیا کے مادہ کا سرچشمہ ہے۔ غور کیجئے۔ اور اگر ہم اسی بات کو فلسفیانہ انداز میں کہنا چاہیں تو اس طرح

کہیئے:

موجودات ممکن میں سے ہر موجود جس کا وجود اصلی نہ ہوا سکے دو پہلو ہیں "ماھیت اور وجود" ماہیت سے مراد وہی اعتباری معنی ہیں جس کی نسبت عدم اور وجود سے مساوی ہے لیکن ممکن ہے کہ وہ خود وجود کا لباس پہن لے اور موجود ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ معدوم کو فرض کر لیا جائے اور بالفاظ دیگر ماھیت اس قدر مشترک ہے کہ وجود کی حالت اور عدم شے کی حالت کے ملاحظہ سے اور ان دونوں کا باہم تقابل کرنے سے (اس ماہیت کا) پتہ چل سکتا ہے جس وقت ہم کسی چیز کے وجود یا عدم کی حالت کا کیال کرتے ہیں تو ان دونوں کے درمیان قدر مشترک وہی ماھیت ہوتی ہے مثلاً ہم کہتے ہیں' کہ یہ درخت سابق میں نہ تھا اور اب موجود ہے۔

فلاں شخص پہلے موجود نہ تھا اور اب موجود ہے۔ یہاں جس چیز کو ہم نے عدم اور وجود کی حالت کے طور پر پیش کیا ہے اور ان کو ایک دوسرے سے جو نسبت دی ہے یہ وہی ماھیت ہے۔

اس بناء پر اس عبارت کے معنٰی کہ خدائے تعالٰی نے دنیا کو عدم سے وجود بخشا ہے یہ ہیں کہ ماھیت عالم کو جو معدوم تھی موجود کر دیا ہے اور بالفاظ دیگر ماھیت کو عدم کی حالت سے وجود کی حالت میں لے آیا ہے۔ دوسرے حصہ میں یہ ضرور ہے کہ ہم پہلے زمان ومکان کی تشریح کریں اور پھر اس حصہ کے جواب میں مصروف ہوں:

زمان ومکان کے بارے میں بڑے بڑے فلسفیوں کی آرا میں سے جو رائے قابل قبول ہے اور دقیق مطالعات سے ان کی تائید ہوتی ہے وہ یہ کہ زمانہ ایک ایسا امر ہے جو حرکت کی مقدار کے مطابق وجود میں آتا ہے اگر ہم فرض کرتے ہیں کہ موجودات جہاں میں حرکت بالکل نہ تھی اور تمام دنیا ہر طرف سے ساکن تھی اور زمانہ کا کوئی وجود نہ تھا پس زمانہ حرکت کی پیداوار ہے۔

لیکن مکان کا بھی وہی معاملہ ہے کہ تقابل کے ذریعہ دو جسم ایک دوسرے سے پیدا ہوتے ہیں یعنی جب ہم کسی وقت دو چیزوں کا ایک دوسرے کے ساتھ تقابل کرتے ہیں تو ان کے اس تقابل سے مکان وجود میں آتا ہے[1]

اس لحاظ سے پوری دنیا کا نہ کوئی مکان ہے اور نہ کوئی زمان کیونکہ اسکے کارج میں کوئی چیز موجود نہیں ہے جس سے اسکا تقابل کیا جائے حرکت کے سبب سے اور اس کے نتیجے میں زمانہ پیدا ہوا ہے اور اسی طرح ان دونوں کے آپس میں تقابل سے مکان کا تصور پیدا ہوا غور کیجئے۔

جو مذہب وعقائد کی بحثوں کے جلسوں میں توحید کے موضوع پر ہوئے

آج تک معرفت الٰہی کے موضوع پر فارسی میں لکھی جانے والی کتابوں میں سے بہترین کتاب

تحریر

علی حجتی کرمانی۔عباسعلی عمید زنجانی۔سید حسن طاہری

ناصر مکارم شیرازی کی بحثوں کا مجموعہ

عقاید و مذاہب کی بحث کے جلسوں میں اس "نفیس اور بے نظیر مجموعہ" میں سے اب تک حسب ذیل کتابیں شائع ہوئی ہیں:

۱۔ آفریدگار جہاں (جہان کا بیدار کرنیوالا)

تحریر: علی حجتی کرمانی۔عباسعلی عمید زنجانی۔سید حسن طاہری (موجودہ کتاب)

۲۔ خدارا چگونہ شناسیم (ہم خدا کو کس طرح پہچانیں؟)

خدا کی صفتوں کی کیفیت کے متعلق بالکل نئے' اچھوتے' مدلل اور شیریں انداز میں بحثیں مع دلکش مقدمہ اور حاشیوں کے۔از جناب علی حجتی کرمانی

۳۔ رہبران بزرگ ومسئولیتہای بزرگتر (بزرگ رہنما اور ان کی بڑی ذمہ داریاں)

اس کتاب میں پیغمبروں کی آمد کا مقصد ؛ وحی یا ایک اسرار آمیز دنیا کی جانب ایک دریچہ۔پیغمبروں کے مافوق الفطرت کام اور معجزات (سائنس کی رو سے) گناہ اور خطا سے تحفظ اور بچاؤ۔کیا اخلاقی جذبہ "مذہب" کا جانشین ہو سکتا ہے؟ سے متعلق عمومی مسائل پر جدید انداز میں تجزیہ اور تشریح کی گئی ہے۔

جسم کا آبدار خانہ اور باورچی خانہ

حصہ سوم

۱ [زمان ومکان کی حقیقت کے بارے میں زیادہ تشریح کتب فلسفہ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے]